معاصر دینی تعلیم

مشکلات و احوال

ایفا پبلیکیشنز

معاصر دینی تعلیم - مشکلات واحوال

ایفا پبلیکیشنز، نئی دھلی

نام کتاب : معاصر دینی تعلیم - مشکلات واحوال

صفحات : ۳۳۴

سن طباعت : فروری ۲۰۱۲

قیمت : ۱۷۰ روپے

ناشر

ایفا پبلیکیشنز

۱۶۱-ایف، بیسمنٹ، جوگابائی، پوسٹ باکس نمبر: ۹۷۰۸

جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

فون: 011-26981327

ای میل: ifapublications@gmail.com

مجلس ادارت

فہرست

چوتھا باب: مدارس اور کتب خانے

پانچواں باب: مدارس میں عربی کی تعلیم

چھٹا باب: مدارس میں ریسرچ وتحقیق

ساتواں باب: مدارس کی اسناد اور مقابلہ جاتی امتحانات

آٹھواں باب: مدارس کے مسائل

☆☆☆

پیش لفظ

کسی بھی فکر کے بقا اور ارتقاء کے لئے تعلیم بنیادی وسیلہ ہے حکومت واقتدار سے محرومی کے باوجود تعلیم بہترین ہتھیار ہے جس کے ذریعہ کسی دین کا تحفظ کیا جاسکتا ہے اسی نقطۂ نظر سے جب اس ملک پر انگریزوں کے اقتدار کی گرفت مضبوط ہوگئی تو کچھ بالغ نظر بلند نگاہ اور وقت کے نباض علماء ومشائخ نے تحریک مدارس کی بنیاد رکھی، اس تحریک نے ایک طرف ایسی قبولیت اور پذیرائی حاصل کی کہ اسلامی تاریخ میں شاید ہی اس کی کوئی اور مثال مل سکے، دوسری طرف دین کی اشاعت وحفاظت کے مقصد کو حاصل کرنے میں اسے جو کامیابی حاصل ہوئی اس کی مثال بھی کم ہی مل پائے گی، آج بھی برصغیر کے چپہ چپہ میں اس تحریک کے نقوش ثبت ہیں، اگر یہ نہ ہوتے تو گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت اور ان کے دین کو باقی رکھنا دشوار ہوجاتا۔

ان مدارس کی خدمات جہاں ناقابلِ فراموش ہیں وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ اپنے کو ہم آہنگ کرنے کا جو عمل ہونا چاہئے تھا اصحاب بصیرت علماء کا خیال ہے کہ اس پر توجہ کم کی گئی ہے اور بعض جہتوں سے ہمارے اس نظام تعلیم میں اصلاح کی ضرورت ہے، چونکہ یہ مدارس تمام ملی خدمات کا سرچشمہ ہیں اور گویا امت کی شہ رگ ہیں اس لئے اکیڈمی دینی مدارس وجامعات کے نظام تعلیم وتربیت کو بے حد اہمیت دیتی ہے، اکیڈمی کی جانب سے مدارس میں محاضرات اور ورکشاپ کے پروگرام منظم کئے جاتے ہیں، سمیناروں میں نہ صرف مدارس کے اساتذہ بلکہ منتخب طلبہ کو بھی دعوت دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے بزرگوں کے طریقہ کو اچھی طرح طرح سمجھ سکے بلکہ خاص طور پر دینی مدارس سے مربوط پروگرام بھی رکھے جاتے

ہیں، چنانچہ مدارس میں فقہ کی تعلیم، معاشیات کی تعلیم اور عربی زبان وادب کی تعلیم وافتاء وقضاء کی تربیت وغیرہ پر مستقل پروگرام رکھے گئے ہیں۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی ''معاصر دینی تعلیم - مشکلات واحوال'' مسائل اور حل کے عنوان سے ۲۱-۲۲ر ستمبر ۲۰۱۱ء کو امارت شرعیہ بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ کے اشتراک سے ایک سمینار منعقد ہوا جس میں دینی مدارس کے نصاب، طریقۂ تعلیم، تعلیمی وسائل، طلبہ کو حل کتاب کے طریقہ تدابیر، اساتذہ کی تربیت، مدارس میں عصری علوم کی شمولیت، عصری درسگاہوں کے ساتھ دینی درسگاہوں کے اسناد کا موازنہ، کتب خانہ وغیرہ مدارس سے مربوط مختلف مسائل پر بڑے اہم مقالات پیش کیے گئے، انہیں مقالات کا مجموعہ اس وقت قارئین کے سامنے ہیں امید ہے کہ یہ مجموعہ دینی مدارس کے لئے رہنما خطوط فراہم کریں گے اور مختلف پہلوؤں پر غور وفکر کے لئے غذا فراہم ہوگی، نیز مدارس کے کردار کو مزید مؤثر بنانے کی طرف ارباب مدارس کی توجہ مبذول ہوسکے گی۔ اس مجموعہ کو محب عزیز مولانا صفدر زبیر ندوی صاحب (رفیق شعبہ علمی) نے محنت کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ دینی مدارس کی اندرونی اور بیرونی فتنوں سے حفاظت فرمائے اور اس مجموعہ کو امت کے لئے نفع کا ذریعہ بنائے۔ واللہ ھو المستعان۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

۲۱ر ربیع الاول ۱۴۳۳ھ

۱۴ر فروری ۲۰۱۲ء

افتتاحی کلمات

معاصر دینی تعلیم: مشکلات واحوال

پروفیسر اختر الواسع ☆

حضرات اکابر، علماء کرام، دانشوران اور خیر خواہان مدارس دینیہ

یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے کہ دینی تعلیم کے معاصر مسائل اور احوال کے اہم ترین اور حساس موضوع پر اپنی فکر ونظر پیش کرنے کے لئے مجھے یہاں مدعو کیا گیا ہے۔ دینی تعلیم سے نسبت ہمارا سرمایہ افتخار ہے، اسی سے ہماری زندگی میں معنویت اور آخرت میں ہماری کامرانی وابستہ ہے، میں اپنی زندگی کے ان لمحات کو اپنا اثاثہ سمجھتا ہوں جن میں مجھے دینی تعلیم کے اکابرین کی ذلہ ربائی کی سعادتیں میسر ہوتی رہتی ہیں۔ شاید میرے اسی تعلق کو اسلامک فقہ اکیڈمی کے ذمہ داران نے میرے لئے وجہ افتخار بناتے ہوئے آج مجھے آپ سے ہم کلام ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔

حضرات سامعین! اسلامک فقہ اکیڈمی کا یہ سمینار وقت کی ایک اہم ضرورت کی جانب ہم سب کو متوجہ کر رہا ہے۔ اور اس کام کے لئے اکیڈمی ہی سب سے موزوں پلیٹ فارم ہے۔ اکیڈمی نے خالص فقہی مباحث کے ساتھ ساتھ انتہائی سنجیدہ علمی اور فکری موضوعات پر مذاکروں

☆ وائس چیئرمین: دہلی اردو اکادمی (حکومت قومی راجدھانی دہلی)، ڈائریکٹر: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، صدر: اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اور سمیناروں کے ذریعہ ملک و بیرون ملک کے اہل علم، اہل دانش اور ارباب نظر کے یہاں جو مقام، وقار اور اعتبار حاصل کیا ہے، اس تناظر میں ہمیں یقین ہے کہ اکیڈمی کی آواز علمی محفلوں میں ضرور گوش شنوا حاصل کرے گی۔

یہ بات مزید خوشی اور اعزاز کی ہے کہ امارت شرعیہ کی سرزمین پھلواری شریف (پٹنہ) میں اس سمینار کا انعقاد عمل میں آرہا ہے۔ امارت شرعیہ کی خدمات ہندستان میں مابعد اسلامی حکومت مسلمانوں کی ملی و شرعی تاریخ کی پیشانی پر ایک سنہرا حرف ہے، اور اس نے دنیا کے غیر مسلم مخلوط سماج میں مسلمانوں کی دینی زندگی کا ایک نمونہ بھی قائم کیا ہے۔ پھلواری شریف کی سرزمین خانقاہ مجیبیہ کی نسبت سے بھی ایک اہم مقام رکھتی ہے جس نے علم وتقوی اور روحانیت کی روشنی سے ان گنت زندگیوں کو روشنی بخشی ہے۔ اس طرح اس سرزمین پر اس سمینار کو کئی جہتوں سے وقار حاصل ہوتی ہے۔

میں اسلامک فقہ اکیڈمی کے ذمہ داروں اور امارت شرعیہ کے وابستگان سب کا شکر گزار ہوں کہ مجھے آج یہاں آپ سے معاصر دینی تعلیم کے موضوع پر گفتگو کا موقع مل رہا ہے۔

1857 کے بعد کی آشوب ناک صورت حال میں علما نے برصغیر ہند میں مدارس کی شکل میں دینی تعلیم کا جو نظام قائم کیا، وہ بلاشبہ اس خطے کے علما کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ یہ دیار ہند میں تحفظ دین اور سرمایۂ ملت کی نگہبانی کی سب سے اہم اور بنیادی کوشش تھی، جو پوری طرح کامیاب رہی۔ اسلامی حکومت کے اختتام کے بعد اگر بروقت یہ کوشش نہ کی گئی ہوتی تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس خطے میں اسلام اور اسلامی تہذیب وثقافت کی صورت حال آج کیا ہوتی؟ ملک کی آزادی بعد کے نئے مرحلے میں دینی تعلیم کے نظام کو مزید پھلنے اور پھولنے کا موقع ملا اور ملک کے طول وعرض میں ہزاروں کی تعداد میں مدارس ومکاتب قائم ہوتے چلے گئے۔ اس وقت ہندی مسلمانوں کا کوئی دوسرا سماجی ادارہ مدارس کی طرح وسیع وہمہ گیر نہیں ہے۔ مدارس کی خدمات کو

صرف مسلم سماج کی خدمات کے تناظر میں بھی دیکھنا صحیح نہیں ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی شرح خواندگی کو بڑھانے اور ملک کو باکردار شہری فراہم کرنے کا کام بھی نہایت اہمیت کے ساتھ مدارس نے انجام دیا ہے۔ یہ کچھ کم اہمیت کی بات نہیں ہے کہ ملک کے پہلے وزیر تعلیم (مولانا ابوالکلام آزادؒ) بھی بنیادی طور پر مدارس کے نظام تعلیم کا ہی پروردہ تھے۔ یہ اسی نظام تعلیم کا امتیاز ہے کہ اس کے ذریعہ نئی نسل کو کیریر سازی کے بجائے اخلاق و کردار سازی کی تعلیم دی جاتی ہے اور انفرادیت پسندی کے بجائے ان کے اندر اجتماعیت پسندی اور سماجی مفاد کے لیے قربانی دینے کا جذبہ پیدا کیا جاتا ہے۔ معاصر دینی تعلیم کا یہ نظام ہندوستانی مسلمانوں کا ایک قابل فخر کارنامہ ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بدلے ہوئے سماجی حالات اور عصر حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں اس نظام میں تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ اس تبدیلی کا مقصد اس نظام تعلیم کی اہمیت کو کم کرنا نہیں بلکہ اس کے برعکس اس کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ عہد میں علماء اور فاضلین مدارس کو جو وسیع اور گوناگوں کردار ادا کرنا ہے۔ اس لحاظ سے معاصر دینی تعلیم کا نصاب و نظام بہت کچھ اصلاح کا متقاضی ہے۔ عالم گیریت کے موجودہ عہد میں ایک طرف فاضلین مدارس کو تہذیبی چیلنجوں سے واقف ہونا اور ان چیلنجوں کے جواب کی اپنے اندر صلاحیت پیدا کرنا ہے، دوسری طرف دنیا کے ایک گاؤں کی شکل اختیار کر لینے کے ساتھ اسلامی دعوت کو عالمی سطح پر انجام دینے کے امکانات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنا ہے۔ تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشین گوئی پوری ہو سکے کہ ایک وقت وہ آئے گا جب اسلام کا حکم دنیا کے تمام کچے پکے گھروں میں داخل ہو جائے گا (مسند احمد) دینی تعلیم کا معاصر نظام اور ڈھانچہ طلبۂ مدارس جیسی شعوری تربیت اور ان کے اندر اس کام کی انجام دہی کی ایسی صلاحیت پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ ضرورت ہے کہ نہایت حکمت و بصیرت کے ساتھ اس تعلیمی نظام کی روح کو جوں کا توں برقرار رکھتے ہوئے اس کے خدوخال میں مناسب تبدیلی لائی جائے۔

حضرات علمائے کرام واہل دانش! معاصر دینی تعلیم کو اس وقت جو مشکلات اور چیلنجز درپیش ہیں، ان میں میری نظر میں سب سے اہم چیلنج یہی ہے کہ کس طرح موجودہ نصاب کو دور جدید کے دینی، علمی اور تہذیبی تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔ دوسرا بڑا چیلنج مدارس کے کردار کے حوالے سے دنیا بھر میں مدارس کے خلاف چلائی جانے والی بدنامی کی مہم ہے جس کے تحت مدارس پر انتہا پسندانہ افکار ور جحانات کو فروغ دینے کا الزام عائد کیا جارہا ہے۔ اس مہم کی ہمہ گیری اور قوت کے زیر اثراب خود بہت سے مسلمان بھی اس پروپیگنڈے کو حقیقت کی ترجمانی سمجھنے لگے ہیں۔ میں پورے اخلاص کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ جس پیمانے پر، جن وسائل و ذرائع کا استعمال کرتے ہوئے، یہ شرانگیز مہم چلائی جارہی ہے، اس کے مقابلے کے لیے ہمارے فضلائے مدارس کی جیسی تعلیم وتربیت کی ضرورت ہے، وہ نہیں ہو پارہی ہے۔

ہمارے طلبہ وفضلائے مدارس کی اکثریت انگریزی سے واقف نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ بہت بڑی تعداد ایسی ہے، جو آٹھ دس سال مدارس میں عربی پڑھنے کے بعد بھی عربی بولنے پڑھنے پر بھی قادر نہیں ہو پاتی۔ یہ بہت بڑی کمی کی بات ہے۔

اسی طرح یہ بھی بڑی حد تک حقیقت ہے کہ دس سالہ تعلیم کے بعد بھی فاضلین کی بڑی تعداد معاصر دنیا کے مسائل، چیلنجز اور اسلام کے تئیں اشکالات وسوالات سے آگاہ نہیں ہوتی ہے۔ ایسے میں ان سے یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ موجودہ عہد کے تہذیبی چیلنجوں سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں اور دین میں تفقہ کی ذمہ داری ادا کرنے کے ساتھ اس کے پیغام کو دنیا میں عام کرنے میں متوقع رول ادا کر سکتے ہیں۔

بیسویں صدی کے پورے عرصے میں نصاب میں تبدیلی کے موضوع پر بحث ہوتی رہی ہے خود علما کی صفوں سے اٹھنے والی جن اہم شخصیات نے سب سے زیادہ نصاب کی تبدیلی پر زور دیا، ان میں علامہ شبلی نعمانیؒ سرفہرست ہیں۔ وہ نصاب تعلیم کے نقص کو ہی قوم کے زوال کا

بنیادی سبب گردانتے تھے۔جیسا کہ مقالات شبلی میں شامل ''ندوہ اور نصاب تعلیم'' کے عنوان سے لکھے گئے اپنے مضمون میں انھوں نے برملا اس بات کا اظہار کیا ہے۔(مقالات شبلی، ج:۳،ص: ۱۲۸، ۱۹۵۵) اپنے ایک خطبے میں انھوں نے کہا تھا:

اسلام کے ابتدائی عہد سے لے کر آج تک ہر زمانے میں ضرورت کے موافق مذہبی تعلیم کا نصاب بدلتا آیا ہے۔آج بھی ضرورت ہے کہ نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم موجودہ زمانے کی ضرورت کے موافق بدلا جائے اور یہی چیز ہے کہ جس کے نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہندوستان میں سینکڑوں ہزاروں عربی مدرسے موجود ہیں۔لیکن ان سے قوم کی مذہبی ضرورتیں بالکل رفع نہیں ہوتیں۔

(خطبات شبلی ص:۶۰، ۱۹۹۵، دارالمصنفین، اعظم گڑھ)

اسی طرح مولانا ابوالکلام آزادؒ نے بھی کئی موقعوں پر مدارس کے نصاب تعلیم کے تعلق سے اپنے عدم اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ان کا کہنا تھا کہ مدارس کے نصاب میں جو کتابیں اس وقت شامل ہیں، ان میں سے اکثر اس عہد کی ہیں جب کہ ان کے لفظوں میں ''اسلامی علوم کا دماغی تنزل شروع ہو چکا تھا'' (خطبات آزاد ص: ۳۵۴) لیکن اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ جس شخصیت نے سب سے زیادہ غور وخوض کیا اور اپنی فکر اور مطالعے کو ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت'' کے نام سے مرتب کیا وہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے شاگرد رشید مناظر احسن گیلانیؒ تھے۔سب سے زیادہ شدت کے ساتھ انھوں نے ہی اس بات کو دہرایا کہ مسلمانوں کے نظام تعلیم میں دینی اور دنیاوی تعلیم کے عنوان سے جو ثنویت پیدا ہو گئی ہے۔اسے دور کر کے مسلمانوں کے عہد زریں کی طرح ایک ہی نظام تعلیم رائج کیا جائے۔ان کی نظر میں اس کا فائدہ یہ ہوگا:

دینیات کے مدارس کے نام سے الگ عام مدرسوں کے قائم کرنے کی ضرورت مسلمانوں کو باقی نہ رہے گی۔ ہر عالم اس وقت گریجویٹ ہوگا اور ہر گریجویٹ عالم، ملا ہی مسٹر ہوں گے اور مسٹر ہی ملا۔ عالم و تعلیم یافتہ کی تفریق کا قصہ ختم ہو جائے گا (ہندوستان کا نظام تعلیم و تربیت، ج:۲،ص:۴۰۴)۔

حضرات علما و اہل دانش! ہمارے لیے سوچنے کا مقام ہے کہ کیا کسی بھی سطح پر ایسی کوشش ہو سکتی ہے کہ جدید و قدیم کی تفریق کو ختم کرتے ہوئے، کیونکہ قصۂ جدید و قدیم بلاشبہ دلیل کم نظری ہے، اس واحد نظام تعلیم کو پھر سے متعارف کرانے کی کوشش کی جائے جس کے تحت ایک ہی درس اور درس گاہ سے مجدد الف ثانیؒ، وزیر سلطنت سعد اللہؒ اور تاج محل کے معمار احمد لاہوریؒ جیسی شخصیات پیدا ہوئی تھیں۔ مولانا علی میاں ندویؒ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ: ''تعلیم کی موجودہ ثنویت یعنی دوئی غیر اسلامی اقتدار کی بدعت ہے۔

(بحوالہ عربی اسلامی مدارس کا نظام تعلیم، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ص:۱۲)

حضرات! اگر دونوں نظام تعلیم کی یکجائی ممکن نہ ہو تو کم از کم ان دونوں کو قریب تر کرنے کی کوششیں تو کی ہی جا سکتی ہیں۔ ہمیں اس پر غور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

نصاب میں مناسب تبدیلی کے علاوہ اہم مسئلہ طریقہ تعلیم و تدریس کا بھی ہے۔ اس بات کا احساس ہمارے موجودہ اکابرین کو بھی ہے کہ دینی تعلیم کا جو اصل مقصد ہے یعنی تفقہ فی الدین، اس حوالے سے بھی مدارس سے نکلنے والی جدید نسل کی تعلیمی صلاحیت کا معیار قابل اطمینان نہیں ہے۔ یہ بنیادی طور پر ہمارے مدارس کے طریقہ تدریس کی کمزوری کا نتیجہ ہے ورنہ حقیقت میں موجودہ نصاب کا غالب عنصر فقہ کی تعلیم پر مشتمل ہے۔ ایسے میں فضلائے مدارس کا

سب سے مضبوط پہلو یہی ہونا چاہئے۔ ان کے اندر تفقہ اور اجتہاد کی ایسی صلاحیت ہونی چاہئے کہ وہ دین کی روح اس کے مزاج اور شریعت کے اصولوں کی روشنی میں جدید مسائل کا قابل عمل حل پیش کر سکیں۔

معزز حاضرین! معاصر دینی تعلیم کے نظام کے حوالے سے کچھ اور بھی مسائل و مشکلات ہیں جن کا ہمیں حل ڈھونڈنا ہے۔ ایک بڑا مسئلہ مسلکی چپقلش کا ہے جس نے مختلف مکاتب فکر کے مدارس کو ایک دوسرے سے تقریباً بے گانہ سا کر دیا ہے۔ مختلف مدارس میں اب تک طلبہ کو مناظرے کی تربیت دی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور مناظرے اور مجادلے کا نہیں بلکہ مکالمے کا ہے۔ مکالمے کے ذریعہ ہی ہم اپنی نظریاتی کشمکش کو دور کر سکتے ہیں اور ہمارے مابین مفاہمت اور ہم آہنگی کی راہیں استوار ہو سکتی ہیں۔ میں پورے اخلاص کے ساتھ اس بات میں یقین رکھتا ہوں کہ قرآن وسنت کی تعلیم مسلکی بحث ومباحثے سے الگ ہٹ کر دی جانی چاہئے۔ میری طرح لوگوں کی بہت بڑی تعداد اسی سوچ کی حامل ہے۔ تمام مسالک کے لوگوں کو ایک باضابطہ معاہداتی اقدام کے تحت مسلکی کشمکش کو ہوا دینے والے لٹریچر کی اشاعت روک دینی چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم جب تک اپنے داخلی حصار کو مضبوط نہیں کریں گے، ہم خارجی دخل اندازیوں سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔

ایک دوسرا اہم مسئلہ فضلائے مدارس کے معاش کا ہے۔ مدارس کے فضلاء کی نئی نسل میں بعض اخلاقی کمزوریوں کی جو شکایتیں مل رہی ہیں۔ ان کی وجہ ان کی معاشی صورتحال ہے۔ مدارس پر لکھنے اور بولنے والوں کا ایک طبقہ اس کے حل کے لیے مدارس میں تکنیکی تعلیم کی تجویز پیش کرتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند جیسے ام المدارس میں دارالصنائع جیسے شعبے کا قیام اسی لیے عمل میں آیا تھا جس کے تحت خطاطی اور جلد سازی جیسے فنون کی تربیت کا نظام آج بھی قائم ہے۔ سوال یہ ہے کہ طلبہ کو معاشی ہنر سکھانے کے اس تصور کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا کسی سطح پر صنعت وحرفت کی

تربیت کو مدارس میں رواج دیا جاسکتا ہے؟ اگر ایسا کیا جاسکے تو یہ مدارس کے حق میں فال نیک ہوگا۔ اسی طرح اس پر بھی غور کیا جاسکتا ہے کہ طلبہ کی عمومی تعداد کو ضروری دینی تعلیم دینے کے بعد ایک سند دے کر فارغ کر دیا جائے، تاکہ وہ اپنی معاشی ضروریات سے متعلق کسی تعلیم یا ہنر سیکھنے میں مصروف ہو جائیں۔ اور عالم و فاضل کی مخصوص اعلیٰ تعلیم صرف انہی طلبہ کو معیاری انداز سے دیا جائے جو اسی میدان میں خدمت انجام دینے کے لئے شعوری طور پر تیار ہو جائیں۔

حضرات سامعین کرام! یہ معاصر دینی تعلیم کی مشکلات و احوال کے تعلق سے ہماری فکر اور گزارشات کا خلاصہ ہے جو ہم نے آپ کے سامنے پیش کیا۔ اگر ہماری کوئی بات کسی کے لیے دینی تکلیف کا باعث ہو تو میں اس کے لیے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

☆☆☆

تجاویز

معاصر دینی تعلیم-مشکلات واحوال

معاصر دینی تعلیم-مشکلات واحوال کے موضوع پر دوروزہ سمینار اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا اور امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ کے تعاون واشتراک سے مورخہ ۲۱-۲۲رستمبر ۲۰۱۱ء مطابق ۲۲-۲۳رشوال ۱۴۳۲ھ المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء، پھلواری شریف، پٹنہ کے کونش ہال میں منعقد ہوا۔ جس میں مختلف مدارس کے ذمہ داران واساتذہ نیز دیگر تعلیم گاہوں کے اصحاب علم وفکر نے شرکت فرمائی۔ دینی تعلیم کے مختلف مراحل اوران کے نصاب ونظام اورجدید حالات اورتقاضوں کے پس منظر میں فضلائے مدارس کے مطلوبہ کردار پر مقالات پڑھے گئے اورمذاکرات ہوئے، شرکاء سمینار نے درج ذیل تجاویز منظور فرمائی:

۱-ابتدائی دینی تعلیم

الف: مسلمان بچے اوربچیوں کو دین کی بنیادی باتوں سے واقف کرانا، ان کے والدین، سرپرستوں اورمسلم سماج کی ذمہ داری ہے۔ بچپن ہی میں ایمان کی جڑوں کو راسخ کرنا، ضروریات دین سے واقف کرنا اورقرآن پاک کی تعلیم سہل ہوتی ہے۔ اسی مقصد سے ہمارے بزرگوں نے گاؤں گاؤں، محلے محلے مکاتب کا نظام قائم کیا۔ یہ سمینار مسلمانوں کو متوجہ کرتا ہے کہ مکاتب اسلامیہ کے نظام کو مزید مضبوط کریں اور پھیلائیں۔ اس بات کی کوشش کریں کہ ہمارا کوئی گاؤں اورمحلہ معیاری مکتب سے خالی

نہ ہو اور ان مکاتب کا تعلیمی وتربیتی نظام بہتر سے بہتر ہو کیونکہ دینی بنیادی تعلیم صحت کے ساتھ قرآن سکھانا عقائد وایمان کی باتیں بتانا فرض عین ہیں۔

ب- یہ سمینار ائمہ وعلماء اور ملت پر اثر رکھنے والے سربرآوردہ افراد سے اپیل کرتا ہے کہ یہ حضرات ملت اسلامیہ ہندیہ میں احساس پیدا کریں کہ دینی مکاتب ملت کا عظیم سرمایہ ہیں اور ان کی کوششوں سے ہماری نئی نسل میں دین وایمان کی آبیاری ہوتی ہے۔ لہٰذا اپنے بچوں کو ان مکاتب میں تعلیم دیں تاکہ ہمارے بچے دین کی بنیادوں سے واقف ہوں اور ان کے دلوں میں بچپن ہی سے ایمان راسخ ہوسکے۔

ج- یہ سمینار مکاتب اسلامیہ کے ذمہ داروں سے یہ اپیل کرتا ہے کہ اپنے نصاب تعلیم میں دینی مضامین کے علاوہ ان مضامین کو بھی اہمیت کے ساتھ شامل کریں جن کو پڑھے بغیر ہمارے بچے اور بچیاں تعلیم کے اگلے مرحلے میں داخل نہیں ہوسکتے۔

د- یہ سمینار مسلمانوں کے زیر انتظام چلنے والے اسکولوں کے ذمہ داروں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اپنے نصاب تعلیم میں مسلمان بچوں کے لئے دینیات کا مضمون لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل کریں اور دینیات کے مضمون کو پڑھانے کے لئے باصلاحیت، لائق افراد کو بحال کریں، نیز اپنے اسکولوں میں اچھا تربیتی واخلاقی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

ھ- ہمارے بچوں کی بڑی تعداد ابتداء ہی سے ایسے اسکولوں کا رخ کرتی ہے جن میں نہ صرف یہ کہ دینی تعلیم کا کوئی نظم نہیں ہوتا، بلکہ وہاں بچوں کو مخالف اسلام افکار ونظریات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایسے بچوں کو کلمہ، نماز اور ضروریات دین کی تعلیم دینا ان کے والدین، سرپرستوں اور مسلم سماج کی ذمہ داری ہے۔ ان بچوں کے لئے صباحی یا مسائی مکاتب قائم کئے جائیں اور تعطیلات کے موقع پر ان کے لئے دین کی بنیادی باتوں سے

۱۱۱۳۲۵

واقفیت کی خاطر مختصر مدتی تعلیمی وتربیتی پروگرام منعقد کیا جائے۔

۲-مدارس کی تعلیم:

الف- برصغیر کے دینی مدارس ملت اسلامیہ کا عظیم ترین سرمایہ ہیں اور برصغیر میں دینی اور ایمانی ماحول پیدا کرنے اور مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کو راسخ کرنے اور ان میں دین وشریعت پر عمل پیرا ہونے کے جذبات بیدار کرنے میں ان مدارس کا بڑا عظیم رول رہا ہے اور آج بھی یہ مدارس مسلمانوں کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے یہ سمینار مسلمانان ہند سے اپیل کرتا ہے کہ ان مدارس کی قدر وقیمت کو پہچانیں، انہیں اپنی اہم ترین بنیادی ضرورت تسلیم کرتے ہوئے مدارس کے نظام کو وسیع ومستحکم کرنے کی کوشش کریں۔

ب- مدارس اسلامیہ کے ذمہ داران اور اساتذہ کو بھی اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ مدارس کا پھیلاؤ تو بہت ہو رہا ہے لیکن تعلیم وتربیت کے معیار میں تیزی کے ساتھ انحطاط ہوتا جا رہا ہے۔ یہ چیز مدارس کے اساتذہ وذمہ داران وہمدردان کے لئے تشویش اور فکر مندی کی ہے۔ یہ سمینار اپنے عظیم مدارس کے ذمہ داران سے درخواست کرتا ہے کہ وہ خود احتسابی کے جذبہ کے ساتھ انحطاط کے اسباب کا گہرائی سے جائزہ لیں اور ان اسباب کے ازالہ کی تدبیریں کریں اور مدارس کے تعلیم وتربیت کے معیار کو بہتر سے بہتر کرنے کے لئے اقدامات اور فیصلے کریں اور مدارس کی نافعیت کو محسوس کریں۔

مدارس اسلامیہ کے فارغین کو مسلمانوں کی دینی رہنمائی اور فکری قیادت کا کام انجام دینا ہوتا ہے اس لئے ان کا اپنے زمانہ کے حالات، سماج کے مسائل ومشکلات، قوم کی

ضروریات ونفسیات سے واقف ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے ہمارے بزرگوں نے ہر دور میں مدارس کے نصاب ونظام میں تبدیلیاں کی ہیں۔ ایسی تبدیلیاں جو مدارس کی روح اور مقصد کو متاثر نہ کرے بلکہ ان کو قوت پہنچائیں اور علماء کو کارگاہِ حیات میں رہنمائی کے قابل بنائیں، اس لئے یہ سیمینار ذمہ داران مدارس اور اکابر علماء سے درخواست کرتا ہے کہ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے مدارس کے نصاب ونظام کا جائزہ لیتے رہیں اور جن عصری مضامین کا تعلیم کے جس مرحلے میں اضافہ کرنا مناسب ہو ان کا اضافہ کریں اور ان عصری مضامین پر نصابی نقطۂ نظر سے مختصر کتابیں تیار کریں جن کا نصاب میں شامل کرنا ممکن ہو۔

ھ- یہ واقعہ ہے کہ مدارس کے مادی وسائل بہت محدود ہیں اور مسلمانوں کے جذبۂ خیر کی بنیاد پر یہ ادارے تعلیم وتربیت کا نظم چلا رہے ہیں اور مدارس کے اساتذہ وکارکنان انتہائی قلیل تنخواہوں پر قناعت اور اخلاص کے ساتھ اپنی تدریسی وتربیتی ذمہ داریوں کو انجام دے رہے ہیں۔ اس کے باوجود یہ سیمینار مدارس کے ذمہ داران کو اس جانب متوجہ کرتا ہے کہ مدارس کے ذمہ داران مدارس کے اساتذہ وکارکنان کی تنخواہوں میں خاطر خواہ اضافہ کی طرف توجہ فرمائیں اور دستیاب مادی وسائل کو اراضی وتعمیرات سے زیادہ اساتذہ وطلبہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں صرف کریں۔

۳- اساتذہ کی تربیت:

الف- مدارس کے معیار تعلیم وتربیت کو بلند کرنے کے لئے ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ جو باصلاحیت فضلائے مدارس درس وتدریس کو اپنا میدان عمل بنانا چاہتے ہیں ان کے لئے ایک سالہ یا ششماہی ٹریننگ کورس رکھا جائے اور انہیں فضلاء کو مدارس میں تدریس کا

موقع دیا جائے جو مذکورہ بالا تربیتی کورس مکمل کر چکے ہوں۔ اس مقصد کے لئے یہ سمینار مرکزی دینی مدارس (دار العلوم دیوبند، دار العلوم ندوۃ العلماء، مظاہر العلوم سہارنپور وغیرہ) کے ذمہ داروں سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنے یہاں اس طرح کا تربیتی کورس جاری کریں اور اس میں انہیں فضلاء کو داخل کیا جائے جن کی بنیادی صلاحیت مضبوط ہو اور اخلاق و کردار بہتر ہو، تا کہ مدارس اسلامیہ کو بہتر اساتذہ مہیا ہو سکیں۔

ب- اساتذہ کی ٹریننگ کے لئے تربیتی کورس کا انتظام ہونے سے پہلے عبوری طور پر ایسا کیا جانا مفید ہے کہ ہفتہ دو ہفتہ کا تربیتی پروگرام ترتیب دے کر تجربہ کار اساتذہ اور ماہرین تعلیم کے محاضرات دلوائے جائیں اور ان میں نوجوان فضلاء اور نوعمر اساتذہ کو شریک کیا جائے۔

ج- یہ سمینار مدارس کے ذمہ داروں سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنے اساتذہ کے لئے سال دو سال میں مختلف علوم پر مختصر مدتی (ہفتہ دس دن کا) تربیتی پروگرام منعقد کریں جس میں ان علوم کے ماہرین اپنے محاضرات پیش کر سکیں۔ اساتذہ کے ساتھ مذاکرات کر سکیں، تا کہ اساتذہ کو اپنے موضوع کے بارے میں زیادہ واقفیت حاصل ہو سکے اور وہ اپنے علم و فن سے متعلق نئی تحقیقات سے واقف ہو سکیں۔

۴- تخصصات کے کورسز:

ذہین اور باصلاحیت فارغین مدارس کو مختلف میدانوں میں تیار کرنے کے لئے تخصصات کے کورسز انتہائی ضروری ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ مختلف بڑے دینی مدارس میں تخصصات کے مختلف کورس جاری ہیں اور تخصصات کے لئے چند مستقل ادارے بھی قائم ہیں۔ لیکن ابھی اس کام کو مزید مربوط و منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ سمینار اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا سے درخواست

کرتا ہے کہ وہ بڑے مدارس (جہاں تخصصات کے کورسز جاری ہیں) سے رابطہ کرکے مختلف علوم میں تخصصات کے کورسز کا جائزہ لے۔ اور ان کا نصاب تیار کرنے کی کوشش کرے۔ نیز جن میدانوں میں تخصصات کی ضرورت ہے اور ان میں اس طرح کا کورس جاری نہیں ہے ان کی نشاندہی کریں اور ان کا خاکہ تیار کرکے ماہرین کی مدد اور مشوروں سے انہیں حتمی شکل دے۔

☆☆☆

پہلا باب

مدارس کا نصاب تعلیم

ہندوستان کے دینی مدارس میں فقہ واصول فقہ کا نصاب درس- جائزہ اور تجویزیں

مولانا عتیق احمد قاسمی ☆

دینی مدارس کا پس منظر

ہندوستان میں مروجہ دینی مدارس کے قیام کا ایک خاص پس منظر ہے، اسے سامنے رکھے بغیر ان مدارس کا بنیادی مقصد متعین کرنا اور ان کے نصاب اور نظام کا دیانتدارانہ تجزیہ ممکن نہیں ہے، ہندوستان میں جب مسلم حکومتیں قائم تھیں نیز ان حکومتوں کے زیر سایہ مختلف وزراء، امراء، نوابوں اور جاگیرداروں کی سرپرستی میں اسلامی علوم کی درسگاہیں قائم تھیں، یہ درسگاہیں مروجہ درسگاہوں سے کافی مختلف تھیں، جہاں بھی کوئی متبحر، متدین اور باکمال صاحب درس عالم افادہ اور فیض رسانی کیلئے بیٹھ گیا وہاں ایک درسگاہ قائم ہوگئی، اس کی علمی حیثیت اور شہرت کے اعتبار سے دور ونزدیک سے طالبان علوم دینیہ کھینچ کھینچ کر جمع ہوجاتے، اور اپنے حوصلہ اور ظرف کے بقدر علوم دینیہ کے ہیرے جواہر سے اپنے دامن بھر لیتے، حلقہ درس میں شمولیت کی اجازت استاذ کی مرضی پر موقوف ہوتی، اگر وہ خواہش مند طالب علم کی صلاحیت وصلاح، جذبہ طلب اور اخلاص ونیت کے بارے میں مطمئن ہوتا تو اسے اپنے حلقہ درس میں شامل کرلیتا۔ تعلیم کا نظام کیا ہوگا، کیا کتابیں پڑھائی جائیں گی، روزانہ کتنے اسباق ہوں گے، کون شاگرد کس کس درس میں

☆ استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

شریک ہوگا، یہ تمام امور استاذ کے اختیار میں تھے۔ان درسگاہوں میں تعلیم کے دو ہی ارکان تھے: یعنی استاد اور شاگرد، انتظامیہ کے نام سے کوئی تیسرا عنصر نہیں تھا جو اس تعلیم میں دخیل ہو بلکہ امور تعلیم میں بنیادی عامل کا کام کرے جیسا کہ آج کل ہے۔

ان قدیم درسگاہوں میں کہیں تو طلباء کے اخراجات کا تکفل درسگاہ کی طرف سے ہوتا تھا، یہ صورت حال وہاں ہوتی تھی جہاں حکومت یا کسی امیر و وزیر نے درسگاہ میں داخل ہونے والے طلباء کے اخراجات کا تکفل اپنے ذمہ لے لیا ہوتا، یا اس درسگاہ پر بڑی بڑی جائدادیں اور آراضی وقف ہوتیں، ان اوقاف کی آمدنیوں سے وہاں زیر تعلیم طلباء کے وظائف دیئے جاتے تھے، لیکن اکثر درسگاہوں میں طلبہ کے اخراجات کا بار درسگاہ کے ذمہ نہیں ہوتا تھا بلکہ طلبہ خود اپنے اخراجات کے ذمہ دار ہوتے تھے، وہ جہاں سے بھی اسکا نظم کریں، اپنے گھر سے لائیں یا کسی مقامی صاحب خیر کو کفالت پر آمادہ کرلیں، یا کسی مسجد وغیرہ میں امامت یا مؤذنی کا فریضہ انجام دے کر اپنے قیام وطعام کا انتظام کریں، طلباء کے اخراجات کا باقاعدہ نظم نہ ہونے کی وجہ سے طالبان علوم دینیہ کی ایک بڑی تعداد وہ تھی جن کے مصارف کا کوئی مستقل بندوبست نہیں تھا، علوم دینیہ کے شوق وطلب کا ان پر اتنا غلبہ تھا کہ انتہائی بے سروسامانی اور فاقہ مستی کی حالت میں اپنی تعلیم کے ایام پورے کرتے، کتنے ایسے تھے جنہیں روزانہ ایک وقت بھی آسودگی کے ساتھ کھانا میسر نہیں آتا تھا، ہماری علمی تاریخ میں ایسے طالبان علوم نبوت کے نام بہت کثرت سے ملتے ہیں جنہوں نے ہر طرح کی تنگ دستی اور شدید ناموافق حالات کے باوجود اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور تعلیم کی تکمیل کے بعد آسمان علم وتحقیق کے چاند تارے بن کر چمکے۔

ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں ایسے باعزیمت اور صاحب کمال مدرسین وعلماء بھی بکثرت ملتے ہیں جنہوں نے تعلیم دین کا اہم اور پاکیزہ فرض انجام دیتے ہوئے کسی طرح کی مادی منفعت اٹھانا اپنے لئے حرام سمجھا، مسلم حکومتوں اور وزراء وامراء کی مالی اعانت کی پیش کش کو

پوری شان بے نیازی کے ساتھ ٹھکرادیا، انھوں نے یہ بات گوارہ نہیں کی کہ اس اہم دینی فریضہ کی ادائیگی پر کسی سے کوئی معاوضہ قبول کریں، ہندوستان کا یہ قدیم نظام تعلیم جسے ہم انفرادی نظام تعلیم کا نام بھی دے سکتے ہیں اس میں طالبان علوم دینیہ کیلئے کچھ پریشانیاں ضرور تھیں، لیکن ان پریشانیوں کا یہ ثمرہ تھا کہ اس راہ میں وہی لوگ قدم رکھتے تھے جن کے اندر علم کی سچی طلب اور مشکلات کو جھیلنے کا حوصلہ ہوتا تھا، جن کا ذوق طلب ناقص یا ہمت کوتاہ ہوتی تھی وہ لوگ دوقدم چلنے کے بعد ہی الٹے پاؤں لوٹ جاتے تھے، موجودہ دور میں وسائل کی فراوانی کی وجہ سے غیر حقیقی طلبہ علم کی کثرت نے ہمارے مدارس کیلئے جو سنگین خطرات پیدا کردیئے ہیں اس سے یہ قدیم درسگاہیں محفوظ تھیں، ہماری ان قدیم درسگاہوں میں طلبہ کا یہ ہجوم تو نہیں ہوتا تھا لیکن جتنے طلبہ بھی ہوتے تھے ان کا دل دماغ اخلاص نیت اور طلب صادق سے معمور ہوتا تھا وہ لوگ تن آسانی کے بغیر ہر طرح کی مشکلات اور مخالف حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتے تھے، طالب علمی کے ایام میں چونکہ وہ ہر طرح کے تنگ وترش حالات سے گزر چکے ہوتے تھے اس لئے آئندہ پیش آنے والے حوصلہ شکن اور روح فرسا حالات میں ان کے پائے استقامت ڈگمگاتے نہیں تھے اور زندگی کے ہر امتحان میں کامیابی سے گزر جاتے تھے۔

ہندوستان میں فقہ کی تعلیم

ہندوستان میں سیکڑوں سال تک مسلم حکومتیں قائم رہیں، ان حکومتوں کے زیر سایہ اسلام کا عدالتی نظام پورے ہندوستان میں کلی یا جزئی طور پر نافذ رہا، حکومت کا عدالتی نظام چلانے کے لئے فقہ اسلامی خصوصاً فقہ حنفی پر دسترس رکھنے والے علماء کی ضرورت تھی، مسلم دور حکومت میں عوام کی دینی رہنمائی اور روزمرہ کے مسائل ومشکلات میں شرعی احکام بتانے کیلئے مفتیان کرام کا تقرر بھی ہوتا تھا، مسلم حکومتوں کے دور میں قاضی اور مفتی کا منصب بڑا معزز اور اہم منصب تھا، حکومت کی جانب سے ان حضرات کو معقول مشاہرے ملتے تھے، قاضیوں کی عدالت میں عام

شہریوں کے علاوہ امراء و وزراء اور سلاطین تک کے مقدمات آتے تھے، اور قاضی شریعت کا فیصلہ ہر ایک پر نافذ ہوتا تھا، ان اسباب کی بنا پر دینی علوم حاصل کرنے والے طلباء کی توجہ فقہ و اصول فقہ پر زیادہ ہوتی تھی، ہندوستان کے مسلم سلاطین کے دور میں فقہ اسلامی میں درک رکھنے والے علماء اور اصحاب افتاء کی جو غیر معمولی پذیرائی تھی اسی کا نتیجہ تھا کہ بلاد اسلامیہ سے کھینچ کھینچ کر ممتاز ترین فقہاء اور اصحاب افتاء ہندوستان کی سرزمین پر جمع ہو گئے، ان کی آمد سے جہاں ہندوستان کا علمی وقار بڑھا وہیں فقہ کے درس و تدریس کا معیار بھی اونچا ہوا، عالم اسلام پر تاتاریوں کی یلغار اور لرزہ خیز مظالم نے بہت سے یگانہ روزگار ممتاز ترین فقہاء کو مجبور کیا کہ وہ ماوراء النہر، خراسان اور دوسرے بلاد اسلامیہ سے ترک وطن کر کے ہندوستان کی طرف ہجرت کریں، کیونکہ خوش قسمتی سے ہندوستان تاتاریوں کی ترک تازیوں سے محفوظ رہا اور ہندوستان کے مسلم حکمراں باہر سے آنے والے علماء و فقہاء کا پوری گرم جوشی سے استقبال کرتے رہے، ان کی خدمت میں اونچے اونچے منصب اور جاگیر پیش کرتے رہے۔

ان مختلف اسباب کی بنا پر ہندوستان میں فقہ اسلامی خصوصاً فقہ حنفی کو بہت فروغ حاصل ہوا، ہندوستان کی اسلامی درسگاہوں میں سب سے زیادہ زور فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم پر رہا کیونکہ فقہ میں کمال پیدا کرنے کے بعد معاش کا باعزت راستہ کھلا ہوا تھا، عدالتی نظام چلانے کے لئے حکومت کو بڑی تعداد میں ماہرین فقہ و فتاوی درکار تھے، فوراً ہی قاضی کا منصب مل جاتا تھا، تاریخ ہند کے بیشتر ادوار میں فقہ و اصول فقہ کی تحصیل معیار فضیلت سمجھی جاتی تھی۔

نزہۃ الخواطر کے مصنف مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ ''ہندوستان کا نصاب درس اور اس کے تغیرات'' میں بہت اختصار اور جامعیت کے ساتھ ہندوستان کے قدیم نظام درس اور نصاب میں آنے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیا ہے، انھوں نے ہندوستان کے قدیم نصاب درس کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے، ان کی تقسیم کے مطابق دور اول کا

آغاز ساتویں صدی ہجری سے ہوتا ہے، اور دسویں صدی ہجری پر یہ دور ختم ہو جاتا ہے، نصاب درس کے اس دور میں مولانا مرحوم کی تحقیق کے مطابق فقہ میں ہدایہ اور اصول فقہ میں منار، اس کی شروح اور اصول بزدوی کی تدریس کا رواج تھا، دور اول کے تحت مولانا مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

''اس طبقہ کے علماء کرام تلاش کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسا ہمارے زمانہ میں منطق وفلسفہ معیار فضیلت ہے، ویسا ہی اس زمانہ میں فقہ اور اصول فقہ معیار فضیلت تھا'' (ص ۱۰)۔

مولانا عبدالحی صاحب کی تحقیق کے مطابق دور دوم میں فقہ کے نصاب میں شرح وقایہ کا اضافہ ہوا، اور دور سوم میں اصول فقہ کے نصاب میں حسامی اور توضیح وتلویح کا کچھ حصہ شامل ہوا۔ دور چہارم کا آغاز ملا نظام الدین سے ہوا، ان کے پرزور ہاتھوں سے درس نظامی کی بنیاد رکھی گئی جو کچھ جزوی تغیرات کے ساتھ اب بھی جاری ہے، ملا نظام الدین کے نصاب درس میں فقہ میں شرح وقایہ، ہدایہ اولین وہدایہ آخرین اور اصول فقہ میں نور الانوار، توضیح وتلویح، مسلم الثبوت (مبادی کلامیہ) شامل تھیں۔

حضرت مولانا عبدالحیؒ صاحب درس نظامی کی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس نصاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں امعان نظر اور قوت مطالعہ کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ طلبہ میں (بشرطیکہ تحقیق کے ساتھ پڑھا ہو) قوت مطالعہ، دقت نظر، احتمال آفرینی اور قوت قریبہ بیدار ہو جاتی ہے، کسی فن میں طالب علم کو بالفعل کمال حاصل نہیں ہوتا مگر وہ اپنے شوق اور جانفشانی سے جس علم میں چاہے کمال پیدا کر سکتا ہے، میں نے تحقیق کے ساتھ پڑھنے کی قید اس واسطے لگائی ہے کہ اب طریقہ تعلیم بگڑ گیا ہے، ملا نظام الدین کا طریقہ درس یہ تھا کہ وہ کتابی خصوصیتوں کا چنداں لحاظ نہیں کرتے تھے بلکہ کتاب کو ایک ذریعہ قرار دے کر اصل فن کی تعلیم دیتے تھے، اسی طرز تعلیم نے ملا کمال الدین، بحر العلوم، حمد اللہ جیسے اہل کمال پیدا کیے تھے'' (ہندوستان کا نصاب درس اور اس کے تغیرات، ص: ۱۸)۔

فقہ واصول فقہ کا موجودہ نصاب درس

اس وقت ہندوستان کے دینی مدارس میں فقہ اور اصول فقہ کی جو کتابیں شامل درس ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔ جن دینی مدارس میں فارسی زبان شامل نصاب ہے اور عربی نحو وصرف کی ابتدائی کتابیں فارسی زبان میں ہیں، ان میں ابتدائی مرحلہ میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی مالابدمنہ پڑھائی جاتی ہے، اس کے بعد فقہ کی درج ذیل کتابیں بالترتیب فراغت تک پڑھائی جاتی ہیں۔

(۱) نور الایضاح)، (۲) قدوری، (۳) کنز الدقائق، (۴) شرح وقایہ، (۵) ہدایہ کامل، (۶) سراجی۔

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور اس سے ملحق مدارس میں نور الایضاح کی جگہ ''الفقہ المیسر'' شامل درس کی گئی ہے، کنز الدقائق بہت سے نظامی اور غیر نظامی مدارس میں نصاب درس سے خارج کی جاچکی ہے، اور اس کی جگہ کوئی دوسری کتاب شامل نہیں کی گئی ہے، قدوری کہیں تو مکمل شامل نصاب ہے (خواہ پوری کتاب کی تعلیم مکمل نہ ہوسکے) اور کہیں عبادات کے ابواب حذف کرکے باقی کتاب شامل نصاب ہے، کچھ مدارس مزید اختصار وانتخاب سے کام لیتے ہوئے ان ابواب کو بھی نصاب سے خارج کردیا ہے جن کی ضرورت عملی زندگی میں عموماً پیش نہیں آتی، مثلاً کتاب العتق وغیرہ، شرح وقایہ کی دونوں ابتدائی جلدیں بعض مدارس کے نصاب میں شامل ہیں اور بعض مدارس میں صرف جلد اول پر اکتفا کیا گیا ہے، ہدایہ اولین تقریباً تمام ہی مدارس میں شامل نصاب ہے، لیکن ہدایہ آخرین بہت سے مدارس کے نصاب میں شامل نہیں ہے، بعض مدارس میں ہدایہ آخرین کو یا اس کے منتخب ابواب کو عالمیت کے مرحلہ سے گزرنے کے بعد فضیلت کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے، جامعہ سید احمد شہید کٹولی میں ہدایہ سے پہلے علامہ علاء الدین سمرقندی کی کتاب تحفۃ الفقہاء کو شامل نصاب کیا گیا ہے اور اس کو چند سالوں پر تقسیم کیا گیا ہے، یہ

کتاب اپنے انداز اور اسلوب کے اعتبار سے بہت سہل ہے اور فقہ حنفی کی اہم کتابوں میں ہے، امید ہے کہ اس کا تدریسی تجربہ کامیاب ہوگا، فرائض کی مشہور کتاب سراجی تقریباً تمام مدارس میں شامل نصاب ہے، باب المناسخہ کے ختم تک اسکا درس ہوتا ہے، بعض مدارس میں مشہور فلسفی وفقیہ امام ابن رشد کی کتاب بدایۃ المجتہد کا کچھ حصہ شامل نصاب ہے۔

اصول فقہ کا نصاب درس تمام ہی مدارس میں بہت مختصر ہے، عام طور سے مدارس میں طلباء کو اصول فقہ کی دو ہی کتابیں پڑھنے کو ملتی ہیں: (۱) اصول الشاشی (۲) نور الانوار، اصول الشاشی تو عام طور سے مکمل شامل نصاب ہے لیکن تدریسی شغف وانہماک میں کمی کی وجہ سے اب یہ مختصر کتاب بھی سال کے آخر تک عموماً مکمل نہیں ہو پاتی، نور الانوار تو مکمل شامل نصاب ہی نہیں، اکثر مدارس میں صرف کتاب اللہ کے مباحث شامل نصاب ہیں، اس مختصر ترین نصاب کی وجہ سے طالب علم اصول فقہ کے مسائل میں کورا رہ جاتا ہے، دار العلوم ندوۃ العلماء اور اس سے ملحق مدارس میں نور الانوار کی جگہ عبد الوہاب خلاف کی کتاب علم اصول الفقہ شامل نصاب ہے، بعض مدارس کے نصاب میں حسامی کا کچھ حصہ بھی شامل درس ہے، کچھ بڑے مدارس نے فراغت کے بعد تربیت افتاء کا ایک سالہ کورس جاری کر رکھا ہے، اس یک سالہ نصاب میں فقہ کی عموماً درج ذیل کتابیں شامل ہیں:

(۱) الاشباہ والنظائر فن اول (قواعد فقہیہ والاحصہ) (۲) شرح عقود رسم المفتی (۳) در مختار کا مقدمہ اور بعض ابواب (۴) سراجی مکمل مشقوں کے ساتھ۔

بعض مدارس اور اداروں نے فضلاء مدارس کے لئے تخصص فی الفقہ کا دو سالہ نصاب جاری کیا ہے، اس نصاب میں کچھ مضامین اور کتابیں زیادہ ہیں، دو سالہ نصاب بنانے میں اس بات کا بھی دخل ہے کہ فضلاء مدارس کا علمی معیار گرتا جا رہا ہے، جن کتابوں اور مضامین کو وہ پڑھ چکے ہوتے ہیں ان میں بھی وہ کمزور ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری کا بصیرت افروز تجربہ

پاکستان کے مشہور محدث اور عالم دین اور علامہ انور شاہ کشمیری کے شاگرد رشید حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نے "عربی مدارس کا نصاب ونظام تعلیم" کے موضوع پر ایک بڑا اہم اور فکر انگیز مضمون تحریر فرمایا تھا جو ۷۵-۱۹۷۴ء میں ہندو پاک کے مختلف جرائد میں بڑے اہتمام سے شائع ہوا۔ پھر دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند نے حضرت مولانا حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ کے تائیدی نوٹ کے ساتھ اسے کتابچہ کی شکل میں شائع کیا، اس مضمون میں مدارس اسلامیہ کے نصاب ونظام کے بارے میں بڑے قیمتی مشورے اور تجویزیں شامل ہیں، یہ مشورے اور تجویزیں کسی "اجنبی اور دخیل" کی طرف سے نہیں ہیں، بلکہ اپنے ہی گھر کی ایک ایسی بلند قامت شخصیت کی طرف سے ہیں جس کی زندگی درس وتدریس ہی میں گزری، اور جس کا مقام بلند مدارس کے حلقوں میں بھی تسلیم شدہ ہے، مولانا نصابی کتابوں پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مدارس دینیہ عربیہ میں اس وقت جو نصاب تعلیم رائج ہے حدیث وفقہ کی چند کتابوں کو مستثنیٰ کرنے کے بعد زیادہ تر ساتویں صدی ہجری اور اس کے بعد کے قرون کی یادگار ہے، جہاں سے صحیح معنیٰ میں علمی انحطاط کا دور شروع ہو چکا تھا، قدماء امت کی وہ تالیفات جن میں علم کی روح موجود تھی، عبارت سلیس وشگفتہ، مسائل وقواعد واضح، جن میں نہ عبارتی تعقیدات تھیں، نہ دور از کار ابحاث، جن کے پڑھنے سے صحیح معنیٰ میں دل ودماغ متاثر ہو سکتے تھے، نہ وقت ضائع ہوتا تھا، نہ دماغ پر بوجھ کا خطرہ ہوتا تھا، ان کی جگہ ایسی کتابیں تصنیف ہوئیں، جن میں سب سے زیادہ کمال اختصار نویسی کو سمجھا گیا، زیادہ زور لفظی بحثوں پر دیا گیا، لفظی موشگافیاں شروع ہوئیں، اگر یوں کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ کاغذ تو کم خرچ کیا گیا لیکن وقت ودماغ کو اس کے حل پر زیادہ صرف کیا گیا، بڑا کمال یہی سمجھا گیا کہ عبارت ایسی دقیق وغامض ہو جس کے لئے شرح وحاشیہ کی ضرورت ہو، کئی کئی توجیہات کے بغیر حل نہ ہو، آخر یہ علمی عیاشی نہیں تو اور کیا ہے، میرے ناقص

خیال میں یہ علم کا سب سے بڑا فتنہ تھا جس سے علوم اور اسلامی معارف کو بڑا نقصان پہونچا۔ بطور مثال اسلامی علوم میں اصول فقہ کو لیجئے جو علوم دین اور علوم اجتہاد میں ایک لطیف ترین فن ہے جو قرآن وسنت سے نئے نئے استنباطات کے لئے سب سے اہم راستہ تھا، جس کی باقاعدہ تدوین کا فخر دولت عباسیہ کے سب سے پہلے قاضی القضاۃ امام ابو یوسفؒ کو حاصل ہے، اور امت میں اس کے بعد سب سے پہلی کتاب امام محمد ابن ادریس الشافعی کی کتاب ''الرسالہ'' ہے جو عرصہ ہوا کہ مصر میں ''کتاب الام'' کے ساتھ چھپ چکی تھی اور اب کچھ عرصہ ہوا بہت آب وتاب سے دوبارہ قاہرہ سے شائع ہوئی ہے، اسی فن میں امام ابو بکر رازی جصاص (متوفی ۳۷۰ھ) نے کتاب ''الفصول فی الاصول'' لکھی جس کا ایک عمدہ نسخہ دار الکتب المصریہ قاہرہ میں موجود ہے اور جس کی نقل راقم الحروف کے توسط سے مجلس علمی ڈابھیل حال کراچی کے لئے ہندوستان وپاکستان آئی، امام فخر الاسلام بزدوی نے ''کتاب الاصول'' لکھی جس کی عمدہ ترین شرح عبد العزیز بخاری کی ہے، جو ترکی کے سابق دار الخلافہ سے دو دفعہ شائع ہوئی اور جس کی محیر العقول عظیم ترین شرح امیر کاتب عماد الدین اتقانی کی ''الشامل'' دس جلدوں میں دار الکتب المصریہ قاہرہ میں موجود ہے، اور اس کا ایک نسخہ استنبول کے کتب خانہ فیض اللہ آفندی میں ہے، لیکن افسوس کہ دونوں جگہ ابتدائی دوڈھائی جزء کا نقص ہے، اس کی نقل بھی راقم الحروف کے توسط سے مجلس علمی میں آچکی ہے، امام شمس الائمہ سرخسی نے ''کتاب الاصول'' لکھی جس کے نسخے ترکی ومصر میں موجود ہیں، یہ اور اس کے علاوہ اس فن میں متقدمین کی عمدہ اور نافع کتابیں ہیں، اس کے علاوہ اس فن میں امام ابو زید دبوسی کی کتاب ''تقویم الادلہ'' بے نظیر ہے۔

اب خیال فرمائیے کہ ایسی نادرۂ روزگار کتابوں کی جگہ ابن ہمام کی 'تحریر الاصول' اور ابن حاجب کی ''مختصر الاصول'' اور بیضاوی کی ''منہاج الاصول'' یا ابو البرکات نسفی کی ''منار الاصول'' یا صدر الشریعہ کی ''تنقیح الاصول'' نے لے لی۔ اگر ''تحریر الاصول'' کی شرح ''التقریر والتحبیر'' ابن امیر الحاج کی نہ ہو اور قاضی بیضاوی کی منہاج کی شرح الاسنوی کی نہ ہو تو یہ

چیستانیں امت کے کیا کام آسکتی ہیں؟ یہ مانا کہ ان میں کچھ دقیق ولطیف ان کے مختارات یا خصوصی ابحاث بھی ہیں لیکن دوسری طرف مہمات جس تعبیر میں ادا ہوتی ہیں وہ کوئی علمی روح بیدار کرنے کیلئے مفید نہیں ہوسکتیں" (مدارس عربیہ کا نصاب ونظام تعلیم، ص ۹ تا ۱۲)۔

حضرت مولانا بنوریؒ نے اصول فقہ کی جن اہم ترین کتابوں کا ذکر فرمایا ہے ان میں سے اکثر اس وقت غیر مطبوعہ تھیں لیکن الحمد للہ اب وہ سب کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ان سے استفادہ کرنے اور انہیں درسی حلقوں میں رائج کرنے کی ضرورت ہے۔

چند مشورے

مدارس عربیہ میں رائج فقہی نصاب درس کے جائزہ کے بعد اس کے تعلق سے چند تجاویز اور مشورے اس امید کے ساتھ پیش کئے جا رہے ہیں کہ مدارس عربیہ کے ذمہ دار علماء اور ماہرین تعلیم ان پر غور کریں گے، اور ان کے مفید اجزاء کو قبول کرلیں گے۔

۱- فقہی نصاب درس کا اس طرح ترتیب دیا جانا از حد ضروری ہے کہ فراغت سے پہلے تمام ابواب فقہیہ کم از کم ایک بار طالب علم کی نگاہ سے گزر جائیں، اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ فقہ کی ایک جامع کتاب جس میں فقہ کے تمام ابواب شامل ہوں، مثلاً قدوری، اسے کامل طور پر شامل نصاب کیا جائے، خواہ اس کی تعلیم ایک سال کے بجائے دو سال میں ہو، دوسری صورت یہ ہے کہ نصاب میں شامل کی جانے والی مختلف کتابوں کی جلدوں اور ابواب کا انتخاب کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ فقہ کا کوئی اہم باب چھوٹنے نہ پائے حتی کہ وہ ابواب جن کی موجودہ حالات میں بظاہر ضرورت نہیں ہے، مثلاً کتاب العتق وغیرہ، ان ابواب کے مسائل کا بھی کم از کم ایک بار طالب علم کی نظر سے گزرنا ضروری ہے، کیوں کہ ان ابواب کو مکمل طور پر نظر انداز کردینے کی صورت میں ان سے تعلق رکھنے والی آیات اور احادیث طلباء کے لئے معمہ بن جاتی ہیں، اور ان ابواب فقہیہ نیز ان سے متعلق آیات واحادیث میں جو اصولی ہدایات اور تعلیمات پنہاں ہیں ان سے طالب علم

محروم رہ جاتا ہے، خلاصہ یہ ہیکہ نصاب فقہ کا اس طرح ترتیب دیا جانا ضروری ہے کہ عالمیت کا مرحلہ عبور کرنے سے پہلے کم از کم ایک بار طالب علم کی نگاہ تمام ابواب فقہیہ پر ہو جائے۔

٢- طالب علم کے سامنے مسائل کے تکرار واعادہ سے یہ فائدہ تو ضرور ہوتا ہے کہ وہ مسائل طالب علم کے ذہن میں راسخ ہو جاتے ہیں، لیکن تکرار واعادہ کا یہ عمل اس طرح نہیں ہونا چاہئے کہ بعض ابواب فقہیہ کے مسائل تو بار بار پڑھائے جائیں اور بعض ابواب فقہیہ سے طالب علم بالکل کورا رہ جائے، مختلف مدارس عربیہ کے نصاب کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آئی کہ بہت سے مدارس میں نصاب کی ترتیب اس انداز سے ہے کہ عبادات کے مسائل تو طالب علم کے سامنے بار بار آتے ہیں، احوال شخصیہ، نکاح وطلاق وغیرہ کے مسائل صرف ایک بار پڑھائے جاتے ہیں اور معاملات (خرید وفروخت وغیرہ) کے ابواب ایک بار بھی طالب علم کی نگاہ سے نہیں گزرتے، مثلاً بعض مدارس میں فقہ کا نصاب اس طرح ہے کہ ابتداءاً "مالا بدمنہ" کا درس ہوتا ہے، اور اس میں بھی عبادات کے حصے پر اکتفا کیا جاتا ہے، اس کے بعد "نورالایضاح" کی تعلیم ہوتی ہے، اس کے ساتھ "قدوری" کا ابتدائی حصہ ہوتا ہے، "قدوری" کے بعد "کنز الدقائق" کے ابواب عبادات شامل نصاب ہیں، کنز الدقائق کے بعد شرح وقایہ جلد اول کی تعلیم ہوتی ہے، شرح وقایہ جلد اول کے بعد ہدایہ جلد اول اور ہدایہ جلد ثانی کے کچھ ابواب شامل نصاب ہیں، ظاہر ہے کہ جن طلباء نے فقہ کا یہ نصاب پڑھا ان کے سامنے عبادات کے مسائل تو پانچ بار آئے اور احوال شخصیہ (نکاح وطلاق وغیرہ) کے مسائل صرف ایک بار آئے وہ بھی کچھ ہی مسائل، معاملات کے مسائل ان کے سامنے ایک بار بھی نہیں آئے، اس طرح کا نصاب درس پڑھنے والے فضلاء تعلیم کی تکمیل کے بعد بھی فقہ کے اکثر ابواب سے نا آشنا رہ جاتے ہیں، زندگی کے روزمرہ کے مسائل کے بارے میں وہ امت کی رہنمائی کس طرح کر سکتے ہیں، میرا خیال یہ ہے کہ جن مدارس کے نصاب تعلیم میں اس طرح کا عدم توازن ہو، اسے درست کیا جانا چاہئے، عبادات کے مسائل کا پانچ پانچ بار اعادہ

ضروری نہیں ہے، اگر کنز الدقائق اور شرح وقایہ کو نصاب سے خارج کر کے نور الایضاح کے بعد قدوری کی مکمل تعلیم دی جائے اور قدوری کے بعد ہدایہ کی ابتدائی دو جلدیں اور ہدایہ آخرین کے منتخب ابواب طالب علم کو پڑھا دیے جائیں تو زیادہ مفید رہے گا۔

۳- تمام ہی مدارس کا اصول فقہ کا نصاب بہت ہی ادھورا ہے، اصول فقہ ہی کی اچھی تعلیم اور تمرین کے ذریعہ طلباء کا فقہی ذوق پروان چڑھ سکتا ہے، ان میں فقیہانہ ژرف نگاہی اور قوت استنباط پیدا ہوسکتی ہے، ہمارے فقہاء مجتہدین نے ان ہی اصولوں کا استعمال کر کے فقہ کا عظیم الشان ذخیرہ تیار کیا، اپنے دور کے مسائل حل کیے، دور حاضر میں پیش آنے والے ہزاروں نت نئے مسائل کا صحیح شرعی حل اسی وقت تلاش کیا جاسکتا ہے جب کہ فقہاء مجتہدین کے اصول اجتہاد واستنباط (جو اصول فقہ کی صورت میں مدون ہو چکے ہیں) کو بروئے کار لاکر ان کا حل تلاش کیا جائے، اس وقت مدارس عربیہ میں اصول فقہ کی تعلیم عموماً اس نقطہ نظر سے ہوتی ہی نہیں کہ ہمیں ان اصولوں کو برتنا ہے اور ان کے ذریعہ نئے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے، اصول فقہ کی تعلیم کا انداز یہ ہوتا ہے کہ جیسے کوئی شخص میوزیم میں جاکر وہاں محفوظ قدیم ترین آلات جنگ کے بارے میں یہ تعارف کرائے کہ یہ بندوق فلاں بادشاہ کے دور میں تیار ہوئی اور فلاں جنگ میں استعمال ہوئی اور اس توپ کو فلاں بادشاہ نے فلاں معرکہ میں استعمال کیا۔

اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مدارس میں اصول فقہ کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جائے، اصول فقہ کی تعلیم ایک زندہ علم کی حیثیت سے دی جائے، اور طلباء کو ان اصولوں کے استعمال کی مشق کرائی جائے، کوئی بھی اصل یا ضابطہ پڑھا کر ایک دو روایتی مثالوں پر اکتفا کرنے کے بجائے طلباء کو اس کا عادی بنایا جائے کہ وہ مختلف ابواب فقہیہ کے مسائل میں اس کا اجراء کریں، تاکہ ان کی قوت استنباط میں جلا پیدا ہو اور نئے مسائل میں ان اصولوں کو استعمال کرسکیں۔

عام طور سے مدارس میں اصول فقہ کی سب سے پہلی کتاب اصول الشاشی پڑھائی جاتی

ہے، اصول الشاشی میں زیادہ تر اشارہ واختصار سے کام لیا گیا ہے، ابتدائی مرحلہ میں طلباء کی ذہنی سطح سے یہ کتاب بلند معلوم ہوتی ہے، اصول الشاشی سے پہلے کوئی ایک ایسی کتاب شامل نصاب ہونی چاہئے جس میں انتہائی سادہ وسہل انداز میں اصول الفقہ کے مبادی کا بیان ہو، اور اس کی اہم اصطلاحات کی آسان تشریح کی گئی ہو، اس وقت عموماً مدارس میں اصول فقہ کی صرف دو کتابیں شامل نصاب ہیں: (۱) اصول الشاشی (۲) نورالانوار، اصول الشاشی مختصر ہونے کے باوجود مکمل نہیں ہو پاتی، عموماً کتاب اللہ کے مباحث ختم کراتے کراتے سال گزر جاتا ہے، کسی استاذ نے زیادہ محنت کی تو سنت اور اجماع کی بحث پڑھادی، قیاس کی بحث تو عموماً پڑھانے سے رہ جاتی ہے، حالانکہ مسائل کے استنباط واستخراج میں مباحث قیاس کی بڑی اہمیت ہے۔ ''نورالانوار'' کا صرف ابتدائی حصہ جو کتاب اللہ کے مباحث پر مشتمل ہے پڑھایا جاتا ہے، عام طور سے مدارس میں اصول فقہ کے نصاب کی یہ پوری کائنات ہے، بعض مدارس میں حسامی کا کچھ حصہ بھی شامل درس ہے، ظاہر بات ہے کہ اتنا سا نصاب پڑھنے سے اصول فقہ کے مسائل سے پوری واقفیت تو کجا ادنی شناسائی بھی نہیں ہو پاتی۔

۴- یورپ کے صنعتی انقلاب کے بعد زندگی کے اکثر شعبوں میں انقلاب سا آگیا ہے، انیسویں صدی کی تیز رفتار سائنسی اور سماجی تبدیلیوں نے دنیا کی کایا پلٹ دی، تجارت، لین دین، صنعت وحرفت کی نئی نئی شکلیں وجود میں آچکی ہیں، اقتصادیات ومعاشیات کا ڈھانچہ کلیۃً تبدیل ہو چکا ہے، ان دو صدیوں کی تیز رفتار تبدیلیوں نے جو مسائل کھڑے کئے، اسلام نے ان کا حل بھی پیش کیا، ہمارے فقہی نصاب درس میں متقدمین کی جو کتابیں شامل نصاب ہیں اور جن کا ذکر بار بار آچکا ہے ان میں نئے تبدیل شدہ حالات اور نئے مسائل کا ذکر نہیں ہے، اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ایسی کتاب ترتیب دے کر شامل نصاب کی جائے جس میں اہم ترین نئے مسائل کا تعارف اوران کا شرعی حل پیش کیا گیا ہو، دور حاضر کے فقہاء اور فقہ اکیڈمیوں نے نئے مسائل

پر جو کام کیا ہے انہیں سامنے رکھ کر ایسی کتاب مرتب کی جا سکتی ہے۔

۵- تمام بڑے مدارس میں تخصص فی الفقہ کا دو سالہ کورس رکھا جائے، فارغ ہونے والے ذہین طلباء جنہیں فقہ سے خصوصی دلچسپی وشغف ہو انہیں تخصص فی الفقہ میں معقول وظیفہ کے ساتھ داخل کیا جائے، تخصص فی الفقہ کا نصاب اس طرح ترتیب دیا جائے کہ اسے پڑھنے سے آیات احکام اور احادیث احکام پر گہری نظر ہو، مجتہدین وفقہاء کے علمی سرمایہ سے کامل واقفیت ہو، اس بات کی کوشش کی جائے کہ تخصص کے طلبہ چاروں فقہی مسالک کی اہم شخصیات اور اہم کتابوں سے واقف ہو جائیں اور ان سے استفادہ کر سکیں، ان میں وسعت نظری اور وسعت ظرفی پیدا ہو، نئے مسائل اور نئے حالات کا صحیح علم واحساس پیدا ہو، تحقیق واستنباط کی صلاحیت پروان چڑھے اور دور حاضر میں اسلامی قانون کے نفاذ کی لگن اور تڑپ پیدا ہو، تخصص فی الفقہ میں پڑھنے والے طلباء اس لائق ہو جائیں کہ وہ دور حاضر میں اسلامی قانون کی صحیح تعبیر وتشریح کرنے کے ساتھ اسلامی قانون کی ابدیت اور برتری ثابت کر سکیں اور مغربی قوانین کے مقابلہ میں اسلامی قانون کے خصائص وامتیازات پر روشنی ڈال سکیں۔

۶- فقہ کے ساتھ نئی معاشیات اور اصول قانون کو بھی داخل نصاب کیا جائے، ہمیں امید ہے کہ دینی مدارس کے ذہین اور محنتی طلباء کو جدید معاشیات اور اصول قانون سے آشنا کرنے میں اس سے کہیں کم وقت خرچ ہوگا جتنا وقت ان موضوعات کی تعلیم کے لئے کالجوں میں درکار ہوتا ہے، جدید معاشیات اور اصول قانون سے واقف ہونے کے بعد ہمارے فضلاء اس بات کے اہل ہو جائیں گے کہ وہ نئے دور کی زبان واصطلاح میں اسلام کے اقتصادی نظام اور اسلامی اصول قانون کی جامعیت اور برتری ثابت کریں اور دنیا کے سامنے ہر شعبہ زندگی کا وہ عادلانہ نظام پیش کریں جس کی جستجو دنیا بھر کے اہل فکر ودانش کو پریشان کئے ہوئے ہے۔

☆☆☆

دوسرا باب

معاصر دینی تعلیم - مشکلات واحوال

دینی مدارس: ان کی اہمیت اور ان کے مسائل پر غور

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ☆

ہماری مذہبی علوم کی بڑی درسگاہیں ہماری ملت کے فرزندوں کو اسلامی علوم و تعلیمات سے گہری واقفیت رکھنے والے ایسے افراد مہیا کرتی ہیں، جو مذہبی معاملات میں نہ صرف یہ کہ ان کی ضرورت پوری کریں بلکہ وقت کے دوسرے پیچیدہ دینی معاملات میں ان کی رہبری کریں، تاکہ مسلمانوں کی زندگی مذہبی طور پر مضبوط رہے، لیکن خود مسلمانوں کے بعض دانشور حضرات ان دینی مدارس کو غیر ضروری سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک دینی تعلیم کی ایسی اہمیت نہیں کہ اس کے لئے علاحدہ سے کوئی بڑا انتظام کیا جائے کیونکہ دین کا علم ان کے نزدیک صرف چند معمولی باتوں تک محدود ہے، جو کہ بلا کسی خاص نظم و انتظام کے خود بخود معلوم ہو سکتا ہے، ان کا یہ خیال صرف ایک سطحی خیال ہے، مسلمانوں کی زندگی میں دین ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے اور تفصیلی انداز سے تعلق رکھتا ہے، اور ان کی زندگی میں پوری وسعت رکھتا ہے، اس بات کو وہ حضرات نہیں سمجھتے، وہ مغرب کے لادینی نقطۂ نظر سے ہی سوچتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ دین کی تعلیم کے لئے اتنی وسعت اور اس کو باقاعدہ نظام دینے کی ضرورت نہیں، لیکن اگر وہ دین کو زندگی میں وسیع مقام نہ دیتے ہوئے اس کو مسلمان کی زندگی کا صرف ایک پہلو ہی مان لیں تو جس طرح انسانوں کو ان کی خالص دنیاوی زندگی کے لئے میڈیکل کالجوں کی ضرورت ہے، تاکہ لوگوں کی صحت مند زندگی کے تحفظ کی اہم ضرورت پوری ہوتی رہے، اور جس طرح لا کالجوں کی ضرورت ہے کہ حکومت وقت کے

☆ ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ، وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

قوانین سے واقفیت رکھنے والے ماہرین پیدا ہوں، اور قانونی تحفظ کا انتظام ہو، اسی طرح مسلمانوں کی دینی زندگی کو اگر صرف ایک پہلو ہی سے تسلیم کرلیا جائے تو بھی انہیں ہمارے ان دینی مدارس کی اہمیت کو ماننا پڑے گا، کہ اس ضرورت کے انتظام کے لئے ایسی درسگاہوں کی ضرورت ہے جہاں ان کے دینی معاملات کے ماہر تیار کئے جاسکیں، حالانکہ اسلام میں مذہب زندگی کا صرف ایک پہلو ہی نہیں، بلکہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر احکام وتعلیمات رکھتا ہے، جن کے جاننے اور ان پر عمل کئے بغیر ہم زندگی کو اپنے پروردگار کے حکم کے مطابق نہیں بناسکتے۔

دراصل مغربی فکر کے رہنماؤں کی طرف سے تعلیمی مسئلہ میں جو تصور دیا گیا، وہ ان کے یک طرفہ صرف دنیاوی تصور کا حامل ہے، ان کا نصاب جب جاری ہوا تو اس نے ایک صدی کے عرصہ میں مسلمانوں کی نئی نسل کے ذہنوں کی تشکیل میں خاصی حد تک اسی فکر ورجحان کو اپنے رنگ میں رنگ دیا جس میں صرف دنیاوی مقاصد کو ہی کافی سمجھا گیا، اور چونکہ عوام الناس اپنے سطحی ذہن کے سبب دنیاوی کامیابی کو اہمیت زیادہ دیتے ہیں، اس لئے ان کو صرف حکومت کی سرپرستی والا نظام ہی اپنی ضرورت کے مطابق نظر آیا، چنانچہ ملک کے عامۃ الناس اور ایسے دانشور جن کے ذہن میں آخرت کا تصور مضبوط نہیں، وہ صرف اسی نقطہ نظر کو کافی سمجھنے لگے۔ اس میں دینی پہلو کی طرف بالکل توجہ نہ تھی، اس طرح مسلمانوں کی مذہبی تعلیمات اور عقائد واقدار کے سلسلہ میں جو خلاء پیدا ہورہا تھا، اس سے بچانے کے لئے ضروری تدبیر اختیار کرنے کی طرف ان کے دانشوروں کو توجہ نہیں ہوئی۔ اسی کے تدارک کے لئے ہمارے اس دور کے علماء نے توجہ کی، اور دینی مدارس قائم کئے اور ان کی نچلی سطح پر دینی مضامین کے ساتھ رائج الوقت زبان اور معلوماتی مضامین کو بھی داخل نصاب کیا۔

پھر تعلیم کی اونچی سطح پر دینی علوم میں پختگی اور حسب ضرورت رہنمائی اور دینی تقاضوں کو صحیح طریقہ سے حل کرنے کی ضرورت کو پورا کرنے میں دینی علوم میں گہرائی اور اختصاص پیدا کرنے کی جو اہمیت ہے، اس کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے، اس کو زائد از ضرورت سمجھنا مغربی فکر

ور جحان کو اپنا لینے سے پیدا ہوا ہے، یہ اسلامی فکر وعقیدہ کے بالکل خلاف ہے، اور یہ دراصل مغربی فکر کے الحادی تصور کے اثر سے پیدا ہوا ہے۔ مذہبی علوم کی مقدار اور اس میں دیئے جانے والے وقت کو گھٹانے کی جو بات کہی جاتی ہے، اس کی بنیاد دراصل مذہبی علوم کی وسعت اور ان میں اختصاص پیدا کرنے کی اہمیت کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے ہے، ہماری مغربی نقطہ نظر کی تعلیم گاہیں جن کا نظام دراصل مغربی سامراج کے عہد میں شروع ہوا، وہ ایسے افراد پیدا کررہی ہیں جن میں اسلامی نقطہ نظر کے اعتبار سے اس طرح کا خیال پیدا ہو جاتا ہے، وہ اگر اسلامی عقیدہ اور اس کی ساری تعلیمات کو اہمیت نہیں دیتے تو وہ کم از کم یہ تو کر سکتے ہیں کہ مذہبی درسگاہوں کی اسلامی علوم میں تخصص پیدا کرنے کے عمل کو مسلمانوں کی ایک اہم تعلیمی ضرورت سمجھ کر انہیں اپنا کام کرنے دیں، اور وہ خود اتنا تو کر سکتے ہیں کہ اپنی تعلیم گاہوں کے ابتدائی مرحلہ کی تعلیم میں دینی عقیدہ اور بنیادی احکام کے مضمون کو بھی شامل نصاب کریں۔ اس کو داخل نصاب کرنے میں ان کا کوئی حرج نہیں، بلکہ ان کا شامل کرنا آغاز تعلیم میں مسلمان بچوں میں دینی بنیادوں کو مضبوط رکھنے کی ضرورت کی بنا پر، بہت ہی مناسب اور ضروری ہے، افسوس یہ ہے کہ وہ دینی تقاضے کے مضامین کو اپنے نصاب میں جگہ نہیں دیتے، اور اس کے نتیجہ میں وہاں کے فیض یافتہ حضرات بجائے اپنے تعلیمی نظام کے اس نقص کو محسوس کرتے، وہ ہماری دینی تعلیم گاہوں کی طرف سے دینی ضرورت کو حل کرنے کا جو نظم کیا جاتا ہے اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے اکثر دینی مدارس اپنے بنیادی، ابتدائی اور متوسط تعلیم کے مرحلہ میں نصاب تعلیم کے ان دونوں پہلوؤں کو جمع کرتے ہیں، اور زندگی کے تقاضوں کے حامل علوم ومعلومات کو شامل نصاب کرنے لگے ہیں، البتہ وہ اپنے نظام تعلیم کے اوپر کے درجات میں امت کی دینی رہبری اور دینی معاملات پر پورا عبور حاصل کرنے کی استعداد پیدا کرنے کے لائق توجہ ونظم کو اختیار کرتے ہیں، تاکہ امت کی اس پہلو کی ضرورت پوری ہو، ہمارے عصری علوم کی ان ابتدائی تعلیم کی تعلیم گاہوں میں اگر دونوں پہلوؤں کی ضرورت پورا کرنے کا عمل ہو تو مغربی فکر کے لائے ہوئے نظام تعلیم کے دونوں پہلوؤں کے درمیان جمع

کرنے کی صورت میں تھی وہ جامعیت اب بھی قائم کی جا سکتی ہے، بشرطیکہ مسلمانوں کی دینی تعلیم کی اس ضرورت کو سمجھا اور مانا جائے، اس کام کو عصری درسگاہیں اپنے وسیع وسائل کے ذریعہ سے زیادہ آسانی سے کر سکتی ہیں۔ ان کے مقابلہ میں ہماری دینی درسگاہیں بہت تنگ اور محدود وسائل رکھتی ہیں، اس لئے ان کے لئے تعلیم کی متعدد اور مختلف شاخوں کو پورے طور پر جمع کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ اس کے باوجود ہمارے دینی مدراس اپنے ابتدائی اور ایک حد تک ثانوی مرحلہ میں دینی پہلو کا حق ادا کرتے ہوئے زندگی کے دیگر لازمی تقاضوں کا لحاظ اپنے محدود وسائل کے ساتھ کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں، چنانچہ ان کے ابتدائی مرحلہ کے نصاب میں رائج الوقت زبان اور لازمی سماجی مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں، جس سے دین اور دنیا کے دونوں پہلوؤں کی جامعیت حاصل ہو جاتی ہے، اس کو اگر ہمارے جدید فکر کے دانشور دیکھ لیں تو ان دینی مدارس کے متعلق انہیں صحیح رائے قائم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

اس کے برخلاف رائج تعلیمی نظام میں مسلمانوں کی زندگی کی مذہبی ضرورت کو بالکل نظر انداز کر دیئے جانے سے اس سلسلے میں جو خلا پیدا ہوتا ہے، اس کے نتیجہ میں اسلامی عقیدہ و عمل کے لئے جو خطرہ پیدا ہوتا ہے، اس کو دھیان میں رکھتے ہوئے غیرت اسلامی کے حامل مسلمانوں نے اسی تدارک کے لئے اسلامی تشخص اور دینی تقاضے کو سامنے رکھتے ہوئے ہی یہ ضرورت سمجھی کہ دینی تعلیم کے لئے علاحدہ سے نظام قائم کیا جائے تا کہ اس کے ذریعہ صحیح دینی عقیدہ و اسلامی تصور کا جو خلا ہو رہا ہے، اس کا تدارک جس حد تک بھی ہو سکے کیا جائے، اس کے لئے علماء دین مخصوص دینی مدرسے قائم کرنے پر مجبور ہوئے، اور تعلیم کے اعلی مرحلہ میں علوم اسلامیہ کے ماہر علماء تیار کرنے کا انتظام کیا، تا کہ جدید خاصل مادی فکر کے اثر سے پیدا ہونے والے اسلام مخالف اثرات کا مقابلہ کیا جا سکے، اور امت اسلامیہ کے دینی تشخص اور زندگی کے صالح تصور کو جس حد تک ہو سکے بچانے کا کام انجام دیا جا سکے، اسی ضرورت کو محسوس کر کے سامراجی حکومت کے زمانہ میں ہمارے علماء کرام نے دینی مدرسوں کے قیام کا اقدام کیا، اور مغرب کے خالص مادی فکر کی

حامل درسگاہوں سے نکلنے والوں میں جو دینی کمی ہے، اس کا تدارک ہو، اس کی بنا پر ہمارے مدارس کا یہ نظام بنا۔ اب آزادی کے دور میں سہولت ہے کہ ہم جدید حالات کے لحاظ سے جو ضرورت محسوس ہو، اس کو امت اسلامیہ کے دینی تقاضے کا لحاظ رکھتے ہوئے نصاب میں شامل کریں، تاکہ امت مسلمہ کے مذہبی تحفظ کے لئے جو نظم کیا جاسکے کیا جائے، اور مسلم عوام کو ضروری دینی رہنمائی بھی ملے، جس کے ذریعہ وہ زندگی کو اسلامی اقدار کے مطابق استوار کرسکیں، اسی فکر مندی کے باعث ملک کے علمائے دین نے دینی مدارس قائم کئے تھے جو مادی وسائل کی سخت کمی کے باوجود اہل اسلام کو ان کے دینی تقاضہ سے واقف کراتے، اور علوم دینیہ اور اس کی ضرورت کے مطابق ان مدارس کو چلاتے رہے، مسلمانوں کا مذہب سے جو تعلق ہے اس کی بنا پر عوام کی طرف سے علماء کی کوششوں کو عام طور سے سراہا اور پسند کیا جاتا ہے۔

ہمارے ان دینی مدارس پر ایک یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان میں تعلیم حاصل کرنے والے زندگی کے دیگر تقاضوں سے صرف نظر کرتے ہیں، اور ایسے افراد پیدا کرتے ہیں جو سوائے نماز روزے کے زندگی کی دوسری ضروریات کو پورا کرسکنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اور نہ حالات زمانہ کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، لوگوں کا یہ اعتراض ان کی بے خبری کی وجہ سے ہے، انہوں نے ان مدارس سے حاصل ہونے والی صلاحیتوں کو جاننے کی کوشش نہیں کی، یہ مدارس اگرچہ خالص دینی علوم کے لئے قائم کئے جاتے ہیں، لیکن یہ ابتدائی مرحلہ کی تعلیم میں زندگی کے ضروری پہلوؤں کی تعلیم کو بھی جگہ دیتے ہیں، اور اوپر کی تعلیم میں بھی زندگی کے ضروری تقاضوں سے بھی حسب استطاعت واقف کرادیتے ہیں۔

موجودہ عہد کی یہ بات بھی سامنے رکھنے کی ضرورت ہے کہ مسلم دشمنی کا نیا رجحان مسلمانوں کے دینی شعور کو ختم کرنے کی سازش کے رجحان میں آتا ہے۔ عالمی پیمانہ پر اس امت اسلامیہ کو بے اثر بلکہ بے نام ونشان کردینے کی کوشش ہورہی ہے، جگہ جگہ ان کے بقا اور دین کے ساتھ ان کے تعلق کو ختم کردینے کی سازشیں چل رہی ہیں، کہیں علمی وفکری میدان میں، کہیں تمدنی

وتاریخی میدان میں، کہیں سیاسی وسماجی میدان میں ایسے ایسے فتنہ کھڑے کئے جا رہے ہیں کہ اگر ان کے مقابلہ کے لئے ممتاز اہل علم واعلی صلاحیت کے علماء وفضلاء تیار کرنے کا کام نہ کیا گیا، تو اس امت کے وجود کو خطرہ پیش آسکتا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے ہمارے اعلی دینی تعلیم کے اداروں کی اہمیت کو کم نہ سمجھنا چاہئے ان کی حیثیت اسلامی عقیدہ وفکر کے قلعوں کی ہے، اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی اہمیت سمجھنا چاہئے، اوران کو تقویت پہنچانا چاہئے۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارے ان اعلی دینی تعلیم کے اداروں میں حالات حاضرہ اور موجودہ خطرات کو سامنے رکھتے ہوئے نصاب میں ترمیم واضافہ کا عمل جاری ہے۔

☆☆☆

معاصر دینی تعلیم - تقاضے اور دشواریاں

مولانا بدر الحسن القاسمی (کویت) ☆

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کو اللہ تعالیٰ نے گہرا علم اور غیر معمولی بصیرت عطا کی تھی، ان کا دماغ نہایت زرخیز، حافظہ بیحد قوی، اور دل انتہائی روشن تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انکو عبقریانہ خصوصیات کے ساتھ نہایت رواں قلم اور بے انتہا فصیح و بلیغ زبان بھی عطا کی تھی۔ وہ بے مثال محقق، عظیم قلمکار سبھی کچھ تھے۔ انہوں نے دار العلوم دیو بند سے شائع ہونے والے ''القاسم'' کی ادارت اس زمانہ میں کی جب علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ اور مولانا اعزاز علیؒ جیسے نامور ارباب علم و فضل موجود تھے۔ انکے بارے میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا قول ہے کہ ''مناظر احسن کے سارے مناظر احسن ہیں''

انہوں نے ۹؍سال تک ٹونک میں منطق و فلسفہ اور دیگر عقلی علوم میں امامت کا درجہ رکھنے والے حکیم برکات احمد ٹونکی سے صرف منطق و فلسفہ اور دیگر عقلی علوم پڑھے تھے، پھر دار العلوم دیو بند میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی بابرکت صحبت سے فیضیاب اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے دریائے علم سے بہرہ ور ہوئے، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے انکے بارے میں لکھا ہے کہ مولانا گیلانیؒ کا قلم اسلام کی طرف سے دفاع میں تیغ رانی کا کام کرتا ہے۔

انہوں نے قدیم ماحول میں رہنے اور روایتی علوم و فنون سے حظ وافر پانے کے بعد جدید

☆ نائب صدر اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

دانشگاہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں صدر شعبۂ دینیات پر فائز رہ کر ایک عالم کو فیضیاب کیا۔ انکی مایہ ناز کتاب ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت'' ہمارے دینی مدارس کے نصاب کی عہد بہ عہد ترقیوں، تبدیلیوں، خوبیوں اور خرابیوں سب کی بہترین داستان ہے۔ ہمارے ''درس نظامی'' پر ایرانی ثقافت کا کتنا گہرا اثر رہا ہے اس کا اندازہ اس کتاب سے لگایا جاتا ہے۔

میر باقر داماد کی لغو ولایعنی کتاب ''الأفق المبین'' نے کتنے دنوں تک لوگوں کے ذہنوں کو اپنا اسیر رکھا، صدر الدین شیرازی کی ''اسفار اربعہ'' اور پھر صدرا'' اور ملا محمود کی ''شمس بازغہ'' وغیرہ کیوں لکھی گئیں اور طبقہ علماء کے نصاب کا جز کس طرح بنیں یہ ایک دلچسپ داستان ہے اور اس پس منظر کو رکھے بغیر نصاب کی بہت سی کتابوں کے بارے میں ہمارا ذہن و دماغ صاف نہیں ہوسکتا، اور نہ اس طرح کی کتابوں سے جذباتی وابستگی ختم ہوسکتی ہے۔

نصاب تعلیم کی کتابوں کے بارے میں ہر حلقہ اپنا الگ نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ جامعہ ازہر کے قدیم نصاب اور برصغیر کے مدارس کے نصابوں میں مختلف علوم و فنون کی تعلیم کے سلسلہ میں بڑی حد تک مماثلت تھی جو اَب باقی نہیں رہی، اور خلیجی ریاستوں کی تعلیم گاہوں کا نصاب اور نظام تعلیم اس سے قطعی الگ ہے۔

دار العلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس سے پہلے جب حضرت مولانا محمد سالم قاسمی کا اور میرا بعض خلیجی ملکوں سعودی عرب، متحدہ عرب امارات وغیرہ کا سفر ہوا تو اس سفر میں بہت سی دلچسپ باتیں پیش آئیں۔

ریاض میں ہم لوگ سعودی عرب کے سابق مفتی شیخ عبد العزیز بن بازؒ کے مہمان تھے، ہمارے اور شیخ کے درمیان واسطہ نامور ادیب و رحالہ (سیاح) دسیوں کتابوں کے مصنف معالی الشیخ محمد بن ناصر العبودی (حال مساعد امین عام رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ) تھے۔ شیخ ابن باز بلند پایہ عالم اور عقیدہ کے معاملہ میں بڑے پختہ اور غیور انسان تھے، جس چیز کو وہ حق سمجھتے اس کا برملا اظہار کرتے

تھے، پہلے دن تو انہوں نے بڑی پرتپاک دعوت کی جسمیں متعدد اہل علم شریک تھے، ایک صاحب نے شیخ کے کان میں کچھ پھونکا تا کہ شیخ دار العلوم سے بدظن ہو جائیں تو اگلے دن مجلس میں جیسے ہی میں نے سلام کیا اور نابینا ہونے کے باوجود محض آواز سے شیخ لوگوں کو پہچان لیا کرتے تھے انہوں نے فرمایا: شیخ بدر کیف الحال؟ پھر اگلا جملہ بیٹھتے ہی یہ ارشاد فرمایا کہ:

سمعنا أنكم أشاعرة! (میں نے یہ سنا ہے کہ تم لوگ (اہل دیوبند) عقیدہ کے لحاظ سے اشعری ہو)

میں نے برجستہ کہا کہ:

أول كتاب يدرس عندنا في العقيدة هي "العقيدة الطحاوية" (ہمارے یہاں عقیدہ کی پہلی کتاب جو پڑھائی جاتی ہے وہ "عقیدہ طحاویہ" ہے)

شیخ نے حیرت کے ساتھ سوال کیا:

أنتم تدرسون العقيدة الطحاوية؟ (اچھا، تم لوگ عقیدہ طحاویہ پڑھتے ہو؟)

میں نے عرض کیا کہ ہمارے دار العلوم دیوبند کے مہتمم یا رئیس الجامعہ شیخ محمد طیب صاحبؒ نے "العقيدة الطحاوية" کی شرح بھی لکھی ہے یہ سنکر شیخ خاموش ہو گئے۔

ظاہر ہے امام طحاویؒ احناف کے بلند پایہ امام ہیں اور انہوں نے "العقيدة الطحاوية" کے نام سے امام اعظم ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے عقیدہ کی ترجمانی کی ہے اسلئے اصل الاصول تو وہی ہے۔ جہاں تک متأخرین میں شرح عقائد نسفی اور شرح مواقف وغیرہ کی تدریس کے رواج کی بات ہے تو وہ بعد کے حالات کا نتیجہ اور باطل فرقوں کی تردید کے طور پر نصاب تعلیم کا جز بنی ہیں، اور اُمت کے دو تہائی علماء اشاعرہ وماتریدیہ ہی کہلاتے ہیں چنانچہ علامہ ابن حجر عسقلانیؒ، امام نوویؒ، امام خطابیؒ اور دیگر بیشتر فقہاء ومحدثین اسی زمرہ میں آتے ہیں جنکی علمی عظمت اور جلالت شان کا انکار نہیں کیا جاسکتا ہے اور نہ انکی دینی وعلمی خدمات کا انکار، ان کی کتابیں ہی

شروح حدیث میں ہر مسلک و مذہب کے لوگوں کیلئے مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اسی سفر میں شیخ محمد بن ناصر العبودی نے ایک شب اپنے گھر میں ہم لوگوں کو کھانے پر مدعو کیا، اور اس مجلس میں اپنے استاذ اور سعودی عرب کے نامور عالم، قضاء کونسل کے سابق سربراہ، موجودہ امام حرم شیخ صالح بن حمید کے والد ماجد شیخ عبداللہ بن حمیدؒ کو بھی عقیدت سے بلایا اور ہم لوگوں کا ان سے تعارف کرایا۔

شیخ ابن حمیدؒ ایک بلند پایہ فقیہ اور فقہ حنبلی پر دسترس رکھنے والے بڑے عالم تھے اور شیخ ابن بازؒ ہی کی طرح اتفاق سے بینائی سے بھی محروم تھے لیکن ان کا دل علم نبویؐ کے نور سے منور تھا۔

تعارف کے ساتھ ہی انہوں نے سوال کیا کہ:

تم لوگ دارالعلوم دیوبند یا ہندوستان میں علم تفسیر میں کیا پڑھاتے ہو؟

میں نے عرض کیا کہ:

''تفسیر جلالین'' انہوں نے دریافت کیا کہ: اس کے بعد؟ میں نے کہا کہ ''تفسیر بیضاوی'' تو شیخ نے کسی قدر دہشت و استغراب کے ساتھ فرمایا کہ:

فیہ تأویل (اس میں آیات صفات کی تاویل کی گئی ہے)

میں نے عرض کیا کہ:

نحن نعرف بأن فيه تأويلا ولكن لا نستنكف حتى من "الكشاف" للزمخشرى مع أن فيه اعتزالا، ونرى أن هذه مسئولية المدرس أن ينبه الطلاب على ما فيه من أخطاء.

(ہمیں معلوم ہے کہ اس میں تاویل ہے لیکن ہم لوگ یہ جانتے ہوئے کہ زمخشری کی تفسیر کشاف میں اعتزال ہے اس کے پڑھانے سے نہیں ہچکچاتے کیونکہ ہمارے یہاں یہ مدرس کی ذمہ

داری ہے کہ کتاب میں پائی جانے والی غلطیوں پر طلبہ کو متنبہ کرے اور اسکی کمزوری کو ظاہر کرے)

شیخ تو یہ سنکر خاموش ہو گئے، میں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے عرض کیا کہ:

نختار كتب المنهج الدراسي للتأهيل وليس لإعطاء المعلومات، فالذي يدرس تفسير البيضاوي يستطيع أن يتعامل مع تفسير الرازي وتفسير الزمخشري، لكن من يكتفي بتفسير ابن كثير في الدراسة لا يملك القدرة لفهم ما فيهما من نقاط الضعف.

(ہمارے یہاں کا طریقۂ کار یہ ہے کہ ہم نصاب کیلئے ایسی کتابیں اختیار کرتے ہیں جن سے پڑھنے والوں میں فنی صلاحیت پیدا ہو، یہ مقصد نہیں ہوتا کہ ان کے ذہنوں کو زیادہ سے زیادہ معلومات سے بھر دیا جائے چنانچہ ہمارے خیال میں جس شخص نے تفسیر بیضاوی سمجھ کر پڑھ لی ہو اس کے لئے امام رازیؒ کی تفسیر اور زمخشریؒ کی الکشاف کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے، لیکن جس نے صرف تفسیر ابن کثیرؒ پڑھی ہو تو اس میں یہ صلاحیت پیدا نہیں ہو سکتی کہ وہ ان کتابوں کی باریکیوں اور انکی کمزوریوں کو سمجھ سکے)

برصغیر کے دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی کی بحث کے آغاز پر ایک صدی سے زائد عرصہ گزر چکا ہے لیکن تبدیلی کے حامیوں اور نصاب کو جوں کا توں برقرار رکھنے کی وکالت کرنے والوں میں کوئی فریق بھی ایک دوسرے کو اپنے نقطۂ نظر کا قائل نہ کر سکا۔

ندوۃ العلماء کی تحریک اسی مقصد سے شروع ہوئی، اور تبدیل شدہ نصاب کے مطابق سیکڑوں مدارس قائم ہوئے لیکن "درس نظامی" کو مثالی اور آئیڈیل نصاب سمجھنے والے مدارس کی نہ تو تعداد کم ہوئی اور نہ ان کا اثر کم ہوا اور دونوں ہی طرح کے مدارس اپنی اپنی ڈگر پر چلتے رہے، البتہ زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ "درس نظامی" میں معقولات کا حصہ بتدریج کم ہوتا رہا اور نحو وصرف اور معانی وبیان کی بھی بعض مشکل کتابیں نصاب سے خارج کر دی گئیں لیکن اصل ڈھانچہ میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں ہوئی۔

قدیم نصاب کے حامیوں کا کہنا ہے کہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جیسی شخصیتیں جس نصاب تعلیم سے پیدا ہوئیں، اور خاص طور پر شرعی علوم یعنی تفسیر و حدیث اور فقہ اُصول میں جس دقت نظر کے حامل یہ لوگ ہوئے ہیں ویسی صلاحیت پیدا کرنے میں تبدیل شدہ نصاب کامیاب نہیں رہا ہے جبکہ اصل مقصود شرعی علوم میں مہارت ہی ہے، محض عربی یا اُردو میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کر لینا دینی مدارس کے قیام کا ہرگز مقصد نہیں رہا ہے۔

جبکہ تبدیلی کی وکالت کرنے والوں کا خیال یہ ہے کہ قدیم نصاب کے مطابق عربی زبان کے قواعد نحو وصرف و بلاغت و معانی کی مشکل ترین کتابیں سالہا سال پڑھتے رہنے کے باوجود نہ عربی زبان میں اپنے مافی الضمیر کی قدرت پیدا ہوتی ہے اور نہ تصنیف و تالیف کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے اور ساری زندگی نصابی کتابوں کے شروح و حواشی میں بسر ہو جاتی ہے، اس طرح کسی علم کے بارے میں معلومات بڑھتی ہیں اور نہ کسی فن میں مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

تجربات کی روشنی میں دونوں ہی فریق کے دلائل وزنی ہیں لیکن ہماری رائے میں دونوں ہی طرز کے نصاب پر اکتفا کرنے والوں میں نقص کے کچھ پہلو ایسے رہ جاتے ہیں کہ نہ تو قدیم نصاب تعلیم ہی کافی قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ مروجہ تبدیل شدہ نصاب سے ہی دینی ''عالم گری'' کی صنعت کو فروغ ملتا ہے بلکہ ''کچھ اور'' کرنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے، اور یہی ''کچھ اور'' وہ ہے جسکی تلافی یا جس کے حصول کا وسیلہ ہماری آج کی بحث و گفتگو کا عنوان بلکہ ہمارے اس سمینار کا حاصل ہونا چاہئے۔

جس طرح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کو دار العلوم دیوبند کی ''پیداوار'' نہیں کہا جا سکتا بلکہ ''دار العلوم دیوبند'' ان کی پیداوار ہے اور خود انکی اپنی تعلیم تو دہلی کالج کے مولانا مملوک علی صاحبؒ اور دیگر اعیان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے اور پھر قدرت کی طرف سے خصوصی فیض اور عطیہ کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح مولانا سید سلیمان ندویؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ اور مولانا محمد علی مونگیریؒ وغیرہ نہ تو دار

العلوم ندوۃ العلماء کی ’’پیداوار‘‘ ہیں اور نہ ندوۃ العلماء کے نصاب کو پڑھ کر ان کو علم وفضل کا وہ مقام ملا جس پر وہ فائز تھے، علامہ شبلیؒ کے استاذ مولانا فاروق چریا کوٹی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوریؒ وغیرہ تھے، اور سید صاحب کی تعلیم مدرسہ امدادیہ دربھنگہ اور دیگر روایتی مدرسوں میں ہوئی تھی، اور مولانا محمد علی مونگیریؒ تو خود ندوہ کے بانی ہیں ’’ندوہ‘‘ ان کا بانی نہیں ہے۔

اس لئے یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ دینی وادبی علوم وفنون کی مہارت نہ تو محض اِس مدرسہ کی دین ہے اور نہ اُس مدرسہ کی۔ ’’درس نظامی‘‘ کی ترتیب سے پہلے بھی ائمہ دین پیدا ہوتے رہے ہیں اور دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کے بغیر بھی محدث، مفسر، فقیہ اور ادیب ومصنف سبھی کچھ پیدا ہوتے رہے ہیں۔

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

دراصل شخصیت سازی یا علماء گری میں نصاب تعلیم ہی بنیادی عامل نہیں ہے بلکہ بہت سے دیگر عوامل میں سے ایک عامل یہ بھی ہے، اسلئے موجودہ علمی انحطاط کو نصاب تعلیم سے جوڑنا صحیح نہیں ہے، آج بھی محض درس نظامی پڑھنے والوں میں اچھی صلاحیت کے لوگ پیدا ہو رہے ہیں اور درس نظامی کو چھوڑ کر دوسرے نصاب تعلیم کو اپنانے والوں میں بھی باصلاحیت لوگوں کی کمی نہیں ہے، البتہ اگر تناسب دیکھا جائے تو دونوں ہی سلسلوں میں زبردست انحطاط پایا جاتا ہے جسکی بڑی وجہ آئیڈیل شخصیتوں کی کمی اور ائمہ علم وفن کا فقدان ہے۔ نمایاں شخصیتیں نہ نصاب سے بنتی ہیں اور نہ تدریس وتعلیم کے نظام سے، شخصیتوں کی تعمیر میں سب سے زیادہ مؤثر عنصر آئیڈیل شخصیتوں کا وجود ہے چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے گرد سارے عقلائے روزگار جمع ہو گئے تھے اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگردوں میں ہر ایک شخص دائرۂ علم کی حیثیت رکھتا تھا۔ علامہ محمد یوسف بنوریؒ، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ،

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ، مولانا سعید احمدؒ اکبرآبادی، مولانا مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ سبھی حضرات شاہ صاحبؒ کی مثالی شخصیت اور نادرۂ روزگار وجود کو دیکھ کر عظیم شخصیتیں بنی تھیں۔

اسی طرح علامہ شبلی نعمانیؒ کے گرد جس طرح علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالباری ندویؒ، مولانا عبدالسلام ندویؒ، مسعود عالم ندویؒ وغیرہ جیسے قلمکار جمع ہو گئے تھے وہ شبلی صاحبؒ ہی کا اثر تھا، اس طرح کے نمونے ہمیشہ دیکھنے کو نہیں ملتے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اپنے گاؤں میں بیٹھ کر بڑے بڑے محدثین پیدا کئے جو محض انکی شخصیت کا فیض تھا نہ مدرسہ کا، نہ نصاب تعلیم کا۔

اس کے باوجود نصاب و نظام تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک معاملہ "معاصر دینی تعلیم" اور عصر حاضر کے تقاضوں کا ہے تو بلاشبہ اس وقت ہمارے ادارے جس طرح چل رہے ہیں انمیں نہ تو وقت کے تقاضوں کا پورا ادراک ہے اور نہ واقعی دینی ضرورتوں کی تکمیل کے اسباب، اسلئے ان کارخانوں سے جو خام مال تیار ہو رہا ہے اس سے مارکیٹ کی ضرورت پوری نہیں ہو پا رہی ہے اور "خدمت دین" کا نعرہ لگانے والوں کی کثرت کے باوجود خدمت دین کے بیشتر محاذ خالی نظر آ رہے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے قدیم نظام تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے بڑی دلچسپ بات لکھی ہے کہ موجودہ زمانہ کے علماء مغربی علوم یا یوروپی ثقافت و تہذیب اور زبان و لٹریچر کو پڑھنے پڑھانے سے متوحش ہیں، سوال یہ ہے کہ "یونان" کہاں ہے؟ اور کیا یونانی علوم اس زمانہ کے "مغربی علوم" کی حیثیت نہیں رکھتے، پھر یونانی منطق و فلسفہ کی اتنی محبت اور انکی حمایت پر اتنا زور اور موجودہ مغربی علوم کے مفید عنصر سے اتنی نفرت کیوں؟!

نامور مصلح علامہ رشید رضا مصریؒ کی جب علامہ شبلیؒ کی دعوت پر ہندوستان آمد ہوئی تو انہوں نے جیسا کہ خود ہی اپنے مشہور روزگار مجلّہ "المنار" میں لکھا ہے کہ بعض لوگوں کی مخالفتوں کے

باوجود دارالعلوم دیوبند کو دیکھنا بھی ضروری سمجھا اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی موجودگی میں ان کا استقبال ہوا اور حضرت شاہ صاحب کی وہ معرکۃ الآرا تقریر سپاسنامہ کے طور پر سنی جسمیں حضرت شاہ صاحبؒ نے ائمہ مذاہب اربعہ کے طریقہ استدلال پر محققانہ نظر ڈالی تھی اور جس سے رشید رضا اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے مصر واپس جانے کے بعد ''المنار'' میں ایک مستقل آرٹیکل لکھا کہ:

وجدت هذه الجامعة فوق كل ثناء وانتقاد ورأيت فيها نهضة علمية جديدة.

(میں نے اس ادارہ کو ہر طرح کی تنقید سے بالاتر پایا اور مجھے اس میں نئی علمی نشأت کے آثار نظر آئے)

غایت تأثر میں یہاں تک لکھ گئے کہ:

لولم أر هذه الجامعة فى الهند والتى تستحق أن تلقب بأزهر الهند لرجعت من الهند حزينا.

(اگر میں ہندوستان میں اس ادارہ کو نہ دیکھتا جو بلاشبہ اَزھر ہند کہلانے کا مستحق ہے تو میں ہندوستان سے غمگین لوٹتا)

اس استقبالیہ اجلاس کے دوران اپنے خطاب میں جو دو سوال اکابر دیوبند سے انہوں نے کئے تھے انمیں ایک تو سیاسی نوعیت کا تھا کہ انگریزوں کے خلاف اس وقت آپ جہاد کر رہے ہیں اور ہندوستان سے انکو نکالنے کیلئے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سات سمندر پار سے آئی ہوئی انگریزوں کی ظالم ٹولی جو اپنی تعداد کے لحاظ سے چھوٹی سی ہے جب چلی جائے گی اور اس کے بعد آپ ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت کی ماتحتی میں ہوں گے اسوقت آپ کا کیا حال ہوگا اس کے لئے آپ نے کیا سوچا ہے؟

دوسرا سوال یہ تھا کہ آج تک آپ قدیم یونانی منطق وفلسفہ کو اپنے نصاب کا جز بنائے

ہوئے ہیں جبکہ خود اہل مغرب نے بھی انکو چھوڑ دیا ہے اور ان فلسفیانہ نظریات کی تردید کردی ہے پھر آپ جدید علوم کو چھوڑ کر انکو اپنے گلے سے کیوں لگائے ہوئے ہیں؟

پہلے سوال کے جواب میں کہا گیا تھا کہ مقصد صرف ہندوستان نہیں پورے عالم اسلام کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانا ہے، اور دوسرے سوال کا جواب یہ دیا گیا کہ ہمیں چونکہ مختلف فرقوں کے ساتھ مناظرے کرنے پڑتے ہیں اسلئے یونانی فلسفہ و منطق کی تعلیم کی ضرورت ہے اس پر علامہ رشید رضاؒ نے کہا کہ امید ہے کہ آپ کی یہ ضرورت جلد ختم ہو جائے گی۔

علامہ انور شاہ صاحبؒ کے معتبر شاگردوں کا بیان ہے کہ آپ نے فلسفہ جدیدہ کی بعض کتابیں اپنے طور پر بعض شاگردوں کو پڑھانے کا سلسلہ خود ہی شروع فرما دیا تھا۔

مسئلہ اس وقت صرف منطق وفلسفہ کی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے یا انکو اپنے نصاب کے جز کے طور پر باقی رکھنے یا نہ رکھنے کا نہیں ہے، مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے دینی مدارس خواہ ''درس نظامی'' کے سلسلہ کے ہوں یا تبدیل شدہ نصاب کو رائج کرنے والے کیا ان سے ہماری دینی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں اور ''دعوت دین'' یا ''دفاع عن الدین'' کی عوامی ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کرنے نیز ''تفقہ فی الدین'' رکھنے والے اس ''طائفہ'' کو تیار کرنے میں ہمارے یہ دینی قلعے کامیاب ہیں جو عصر حاضر میں پیدا ہونے والے نئے اور پیچیدہ مسائل کا فقہی حل پیش کرسکیں؟

ہماری نظر میں - دعوت دین علی وجہ البصیرۃ

- دفاع عن الدین عن کفاءۃ واقتدار

- اور ''تفقہ فی الدین'' رکھنے والے گروہ کی تیاری میں ہمارے دینی مدارس کی کامیابی مبصرین کی نظر میں مشکوک ہوتی جارہی ہے، اور رب کائنات کی طرف سے ''ذہانت وقوت حفظ'' کی عطا میں کمی نہ ہونے کے باوجود ''ائمہ دین'' یا فقہ وحدیث وتفسیر کے ماہرین کا پیدا ہونا ختم نہیں تو بڑی حد تک کم ضرور ہو گیا ہے۔

اگر برصغیر کے ساتھ خلیجی ریاستوں اور عالم اسلام میں پائی جانے والی تعلیم گاہوں کو بھی جامع ازھر سمیت شامل کرلیا جائے اور وہاں سے دینی تعلیم حاصل کر کے نکلنے والوں کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ عمومی انحطاط سے سبھی ادارے دوچار ہیں، اور اب مصر میں بھی شیخ ابوزہرہ، عبد الوہاب خلاف، مصطفیٰ شلبی، اور ابراھیم مدکور جیسے فقہی بصیرت رکھنے والے لوگ پیدا نہیں ہورہے ہیں جو یقیناً ایک بڑا المیہ ہے۔

جامع ازھر کے ساتھ تو ٹریجڈی یہ رہی ہے کہ گزشتہ تقریباً نصف صدی سے ترقی کے نام پر اسکی روح نکالی جاتی رہی ہے۔

خلیجی ریاستوں میں جو اسلامی یونیورسیٹیاں قائم ہوئیں یا عام یونیورسیٹیوں میں جو اسلامی شریعت' فقہ و اُصول یا حدیث وتفسیر کے شعبے قائم ہوئے انمیں بہت سی خوبیوں کے باوجود بعض چیزیں شروع سے ایسی شامل رہیں جو علمی گہرائی کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں، کچھ کا تعلق نصابی کتابوں سے ہے اور کچھ کا مخصوص طرح کے تعلیمی نظام کی پابندی سے پھر بھی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن سے برصغیر کے روایتی دینی تعلیمی نظام کی سدھار میں مدد لی جاسکتی ہے۔

مثال کے طور پر ''اُصول حدیث'' یا ''علم مصطلح الحدیث'' کی تعلیم کیلئے صرف حافظ ابن حجرؒ کی ''نخبۃ الفکر'' یا اس کی شرح ''نزھۃ النظر'' پر اکتفا کرنے سے فنی بصیرت حاصل نہیں ہوسکتی۔

اگر ''طرز کہن'' پر ہی اڑنا ہے تب بھی مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی مرتب کردہ اور عبد الفتاح ابوغدہؒ کی تحقیق کے ساتھ شائع شدہ ''عربی خط قواعد فی علم الحدیث'' یا اس طرح کی کوئی اور کتاب پڑھانا بیحد ضروری ہے۔ فنی اصطلاحات سے اجمالی طور پر روشناس کرنے کیلئے شیخ محمود الطحان کی ''تیسیر مصطلح الحدیث'' بھی اچھی ہے۔

اسی طرح اُصول تفسیر میں محض شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فارسی کتاب کا عربی ترجمہ پڑھا دینے سے علم تفسیر کی مبادیات کا بھی پورے طور پر علم نہیں ہو پاتا، اور نہ پڑھنے والوں کے ذہن

ودماغ میں تفسیر وتاویل کا فرق، وحی کی شکلیں، قرآن کے اعجاز کی وجوہ، نزول قرآن کی ترتیب، معتمد اور غیر معتمد اور مأثور وغیر مأثور تفسیر کے بارے میں بنیادی معلومات آپاتی ہیں، اسلئے ضرورت ہے کہ عرب یونیورسٹیوں کی طرح شیخ مناع القطان کی "مباحث فی علوم القرآن" یا صبحی الصالح کی "مباحث فی علوم القرآن" یا عبدالعظیم الزرقانی کی "مناهل العرفان" کی تلخیص وغیرہ نصاب کا جز ہوں تاکہ علم تفسیر میں اختصاص رکھنے والے کی دلچسپی محض جلالین کی شروح اور بیضاوی کے حواشی تک محدود نہ رہے۔

درس نظامی اور خاص طور پر دارالعلوم دیوبند کا امتیاز "دورہ حدیث" رہا ہے لیکن یہ امتیاز بھی مظاہر العلوم میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ اور دیوبند میں شیخ الحدیث استاذ گرامی حضرت مولانا فخرالدین احمد صاحب کے وجود کی حد تک تھا، اس کے بعد سے جو حال ہے وہ محتاج بیان نہیں، اور موجودہ عہد کے بعض شیخ الحدیثوں کی حدیث فہمی کے نمونے دیکھ کر تو عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ ع

ناطقہ سر بہ گریباں ہے، اسے کیا کہئے؟

مولانا محمد یونس صاحبؒ البتہ انفرادی مقام کے حامل ہیں، انکی فنی مہارت قابل تعریف ہے۔

برصغیر (ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش) میں "دورۂ حدیث" کا بابرکت نظام آج بھی اپنے اندر بہت سی خوبیاں لئے ہوئے ہے لیکن جو کمی پہلے محسوس کی جارہی تھی وہ اب بھی ہے کہ شروع کے تقریباً ۶ ر ماہ مقدمات اور استقبال واستدبار قبلہ، آمین بالجہر، قراءۃ فاتحہ خلف الامام جیسے اختلافی مسائل میں حنفی نقطۂ نظر کی ترجیح میں صَرف ہوجاتے ہیں، اور پھر حقیقی دورہ شروع ہوتا ہے جسمیں عبارت کی خواندگی ہوتی ہے اور استاذ کا کام صرف سننا رہ جاتا ہے، اس کی وجہ سے بہت سے ابواب اس طرح گزرتے ہیں کہ جیسے پڑھے ہی نہیں گئے۔

اس کا علاج دار العلوم کراچی میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے یہ کیا تھا کہ صحاح کی تمام کتابوں کے ابواب اس طرح متعین کر دیئے جائیں کہ پورے ذخیرہ پر کم از کم ایک بار تحقیقی نظر سبھوں کی پڑ جائے، مثال کے طور پر صحیح مسلم میں اگر کتاب الایمان اور کتاب البیوع کے ابواب طے کیئے ہیں تو پھر دوسری کتابوں میں ان ابواب پر تفصیلی بحث نہ کی جائے۔ اسی طرح اگر سنن ابی داؤد یا ترمذی میں عبادات سے متعلق ابواب تحقیق سے پڑھائے جاتے ہیں تو دوسری کتابوں میں ان ابواب پر زور نہ دیا جائے۔ شرح معانی الآثار اور موطا امام محمد "مقارنہ بین المذاہب" کی بہترین کتابیں ہیں انکو مزید اہتمام سے پڑھانے کی ضرورت ہے خواہ دورۂ حدیث سے پہلے ہی کیوں نہ ہو۔

عرب جامعات کا حال اس سلسلہ میں اور بھی ابتر ہے۔ منتخبات کے طور پر صحیح بخاری وغیرہ کی چند حدیثیں پڑھائی جاتی ہیں، صحاح ستہ اور معانی الآثار اور امام مالکؒ اور محمدؒ کی موطا پڑھانے کا نہ رواج ہے اور نہ امکان، انفرادی طور پر کسی شیخ سے کچھ ابواب یا پوری کتاب سنکر کوئی اجازت لے لے یہ اور بات ہے جس کا ذوق آجکل بڑھتا جا رہا ہے۔

لیکن ان جامعات میں "مصطلح حدیث" اور "تخریج حدیث" وغیرہ کے فن کو زیادہ اہتمام سے پڑھایا جاتا ہے جس میں سے کچھ کا رواج ہمارے مدارس میں ہونا چاہیئے، اسی طرح باطل افکار و عقائد کی تردید کیلیئے جو چیزیں پڑھائی جاتی ہیں اُن میں نہ تو موجودہ زمانہ کی گمراہیوں کا ذکر ہوتا ہے اور نہ قدیم فرقوں کا ہی، انکے صحیح مآخذ سے تعارف اور یہ دونوں ہی باتیں اصلاح طلب ہیں، موجودہ زمانہ میں "سیاست شرعیہ" کو بھی مستقل مضمون کی حیثیت سے نصاب تعلیم کا جز ہونا چاہیئے لیکن اس کی طرف بھی توجہ نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ "نصاب تعلیم" کا مسئلہ بعض وجوہ سے اور خاص طور پر اس لئے کہ

اِدھر یہ ضد ہے کہ لیمنڈ بھی چھو نہیں سکتے
اُدھر یہ رٹ ہے کہ ساقی صراحی مے لا

اہل منطق کی اصطلاح میں ''جذر اصم'' بن گیا ہے یعنی اس کا کوئی عمومی حل صحیح ارادہ نہ ہونے کی وجہ سے ممکن نہیں ہے۔

اس وقت جتنے نصاب رائج ہیں سبھی میں کمی بیشی یا کاٹ چھانٹ کی ضرورت ہے۔ نہ ''درس نظامی'' ہی قرآنی منصوصات میں سے ہے اور نہ ''تبدیل شدہ'' نصاب کے نتائج ہی فقہ وحدیث وتفسیر کے ماہرین پیدا کرنے میں سو فیصد کامیاب کہے جاسکتے ہیں، دونوں کے بیچ کی راہ نکالی جاسکتی ہے اور عرب یونیورسیٹیوں میں قائم کلیۃ الشریعہ کے طرز تعلیم سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے جہاں کتاب نہیں ''مواد'' کی تعلیم ہوتی ہے۔

''مواد'' کی تعلیم کیلئے اس طرح کے اساتذہ پہلے تیار کرنے ہوں گے، متن اور اس کے حواشی پر اکتفا کے بجائے پورے موضوع پر دستیاب مصادر سے فائدہ اٹھانے اور انکی بنیاد پر ''محاضرات'' کا ذوق پیدا کرنا پڑے گا۔

اس نظام کی خرابی یہ ہے کہ اس میں ''فقہ'' کے پورے ذخیرے سے آشنائی نہیں ہو پاتی، اور ھدایہ، مسلم الثبوت اور اس طرح کی کتابوں سے استفادہ کی یونیورسٹی کے طلبہ میں صلاحیت بھی نہیں پیدا ہو پاتی جتنے ''مواد'' تین چار سالوں میں پڑھ لئے ان پر تو خوب ذہن حاوی ہو جاتا ہے لیکن ''غیر مظان'' سے مسائل تلاش کرنے کیلئے پھر پرانے طرز کے علماء کی ہی ضرورت پیش آتی ہے۔

میری نظر میں موجودہ تناظر میں اور جدید تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے دینی تعلیم کے نظام ونصاب کی بہتر شکل اسی وقت سامنے آسکتی ہے جب دار العلوم دیوبند، ندوۃ العلماء، فقہ اکیڈمی، امارت شرعیہ یا کسی اور مرکزی ادارے کی نگرانی میں ایک باقاعدہ ''کلیۃ الشریعۃ'' کا قیام عمل میں آئے جس میں درس نظامی، ندوۃ العلماء، اور عرب ملکوں کے شریعت کالج کے نظام ونصاب کا ''صالح عنصر'' رکھ کر افراد سازی کی کوشش کی جائے۔

مولانا محمد رضوان القاسمی مرحوم کی زندگی میں خیال تھا کہ دارالعلوم سبیل السلام اس طرح کے تجربہ کیلئے موزوں جگہ ثابت ہوگی لیکن انکی وفات کے بعد

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

دارالعلوم امارت شرعیہ کا خواب بھی حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحبؒ نے روایتی انداز کا مدرسہ قائم کرنے کیلئے نہیں دیکھا تھا، حضرت قاضی صاحبؒ کے انتقال کے بعد یہ خواب بھی ادھورا ہی رہ گیا، اسی طرح اب تو مولانا شاہد روح اللہ رحمانی کے بقول: ع

اب کھلونوں سے کھیلو جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا

شریعت کی تعلیم کا عالمی طور پر مقبول ڈگریوں سے مربوط ہونا بھی ضروری ہے ورنہ جس طرح ۱۸/اور ۲۰/سال کی تعلیم کے باوجود ہم جیسے افراد جنکے لئے عربی اور انگلش دونوں زبانوں میں ''بے زبانی ہے زباں میری'' ٹائٹل بن گیا ہے، اسی طرح طویل عرصہ تک دینی تعلیم حاصل کرنے اور ہر طرح کا کمال حاصل کر لینے کے باوجود پڑھ لکھ کر ''ناخواندگی'' کا عالمی الزام لگتا رہے گا۔

آج جبکہ سارا عالم ایک گاؤں کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور باطل قوتیں شرک والحاد اور بے حیائی واخلاقی انارکی کو پھیلانے کیلئے جدید ٹکنالوجی کا بھرپور استعمال کر رہی ہیں ان پر روک لگانے کیلئے ٹیلیویژن سے لیکر انٹرنیٹ اور ''میڈیا'' کے دیگر سبھی وسائل پر دسترس رکھے بغیر دین کی خدمت کا خواب پورا نہیں ہو سکے گا، اور نسل کی نسل کفر والحاد کے دلدل میں پھنستی چلی جائیگی، اور ہم اپنے آپ کو لوگوں کی ہدایت واصلاح کی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں کر پائیں گے۔

''دینی مدارس وجامعات میں فقہ واُصول کی تعلیم اور جدید تقاضے'' کے عنوان سے جو مقالہ میں نے دیوبند کے سمینار کیلئے لکھا تھا اس مضمون کو اسی کا تکملہ سمجھنا چاہئے، اس لئے مزید کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ واللہ ولی التوفیق۔۔۔

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر

پروفیسر محسن عثمانی ندوی ☆

وہ نبوت کے چشمۂ حیواں سے پانی لیتا ہے اور زندگی کے کشت زاروں میں ڈالتا ہے۔
یہ عبارت اس مقالہ کا اقتباس ہے جسے دارالعلوم دیوبند میں اساتذہ اور طلبہ کے سامنے پڑھا گیا تھا اور مقالہ کا عنوان تھا'' طالبان علوم نبوت کا مقام اوران کی ذمہ داریاں''۔ مقالہ نگار جو وقت کے ایک بڑے عالم ہونے کے ساتھ ذہن ثاقب بھی رکھتے تھے اور دل روشن بھی، کوئی اور نہیں مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ انہوں نے مقالہ میں کار مدرسہ کو بہت خوبی سے بیان کر دیا۔ یعنی مدرسہ کے فضلا کا کام اور مقام یہ ہے کہ وہ زندگی کے تمام میدانوں میں دنیا کی رہنمائی کر سکیں؛ لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے مدارس دینیہ میں طلبہ اساتذہ اور فارغین کو نبوت کے چشمہ حیواں سے کتنی واقفیت ہوتی ہے اور کتنی صلاحیت ہوتی ہے اور جتنی واقفیت ہوتی ہے کیا اس کے عشر عشیر کے برابر بھی واقفیت زندگی کے کشت زاروں کے بارے میں ہو جاتی ہے؟ اگر واقفیت ہو جاتی ہے تو کام صرف عملی جامہ پہنانے کا باقی رہتا ہے اور اگر واقفیت نہیں ہوتی ہے اور بالکل ہی نہیں ہوتی ہے تو کشت زاروں سے پوری واقفیت کے بغیر اس میں چشمہ حیواں سے پانی کیسے ڈالا جا سکتا ہے اور اس عظیم الشان مشن سے کیسے عہدہ برآ ہوا جا سکتا ہے۔

حضرت مولانا کی تحریر بہت پر سوز اور بصیرت افروز تھی، مولانا نے طاقت ور لہجہ میں مدرسہ کے ذمہ داروں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: ''مدرسہ کا تعطل اور قیادت سے کنارہ کشی، کسی

☆ صدر شعبہ عربی، EFL یونیورسٹی، حیدرآباد

منزل پر قیام خودکشی کا مرادف ہے اور انسانیت کے ساتھ بے وفائی کے ہم معنی ہے اور کوئی خود شناس اور فرض آشنا مدرسہ اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا ہے''۔

زندگی کا وہ کشت زار کیا ہے جس کا مولانا نے اپنے خطاب بلیغ میں تذکرہ کیا ہے؟ دنیا کے تمام علمی تحقیقی ادارے اس کشت زار کی حقیقت اور ماہیت پر کام کرنے کے سوا اور کیا ہیں۔ نیچرل سائنس ہو یا سوشل سائنس، آرٹس ہو یا لسانیات، ٹکنالوجی اور اس کی انواع واقسام، ہر شعبہ علم کا تعلق اسی کشت زار سے ہے جس کے صرف ایک معمولی جز پر ہزاروں انسان نظریہ سازی کرنے پر اپنی عمر اور توانائی صرف کر ڈالتے ہیں، ان ہی صحیح اور غلط نظریوں پر نظام ہائے زندگی کی بنیادیں استوار کی جاتی ہیں۔ ان ہی نظریات کی حمایت یا مخالفت میں انقلاب آتے ہیں اور حکومتیں بنتی اور بگڑتی ہیں، سماج کی تعمیر یا تخریب ہوتی ہے۔ نظریات کی حیثیت ایک سیلاب کی ہوتی ہے۔ کوئی نظریہ صحیح یا غلط جب دل میں جڑ پکڑ لیتا ہے اور دماغ میں سرایت کر جاتا ہے تو پھر وہ ایک سیل سبک سیر وز میں گیر کے مانند ہو جاتا ہے، اس کی طغیانی کھیتوں کو اور اس کی فصلوں کو بہالے جاتی ہے اور کوئی چیز آسانی کے ساتھ اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتی ہے۔ سماجی علوم اور سائنس کے نظریات کا علم اور ان کے زشت وخوب کے تمیز کا علم ہی کشت زار کا علم ہے، جب اس کشت زار کے بارے میں کوئی علم نہ ہوگا اور خوب وناخوب کی تمیز نہ ہوگی تو انسان کوئی کلیدی رول زندگی میں ادا نہیں کر سکے گا۔ وہ زندگی کے تمام میدانوں میں سرگرم عمل اور سرگرم کار نہیں ہو سکے گا اور پھر تعطل اور قیادت سے کنارہ کشی کا شکار ہو جائے گا۔ اسی لئے ہمارے مدرسے کے فضلاء تعطل اور دنیا کی قیادت سے کنارہ کشی کا شکار ہو چکے ہیں۔ انہیں خبر ہی نہیں کہ کن نظریات پر دنیا کا اجتماعی اور سماجی نظام چل رہا ہے۔ تہذیب کی بنیاد کیا ہے اور دنیا میں تہذیبوں کا اختلاف کیوں ہے۔ مختلف نظامہائے حیات کے درمیان سرد جنگ کیوں جاری رہتی ہے۔ سیاسی اور تمدنی انقلابات کیوں آتے ہیں، فکری قیادتیں کیا کیا ہیں اور ان کے درمیان ٹکراؤ کیوں رہتا ہے۔ ان

فکری قیادتوں کا مقابلہ کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ان تمام باتوں سے لاعلمی اور بے خبری کی وجہ سے ہمارے طلبہ فراغت کے بعد علمی اور فکری رہبری سے قاصر رہتے ہیں اور ملکی اور عالمی سطح پر کوئی مثبت رول ادا نہیں کر سکتے ہیں، اور پھر انقلاب روزگار کی گردشوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جنہیں اپنے زمانہ کی امامت کرنا چاہئے تھا وہ کہنہ دماغ بن کر زمانہ کے پیرو بن جاتے ہیں۔ان کا ذہن اتنا چھوٹا ہو جاتا ہے کہ فقہ کے اجتہادی مسائل بہت مضبوطی سے پکڑے رہتے ہیں اور ان سے سرمو انحراف پر واویلا مچانے لگتے ہیں۔مسلکی اختلاف ان کا پسندیدہ میدان جنگ ہوتا ہے۔ حضرت مولانا علی میاںؒ نے قرآن وسنت کے علوم کے لئے چشمہ حیواں کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ اس چشمہ حیوان تک سب کی تو نہیں البتہ کچھ طلبائے مدارس کی رسائی ضرور ہو جاتی ہے لیکن زندگی کے کشت زار تک کسی ایک طالب علم کی رسائی نہیں ہوتی ہے۔اور رسائی کے لئے جن زبانوں کی تحصیل اور ان میں مہارت کی ضرورت ہے ان میں طلبہ ناخواندگی کا شکار رہتے ہیں۔اور سماج کا ایک عضو معطل بن کر جینا ان کا مقدور ہو جاتا ہے۔

ایک زمانہ میں یونانی علوم کا دور دورہ تھا اور شہرہ تھا ان ہی علوم کے ذریعہ دنیا کو سمجھا جاسکتا تھا۔ان علوم کی حیثیت اس زمانہ کے کشت زار کی تھی امام غزالیؒ نے یونانی علوم میں مہارت تامہ حاصل کی تھی، خود دور آخر میں درس نظامی کے نام سے جو تعلیمی نظام قائم کیا گیا تھا وہ بھی دین ودنیا کی غلط تفریق سے خالی تھا۔دین ودنیا اور قدیم وجدید کی تفریق وہ بدعت ہے جو مسلمانوں کے نظام ثقافت مدرسی میں بہت بعد میں سرایت کر گئی ہے اور اس نظام کے پروردہ علماء اور فضلاء نہ زندگی کے کشت زار کو سمجھنے کے لائق ہوتے ہیں اور نہ کشت زار کو چشمہ حیواں سے سیراب کرنے کے قابل۔وہ ایک خول میں بند رہتے ہیں۔مدارس کے ذمہ داروں کا ذہن اتنا محدود ہو جاتا ہے کہ نظام مدرسی اور ثقافت کی تشکیل جدید کی باتیں انہیں برافروختہ کر دیتی ہیں۔وہ فقہی موشگافیوں کو ہی اصل علم سمجھتے رہتے ہیں۔وہ اپنے کام پر (جو یقیناً نیک اور اچھا کام ہوتا ہے) مطمئن اور قانع رہتے

ہیں۔ ستاروں سے آگے کسی جہاں کا نہ تو علم انہیں ہوتا ہے اور نہ وہاں تک پہنچنے کا ان کے دل میں کوئی جذبہ موجزن ہوتا ہے۔ ان کی نگاہ محدود ان کا ثقافتی دائرہ محدود تر ہوتا ہے۔

مولانا علی میاں ندویؒ میری دانست میں وہ پہلے عالم دین ہیں جنھوں نے علم کی دینی اور دنیوی تفریق کی مخالفت کی ہے اور علم کو ایک اکائی قرار دیا ہے (ملاحظہ ہو مولانا کی تقریر، کتاب دعوت فکر وعمل) یہ حرف راز جو مولانا کی زبان سے نکلا مدرسہ کے حلقہ میں حرف مسموع نہ ہوسکا۔ مدرسہ کے اصاغر سے لے کر اکابر تک سب دینی اور دنیوی جدید اور قدیم کی تقسیم کے قائل رہے۔ چشمہ حیوان سے پانی لینے اور زندگی کے کشت زاروں میں ڈالنے کا مولانا علی میاںؒ کا پیغام دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم اور اس طرز کے مدارس کے عالی مقام ذمہ داروں نے ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے اڑا دیا، ان حضرات نے مولانا کے احترام میں کوئی کمی نہیں کی۔ تبلیغی جماعت کے بانی اور دیگر ذمہ دار بزرگوں کا تعلق بھی دیوبند کے مدرسہ فکر سے تھا۔ یہ سب لوگ مولانا علی میاںؒ کا بہت احترام کرتے تھے لیکن کسی کے پاس وہ گوش حقیقت نیوش نہ تھا جو مولانا کی باتوں کو عمل کا جامہ پہنانے کے لئے تیار ہوجاتا۔ مولانا نے جن بزرگوں کو اپنا روحانی مربی اور مرشد بنایا وہ سب مولانا کے علمی تصنیفی عظمت کے قائل اور ان کی عالی نسبتی کے معترف تھے اور ان کی سیرت وشرافت اور روحانیت واخلاق سے آگاہ تھے۔ وہ مولانا کے تابندہ افکار سے بھی آشنا تھے۔ لیکن یہ آشنائی قبول حق اور کسی تبدیلی اور انقلاب فکر کا پیش خیمہ نہ بن سکی۔ نظام تعلیم وہی رہا سوچنے کا اسلوب اور انداز جوں کا توں قائم رہا۔ جمود وتعطل میں کوئی کمی نہیں آئی اور انسانیت کی قیادت سے کنارہ کشی اسی طرح باقی رہی، زندگی اور زمانہ کا دھارا اسی طرح بہتا رہا اور علماء اس میں کسی تبدیلی سے قاصر رہے۔ مولانا کی بات اگر سنی جاسکتی تھی تو مدرسوں اور تبلیغی جماعت کے دائروں میں نہیں بلکہ جماعت اسلامی کے حلقوں میں اور جدید دانش گاہوں میں۔ ان حضرات کا ذہنی افق نسبتاً زیادہ وسیع تھا۔ لیکن مولانا مدارس کے حلقوں ہی سے زیادہ قریب تھے کیوں کہ مولانا کے نزدیک بھی

اور دوسرے حضرات کے نزدیک بھی مولانا مودودیؒ اور ان کی جماعت کے لوگوں میں روحانیت کی اور تصوف وسلوک کی کمی رہ گئی تھی۔ دنیا کی امامت اور قیادت کے سلسلہ میں مولانا مودودیؒ کا نقطہ نظر مولانا علی میاںؒ کے نقطہ نظر کے مطابق تھا بلکہ اس میں تھوڑا غلو بھی ہو گیا تھا اور انہوں نے قرآن کی چار بنیادی اصطلاحوں کی تشریح بھی اسی کے زیر اثر کر ڈالی تھی۔ جدید دانشوری کے اس حلقہ کے پاس کشتی موجود تھی لیکن پتوار میں خامی تھی یعنی تقویٰ اور روحانیت میں نقص تھا اس لئے مولانا کے نزدیک ساحل مراد تک پہنچنا اس کشتی کے ذریعہ ممکن نہ تھا مزید یہ کہ اس حلقہ کے پاس تربیت کے لئے علمی معیار کے مدرسے بھی زیادہ نہ تھے جن کی حیثیت مولانا کی نگاہ میں اسلام کے قلعوں کی تھی۔ مولانا علی میاںؒ کے لئے دوسری مشکل یہ تھی کہ جن بزرگوں سے اور مدارس کے جن حلقوں سے وہ قریب تھے وہ حدیث وفقہ کے روایتی انداز کے ماہر تو ضرور تھے لیکن ''کشت زار'' کے بارے میں ان کی واقفیت بہت زیادہ کمزور اور برائے نام تھی اور اس بارے میں ان کی فکری بصیرت کی دیگ کے سارے چاول کچے رہ گئے تھے۔ ان کے پاس وہ کشتی ہی نہ تھی جو ساحل تک پہنچا دیتی۔

اب رہی بات ندوۃ العلماء کی جس کی سربراہی خود مولانا علی میاںؒ کے ہاتھ میں تھی۔ ندوہ نے اپنی تاریخ میں وہ صلاحیتیں طلبہ میں ضرور پیدا کر دی تھیں کہ شائستہ شگفتہ اور سلیس اردو میں علمی اور اسلامی اور تاریخی موضوعات پر تصنیف اور تالیف کا کام کریں۔ ندوہ نے وہ صلاحیت بھی پیدا کر دی تھی کہ وہاں کے بہت سے فارغین عربوں کو خطاب کر سکیں اور ان کا مقام یاد دلا سکیں لیکن مغربی ملکوں کے لئے ایسے باصلاحیت علماء نہیں پیدا ہو سکے جو ان کی زبان میں اسلام کی دعوت دے سکیں اور جس کا خواب علامہ شبلیؒ نے دیکھا تھا۔ ندوۃ العلماء کے نصاب میں مزید اصلاح وانقلاب کی ضرورت تھی جو بوجوہ نہ ہو سکی۔ عربی کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے پڑھانے کی ندوہ کی تحریک دیوبند نے قبول کر لی۔ دیوبند اور اس طرز کے اداروں سے بھی عربی زبان کے لکھنے والے پیدا ہونے لگے۔ لیکن وہ علماء نہ ندوہ سے پیدا ہو سکے اور نہ دیوبند سے جو یورپ اور امریکہ

کے لوگوں کو خطاب کر سکیں اور جن کی آواز مغرب کے ایوانوں سے ٹکرائے اور وہاں کے رہنے والوں کے دلوں میں ارتعاش پیدا کر دے، خود اندرون ملک غیر مسلموں کے تعلیم یافتہ حلقوں میں علماء ابلاغ وترسیل کی زبان سے محرومی کی وجہ سے اجنبی بن کر رہ گئے۔ مدارس سے فارغ ہو کر جو لوگ جدید دانش گاہوں میں گئے وہ عربی اردو اور فارسی کے ہو کر رہ گئے وہ خود زمانہ کے تقاضوں سے بے خبر رہے وہ غیر مسلموں میں کیا کام کرتے۔ خود مسلمانوں کے درمیان بھی ان کی خدمت کا کوئی قابل ذکر ریکارڈ نہیں ہے۔ یہ بے چارے چند پروفیسر حضرات ہمیشہ احساس کمتری کے شکار رہے، ان میں بہت شاذ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے بچوں کو عربی اور اسلامی علوم سکھانے کی فکر کی ہو۔ دین کی خدمت کا کام بحیثیت مجموعی، مسلمانوں کے دائرہ میں صحیح، دینی مدارس کے علماء ہی نے کیا'' کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے''۔

نہ صرف ہندوستان میں بلکہ عالمی سطح پر مسلمانوں کا قیادت میں کوئی رول نہیں ہے۔ ایجادات اور انکشافات کی دنیا میں اور نئے نئے تصورات اور نظریات کے افق پر دور دور تک ان کا کوئی نام نہیں ہے۔ علماء عالم انسانیت کی رہنمائی کرنے سے قاصر ہیں۔ اور اس کی وجہ نظام تعلیم کی شنویت ہے اور یہ شنویت نظام فکر کی غلطی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ جب تک دین کے بارے میں یہ تصور باقی رہے گا کہ وہ صرف عاقبت بخیر ہونے کا ذریعہ ہے۔ اس کا دنیا سے کوئی تعلق نہیں اور اگر دنیا کی قیادت اور قوموں کی امامت دوسروں کے ہاتھ میں رہے تو یہ کسی رنج وفکر کی بات نہیں تو پھر کبھی عزت اور طاقت ہاتھ نہیں آسکتی ہے۔ دین کا سیاست سے کیا رشتہ ہے اس کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے سیرت النبی کے ساتویں حصے کا مطالعہ ضروری ہے جس کا مقدمہ مولانا علی میاں کے قلم سے ہے۔ جب تک آیت عبادت اور آیت خلافت دونوں کو سامنے رکھ کر نظام فکر، نظام تعلیم اور نظام عمل کی اصلاح نہیں ہوگی محرومی اور پسماندگی سے نجات نہیں حاصل ہو سکے گی۔ خلافت ارضی کا تعلق دنیا کے انتظام وانصرام اور اس کے لئے صلاحیتوں کے حصول سے ہے۔ بقائے ذات اور

اثبات ذات ایک مذہبی تصور ہے، کیوں کہ زندگی کا مقصد ہر میدان میں حسن عمل ہے۔ ''لیبلو کم أیکم أحسن عملا''۔ افسوس یہی ہے کہ دین کے روایتی تصور میں حسن عمل کا مطلب خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات رہ گیا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کہ حسن عمل کے معنی اول اطاعت احکام ہیں لیکن تعمیر جہاں اور زندگی کے اختیار کردہ میدان میں پرفکشن یعنی مہارت عمل بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے اور اسی لئے آیت کے فوری بعد پرفکشن یعنی کمال حسن کا تذکرہ آیا ہے، آسمانوں کی وسعت اور اس کی مانگ میں چمکتی ہوئی کہکشاں اور اس کی قباء پر جگمگ کرتے ہوئے ستاروں کی تابانی یہ جمال وکمال سب کچھ انسان کو ہر کام میں حسن عمل کی اور جمالیاتی قدروں کی رعایت کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ حسن عمل کا تعلق دنیا کے نظم ونسق اور دربست اور تسخیر فطرت سے بھی ہے۔ یہ بات سورہ انعام کی آخری آیت سے بھی ثابت ہے جس میں حسن عمل کو خلافت ارض سے مربوط کیا گیا ہے، کہا گیا ہے کہ ''اور اسی نے تم کو نائب کیا زمین میں اور بلند کردیئے اس نے تمہارے درجے ایک پر ایک، تاکہ آزمائے تم کو ان صلاحیتوں میں اور استعداد لیاقت میں جو اس نے تم کو عطا کی ہیں''۔ ایک آیت میں حسن عمل کی تلقین کے ساتھ خلافت ارضی کا تذکرہ بھی ہے۔ اگر خلافت ارضی کا تعلق کچھ بھی مقام انسانیت سے اور مقصد انسانیت سے ہے تو ہمارے نظام تعلیم اور نظام ثقافت کو اس سے ہم آہنگ ہونا چاہئے چونکہ کائنات کے انتظام میں اور تسخیر فطرت میں گوناگوں صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مختلف قسم کی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ ان ہی صلاحیتوں کے ذریعہ انسان کے حسن عمل کا امتحان ہوتا ہے۔ مختلف قسم کی صلاحیتوں کو جلا دینے کے لئے علم ضروری ہے۔

قرآن وسنت میں جہاں جہاں حصول علم کی تلقین ہے وہاں علم سے مراد بس علم ہے دینی اور دنیوی علم کی تفریق کے بغیر۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جو علم سکھایا تھا وہ اشیاء اور ان کے خواص کا علم تھا ''علم آدم الاسماء کلها'' سائنس اس کے سوا کسی اور چیز کا نام نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی نے حضرت داؤدؑ کو زرہ سازی کا علم عطا کیا تھا۔"وعلمناه صنعة لبوس" اس دور کی انفارمیشن ٹکنالوجی، ٹیلی کمیونیکشن اور انجینئرنگ بھی دائرہ علم میں داخل ہیں، یہ کہنا غلط ہے کہ ان علوم کا تعلق دین سے نہیں۔علم کے ذریعہ ہی حسن عمل کا ظہور ہوتا ہے۔دنیا میں حسن عمل کا اثبات ہر میدان میں انتظامی اور تنظیمی صلاحیتوں سے ہوتا ہے اور ان صلاحیتوں کا ظہور اثبات ذات کے ذریعہ ہوتا ہے نہ کہ فرار سے اور خلوت گزینی سے اور ذمہ داریوں سے دست کشی اور گریز سے۔جس کائنات کے بنانے میں لاکھوں برس صرف ہوئے ہوں ابتداء سے انتہا تک جس کی تخلیق کے ہر مرحلہ میں خالق کائنات کا دست تصرف کارفرما رہا ہو کیا وہ اسی لئے ہے کہ اسے کافروں، مشرکوں اور خدا بیزار لوگوں کے تصرف میں دے دیا جائے کہ اس عظیم الشان تخلیق سے جس طرح چاہیں کھیلیں اور جس طرح چاہیں اسے برباد کریں اور حق کا علم بلند کرنے والوں پر جتنا ظلم چاہیں روا رکھیں اور اپنی اسلحہ سازی اور ٹکنالوجی میں برتری کے ذریعہ مسلمانوں کے جس ملک پر چاہیں قبضہ کرلیں۔

مسلمانوں کا کام صرف مسجدوں میں نماز پڑھنا اور رمضان کے مہینہ میں روزے رکھنا رہ جائے۔اور عالمِ دین کا کام منبر پر بیٹھ کر عبادات کی تلقین کرنا ہو اور عبادت کا مفہوم بھی اس کی ناقص نظر میں اپنی تمام وسعتوں کو کھو چکا ہو۔انتظام اور حکومت میں اور سائنس کی ترقیوں میں نہ اس کا کوئی حصہ ہو اور نہ عمل دخل۔جب حج کرنا ہو تو کسی شرم کے بغیر امریکہ کے بنائے ہوئے ہوائی جہازوں پر بیٹھ کر جدہ پہنچ جائیں اور جاپان کی بنی ہوئی گاڑیوں میں بیٹھ کر جدہ سے مکہ آجائیں اور ہمیں ذرا بھی احساس نہ ہو کہ ہم اپنی عبادتوں میں بھی کس قدر دوسروں کے محتاج اور دست نگر ہو چکے ہیں۔وائے ناکامی کہ اب متاع کارواں باقی نہیں اور کارواں کے دلوں میں احساس زیاں تک باقی نہیں۔حالانکہ حدیث "الدنیا خلقت لکم" سے ثابت ہے کہ اللہ کے اطاعت گذار فرماں بردار بندوں کا حق اس دنیا پر نافرمان اور باغی بندوں سے کہیں زیادہ ہے۔اس لئے دنیا کے دروبست کی صلاحیت بھی اللہ کے فرماں بردار بندوں میں زیادہ ہونی چاہئے۔انسان کو

آخرت کے لئے بنایا گیا ہے لیکن دنیا کو مزرع آخرت کہا گیا ہے۔ مزرع پر محنت کے بغیر آخرت کی فصل نہیں کاٹی جاسکتی ہے۔ مزرع سے مراد صرف عبادت گاہ نہیں ہے جہاں عبادت اور تسبیح و تلاوت میں مشغول رہا جائے بلکہ پوری زمین ہے جس کا انسان کو خلیفہ بنایا گیا ہے۔ حسن عمل کے ذریعہ اور خدا کی اطاعت کے ذریعہ خلد کو خدا کے بنائے ہوئے اس خاکدان ارضی پر اتار لیا جاسکتا ہے یعنی اسے امن وسکون کا گہوارہ بنایا جاسکتا ہے۔ اور یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ اسلام امن وسلامتی کا دین ہے۔ لیکن اس خاکدان ارضی پر مسلمانوں کا استحقاق ختم ہو چکا ہے اس لئے کہ انتظامی صلاحیت کی اہلیت انہوں نے کھودی ہے، وہ اپنے ملکوں کا دفاع کرنے کے لائق بھی نہیں رہ گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ دنیا جس کی تخلیق اہل ایمان کے لئے ہوئی تھی اس کائنات پر دنیائے اغیار کے سائنس دانوں اور سیاست دانوں کا قبضہ ہے اور اقتدار ہی نہیں طاقت اور اس کے تمام ذرائع ان کے ہاتھ میں ہیں۔ اقبال کے الفاظ میں ''یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر'' امریکہ اور یورپ پورے طور پر جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح اور جن کے لئے اسلحہ سازی کا حکم آسمان سے نازل ہوا تھا وہ بالکل خالی ہاتھ اور بے دست وپا ہیں۔ اور علماء کا یہ خیال حیرت انگیز ہے کہ جدید علوم کا تعلق دین سے نہیں۔ اقتدار، طاقت اور عزت نفس کی بازآفرینی ثقافت کی تشکیلِ جدید کے بغیر نہیں ہوسکتی ہے اگر افغانستان اور عراق کو کھودینے کے بعد بھی ہمارے مردہ دلوں میں زندگی کی کوئی حرکت نہیں پیدا ہوتی ہے تو ہمیں صور اسرافیل کا انتظار کرنا چاہئے جس کے بعد تمام مردے جی اٹھیں گے اور عدل کی میزان قائم کی جائے گی اور پھر ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ کس کا نقطہ نظر درست تھا اور کس نے جحود وانکار کی ساری سنتیں تازہ کردی تھیں۔ سورہ حدید کی ایک آیت میں کئی اہم چیزوں کی طرف اہل ایمان کو متوجہ کیا گیا ہے اور ان چیزوں کو ہم اپنے نظام تعلیم کی بنیاد بنا سکتے ہیں اور ان کو سامنے رکھ کر فکر مدرسی کی اصلاح کرسکتے ہیں۔ اس آیت میں جو باتیں پیش کی گئی ہیں وہ یہ ہیں۔

(ا)۔ ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو نشانیاں لے کر اور ہم نے اتاری ان کے ساتھ

کتاب۔اس فقرہ میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ہم کتاب وسنت کو اپنے نظام تعلیم اولین بنیاد بنائیں۔(۲)۔اور میزان تا کہ لوگ قائم رہیں عدل پر۔میزان سے مراد عادلانہ قوانین ہیں اور پوری شریعت کاملہ بھی مراد ہے۔قوانین کے لئے قوت نافذہ بھی ضروری ہے اس لئے قوت نافذہ کے حصول کی کوشش مشروع ہے۔(۳)۔اور ہم نے نازل کیا لوہا اس میں بڑی طاقت ہے اور بے شمار فائدے ہیں انسانوں کے لئے۔یہاں لوہا سائنس ٹکنالوجی اور انجینئرنگ کے لئے استعارہ ہے۔ لوہے کے ذریعہ ہی نہ صرف تلوار بلکہ تمام جدید اسلحہ تیار ہوتے ہیں۔اس آیت سے معلوم ہوا کہ کائناتی علوم اور تشریعی علوم دونوں ایک دوسرے کے معاون ہیں۔یعنی کتاب وسنت اور فقہ کی طرح سائنس اور ٹکنالوجی کا علم بھی دین کا علم ہے کیوں کہ جس خدا نے انسانوں کے لئے پیغمبر بھیجے اور کتاب نازل کی اسی نے انسانوں کی فلاح کے لئے لوہا نازل کیا۔پھر قرآن کی دوسری آیت میں سامان جنگ کی تیاری یعنی ٹکنالوجی کے حصول کا حکم ہے۔ جب یہ خدا کا حکم ہے تو اس سے تعلق رکھنے والے علوم حقیر قسم کے دنیوی علوم کیوں کر ہوئے۔ چونکہ مدارس کے طلبہ سائنس کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہوتے اس لئے ثابت ہوا کہ مدارس کا نظام تعلیم اور نصاب تعلیم غیر متوازن ہے اور اس میں توازن پیدا کرنے کی شدید ضرورت ہے اور توازن پیدا کرنے کے لئے فکر مدرسی کی تشکیلِ جدید کی ضرورت ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ مدارس دینیہ میں سائنس اور ٹکنالوجی کے تمام مضامین پڑھائے جائیں۔لیکن نقطۂ نظر متوازن ہو تو نصاب تعلیم میں اور نظام میں تبدیلی بہر حال کرنی ہوگی۔اتنا تو بہر حال ممکن ہے کہ طلبہ کو علوم جدیدہ سے بنیادی طور پر متعارف کروایا جائے۔طلبہ اور اساتذہ کا نقطہ نظر درست کر دیا جائے اور زمانہ کا شعور پیدا کر دیا جائے اور فراغت کے بعد ان کو تبدیل شدہ ماحول میں بھی بغیر کسی احساس کمتری کے مؤثر انداز میں کام کرنے کے لائق بنایا جائے۔اس کے لئے انگریزی زبان پر اچھی دست رس حاصل کرنے کے مواقع بہم پہونچائے جائیں۔انگریزی زبان کو نصاب کا جز بنایا جائے۔انگریزی زبان کے ساتھ کسی مقامی زبان میں

بھی مہارت پیدا کی جائے۔ انگریزی زبان اور ملک کی مقامی زبان میں اسلامی موضوعات پر تقریر کرنے کی مشق کرائی جائے۔ ایسے مقررین پیدا کیے جائیں جو بہترین انگریزی میں اسلامی موضوعات پر یا اسلام کی روشنی میں حالات حاضرہ پر خطاب کرسکیں۔ کچھ طلبہ مقامی زبان میں تقریروں میں مہارت پیدا کریں۔ معلومات کی وسعت کے ساتھ تحریر وتقریر کی مشق بہت ضروری ہے اس کے بغیر دعوت وتبلیغ اور ابلاغ وترسیل کا کام انجام نہیں دیا جاسکتا ہے۔

مدرسہ کے نظام اور اس کی روح کو سمجھنے کے لئے مولانا علی میاںؒ کی تقریر میں ''چشمہ حیواں'' اور کشت زار'' کے الفاظ کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ بلاشبہ جن علوم کو چشمہ حیواں کہا گیا ہے وہ مسلمانوں کا سب سے قیمتی سرمایہ اور متاع گرانمایہ ہیں۔ اسی کے ساتھ کشت زار کا استعارہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ فکر مدرسی کی تشکیل کے لئے دونوں کا پورا پورا لحاظ بہت ضروری ہے۔ زندگی کے کشت زار کو سمجھنے کے لئے اور ان سے روشناس ہونے کے لئے کم از کم یہ ضروری ہے کہ عصری رجحانات اور جدید سائنس کے نظریات پر مدرسوں میں توسیعی خطبات کا انتظام کیا جائے۔ توسیعی خطبات کے لئے بلاامتیاز مذہب وملت ماہرین علوم کا انتخاب کیا جائے۔ نصاب تعلیم سے ہٹ کر مطالعہ کے لئے ایسی کتابوں کی فہرست بنائی جائے جن سے طلبہ کا ذہنی افق وسیع ہو اور اس مطالعہ کو یقینی بنانے کے لئے ان کا امتحان بھی لیا جائے۔

اس مضمون میں کہیں لہجہ اگر سخت ہوگیا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مضمون نگار کو کسی مسلک یا مدرسہ کے خلاف کوئی کید یا ضد یا حسد ہے۔ عالمی سطح پر مسلمانوں کی بربادی کا غم ہے جو قلم کو کبھی تیر ونشتر بنا دیتا ہے

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاقی

☆☆☆

معاصر دینی تعلیم اور عصر حاضر کے تقاضے

مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی ☆

اسلام نے تعلیم و تعلم، درس و تدریس اور علم و معرفت کے سلسلے میں جو احکامات دیے اور اس کی وجہ سے پڑھنے پڑھانے کا جو چلن اور رواج ہوا، اس نے دنیا کو جہالت کی تاریکیوں سے نکالا، قرآن کریم کے نزول کے ساتھ دور جہالت کا خاتمہ ہوا، مسلمان جہاں کہیں گئے علم کا چراغ روشن کیا، اور وہاں کی ضرورت کے اعتبار سے ایجادات و انکشافات میں ایسا حصہ لیا کہ بہت سارے علوم کے وہ بانی مبانی ہو گئے، یہ وہ دور تھا جب علم شاخ در شاخ نہیں ہوا تھا اور ایک فرد کے لیے ممکن تھا کہ وہ جامع معقول و منقول کی حیثیت سے سامنے آئے اور لوگ علوم و فنون میں اس کی گہرائی اور گیرائی سے بھر پور فائدہ اٹھا سکیں، اس زمانہ میں آج کی طرح علم دین و دنیا کی تقسیم نہیں تھی، اور ساری توجہ علم نافع کے حصول پر صرف کی جاتی تھی اور غیر نفع بخش علوم سے اللہ کی پناہ چاہی جاتی تھی، نفع بخش علوم کی حیثیت صدقہ جاری کی تھی اور مخرب اخلاق علوم کی طرف کوئی جانا پسند نہیں کرتا تھا۔

پھر زمانہ کی قدریں بدلنے لگیں، علوم میں تنوع پیدا ہوا، اور اس کا دائرہ بڑھتا چلا گیا، ایسے میں کسی ایک شخص کے لئے ممکن نہیں تھا کہ وہ تمام علوم پر یکساں دسترس رکھے، اسی طرح اداروں کے لیے بھی سارے علوم اور ان کی شاخوں کو پڑھنا پڑھانا دشوار تر ہو گیا، اس صورت حال کی وجہ سے عملی طور پر مختلف علوم و فنون کے لیے الگ الگ ادارے وجود میں آنے لگے، تا کہ

☆ نائب ناظم امار[illegible] شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ

ہر ادارہ اپنے موضوع پر پوری توجہ صرف کر سکے اور اس کے حاملین میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہو سکے، اس سوچ نے تخصصات کے اداروں کو وجود بخشا اور ہندوستان میں مدرسہ اور اسکول کا مفہوم الگ الگ ہو گیا، علماء اور دانشور کی اصطلاح وجود میں آئی اور دونوں الگ الگ علوم کے نمائندہ سمجھے جانے لگے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب دینی تعلیم کے لئے کثرت سے ادارے وجود میں آئے اور ان میں خالص مذہبی علوم کی تدریس ہونے لگی، یہاں کے فارغین نے دینی بنیادوں پر سماج میں کام شروع کیا، خدا بیزار ماحول میں خداشناسی کی ترغیب دی، انہوں نے ''اجرت'' کے بجائے ''اجر'' کی نیت سے کام کیا اور سماج و معاشرہ میں صالح قدروں کے فروغ کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی، مسلمانوں نے اس کی اہمیت کو کم اور غیروں نے زیادہ سمجھا وہ ان اداروں کو بدنام کرنے کی منظم جدوجہد میں لگ گئے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے، ایک بڑا طبقہ دوسرے راستے سے مدارس کو بدنام کرنے پر تل گیا اور انہوں نے معاصر دینی تعلیم کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کا نعرہ لگایا اور اس زور وشور سے لگایا کہ یہ عنوان بھی اہل علم ودانش کے لئے مرکز توجہ بن گیا، اس مضمون میں ہم اس حقیقت کا مختصراً جائزہ لیں گے کہ آج کے دور میں جو دینی تعلیم دی جارہی ہے، اسے عصر حاضر کے تقاضوں سے کس حد تک ہم آہنگ کر سکتے ہیں اور اس میں کتنی گنجائش ہے۔

معاصر دینی تعلیم کو ہم تین مراحل میں تقسیم کر سکتے ہیں، ایک بنیادی دینی تعلیم، دوسرے ثانوی اور تیسرے اعلیٰ دینی تعلیم، تینوں مراحل میں عصر حاضر کے تقاضے الگ الگ ہیں۔ سب سے پہلے ہم بنیادی دینی تعلیم کو لیتے ہیں، اس مرحلہ میں بچوں کو بنیادی دینی تعلیم عموماً مکاتب اسلامیہ کے ذریعہ فراہم کرائی جاتی ہے، یہ مکاتب مسجد کے ماتحت بھی چلتے ہیں اور کسی ادارے اور تنظیم کے جزوی یا کلی تعاون سے بھی، ان کے اوقات کہیں صباحی اور کہیں مسائی ہوتے ہیں، ان کے علاوہ

بنیادی دینی تعلیم کے درجات بھی تقریباً سبھی مدارس میں قائم ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ یہی مکاتب دور دراز کے دیہاتوں میں دینی شعور کی بقا اور قرآن و نماز سمجھنے سمجھانے میں کلیدی رول ادا کر رہے ہیں، ہمارا دانشور طبقہ ان کے طریقۂ تدریس، مواد تدریس اور آلات تدریس کے حوالے سے سوالات اٹھاتا رہا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ان تعلیمی اداروں میں اسٹیکچر کی کمی ہے، پرانا طریقۂ تدریس رائج ہے، اور بچوں کو آج بھی جسمانی تعذیب کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، ان میں پڑھانے والے اساتذہ کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ بیشتر جگہوں پر قرآن کریم صحت کے ساتھ پڑھنے پڑھانے کا رواج کم ہے، نورانی قاعدہ پر ہو رہی محنت اور مختلف اداروں کی طرف سے تدریب المعلمین کے کیمپ کے ذریعہ اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، ان اداروں کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے معیار تدریس کو بڑھایا جائے، طریقۂ تعلیم کو پرکشش بنایا جائے، لیکن ہمہ گیر تعلیمی مہم کے پروگراموں کی طرح گا بجا کر نہیں، بلکہ درس و تدریس کی سنجیدگی کو بحال رکھتے ہوئے، ایسے اقدام کیے جائیں، جس سے طلبہ کھیل سے زیادہ تعلیم پر توجہ دینے لگیں، اس کے لئے وسائل فراہم کئے جائیں اور اساتذہ ایسے رکھے جائیں جن کی اخلاقیات سے طلبہ کسب فیض کر سکیں، طلبہ کے عادات و اطوار کو صحیح رخ اور صحیح سمت دینے کے لیے یہ بہت اہم زمانہ ہے، اس عمر میں تعلیم کے ساتھ تربیت کی خاص ضرورت ہے، قرآن کریم میں بار بار تلاوت کتاب کے ساتھ تزکیہ کا ذکر کر کے یہی پیغام دینے کی کوشش کی گئی ہے، اس لئے اس مرحلہ میں بچہ کو قرآن کریم صحت کے ساتھ پڑھایا جائے، کلمہ، نماز اور دین کی بنیادی تعلیم پر پوری توجہ مرکوز کی جائے اور اس کی تربیت پر خصوصی توجہ دی جائے، کذب بیانی، چغل خوری، لعن طعن، گالی گلوج، ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے کا مزاج اسی عمر میں بنتا ہے، تھوڑی سی توجہ سے طلبہ کے اندر اخلاق کریمانہ کا مزاج پیدا کیا جاسکتا ہے، اس مرحلہ میں ضرورت کے مطابق ٹیچنگ ایڈ وغیرہ کا بھی استعمال کرنا چاہئے۔

لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ اساتذہ کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا جائے، صلاحیت کے ساتھ صالحیت پر بھی نظر رکھی جائے اور انہیں بقدر کفاف و ضرورت وظیفہ یا تنخواہ دیا جائے، تاکہ وہ ذہنی سکون کے ساتھ اپنی اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکیں، عموماً دیکھا یہ جارہا ہے کہ دیہاتوں میں امام و مؤذن اس شخص کو بنادیا جاتا ہے، جو کسب معاش کے دوسرے ذریعوں پر قادر نہیں ہوتا، مؤذن نہ تو اذان صحیح سے دے پاتا ہے اور نہ امام، نماز سے متعلق مسائل سے کلی طور پر واقف ہوتا ہے، انہیں حضرات کے ذمہ تعلیم و تعلم کا کام بھی سپرد کر دیا جاتا ہے، اس لئے بچوں میں قرآن کریم صحت کے ساتھ پڑھنے کا مزاج نہیں بنتا اور ان کے اخلاق و عادات بھی اساتذہ کی بے عملی سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

بعض کانونٹ اور پرائیوٹ تعلیمی اداروں میں دینیات کے نام پر ایک گھنٹی ہوتی ہے، اس ایک گھنٹی میں خلوص کے ساتھ کام کیا جائے تو بہت کچھ ممکن ہے، لیکن عموماً یہ گھنٹیاں نام کی ہوتی ہیں، ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ گارجین جو بنیادی دینی تعلیم کے سلسلے میں زیادہ حساس ہیں، اس حوالہ سے ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جاسکے اور ان کے بچے بھی ادارہ کو مل سکیں، اس تاجرانہ ذہنیت کے باوجود اگر اساتذہ اس گھنٹی میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر سکیں تو ان اداروں میں بھی قرآن کریم اور کلمہ نیز ضروری ادعیۂ ماثورہ یاد کرائے جاسکتے ہیں اور تربیت کے لئے بھی فضا سازگار بنائی جاسکتی ہے۔

دوسرا مرحلہ ثانویہ کا ہے، اسکول کانونٹ وغیرہ میں اس مرحلہ میں دینیات کا تصور نہیں ہے، اس مرحلہ میں معاصر دینی تعلیم کا سارا انظام مدارس اسلامیہ میں سمٹ جاتا ہے، نظامیہ مدارس میں یہ مرحلہ عربی اول سے شروع ہوتا ہے اور عربی پنجم، ششم تک چلتا ہے، اس مرحلہ میں ہمارے یہاں عربی قواعد کی تدریس، پر خاصی توجہ صرف کی جاتی ہے نحو وصرف کی بنیادی کتابیں اور شروحات تک زیر تدریس آتی ہیں، فقہ وغیرہ کی بھی کچھ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، اس مرحلہ میں

طریقہ تدریس پر خاص توجہ کی ضرورت ہے، ہو یہ رہا ہے کہ طلبہ میں کتاب فہمی سے زیادہ رٹنے رٹانے پر توجہ دی جاتی ہے، کہنا چاہئے کہ تدریس کا انداز، فن کی تدریس کا نہیں، کتاب کی تدریس کا ہوتا ہے، یہی حال دینیات سے متعلق دوسری کتابوں کا ہوتا ہے، کتابوں میں جو مثالیں دیدی گئیں اور جو جزئیات ذکر کردی گئیں، وہی طلبہ کو یاد ہوتی ہیں، اس طرز پر دوسری مثالوں اور دوسری جزئیات کے تلاش کی صلاحیت طلبہ میں پیدا نہیں ہوتی یا بہت کم پیدا ہوتی ہے، اس مرحلہ میں ضرورت ہے کہ فن کی تدریس کا مزاج بنایا جائے اور طلبہ میں ایسی صلاحیتیں پیدا کردی جائیں کہ ان میں دقت نظر بھی ہو اور وسعت نظر بھی۔

اس مرحلہ میں عصری تقاضے کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ انہیں عصری علوم کی تعلیم دی جائے، عصری علوم کے بعض مبادیات کا پڑھانا مفید معلوم ہوتا ہے، لیکن ہمیں یہاں یہ تفریق ضرور ملحوظ رکھنی چاہئے کہ ہمارا مقصد عصری علوم کی تدریس نہیں، علوم دینیہ کی تدریس ہے، یہ مدارس اسی کام کے لئے ہیں، ان کا تعلیمی مزاج، منہج اور مقصد متعین ہے، عصری علوم کو اس مرحلہ میں وسائل کے طور پر تو داخل کیا جاسکتا ہے، مقاصد کے طور پر نہیں، مثلاً پہلے ہم کانڈے کے قلم سے لکھتے تھے، پھر روشنائی والا قلم آیا، پھر مارکیٹ میں لیڈپین استعمال ہونے لگا اور اب ان کے ساتھ کمپیوٹر بھی لکھنے کا ایک ذریعہ بن گیا ہے، یقیناً ہمیں اس کو سیکھنا چاہئے، بچوں کو سکھانا چاہئے، فقہ کے جن ابواب ومباحث کو سمجھنے کے لئے آج کی جدید اصطلاحوں کے سمجھنے کی ضرورت ہے اور جن کے بغیر عصر حاضر کے مسائل کی تفہیم، تشریح وتطبیق ممکن نہیں ہے، ان کو ضرور پڑھا دینا چاہئے؛ لیکن بقدر ضرورت ہی، اس سے آگے نہیں، اس سے آگے بڑھنے پر بات مقصد تک پہونچ جائے گی۔

مدارس کی کثرت اور بہتات کے چرچے کے باوجود راجندر سنگھ سچر کمیٹی کی رپورٹ یہ بتلاتی ہے کہ مسلم سماج کے پڑھنے والے بچوں میں صرف چار فی صدی مدارس کا رخ کرتے ہیں، ان چار فی صد بچوں کو دینی علوم میں تخصص اور اسپیشلائزیشن کے لئے مختص کرنا چاہئے؛ تاکہ سماج

کی دینی اور مذہبی ضرورتیں ان فارغین کے ذریعہ پوری ہوسکیں، ان طلبہ کو بھی دوسرے علوم پڑھانے میں لگا دیئے گئے تو یہ طلبہ نہ دینیات کے رہیں گے اور نہ عصری علوم کے، جس کا تجربہ مدرسہ عالیہ، بہار اسٹیٹ مدرسہ اکزامینیشن بورڈ اور عربک پرشین بورڈ الہ آباد کے فارغین کے ذریعہ ہمارے سامنے آیا ہے اور آتا رہتا ہے، ہمارے تجربات نے عصری علوم کے ساتھ مدارس کی تعلیم کے غیر مفید اور غیر مؤثر ہونے پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے، یقیناً تجربات بار بار کیے جاسکتے ہیں، لیکن جب ہم میڈیکل کالج سے انجینئر اور انجینئرنگ کالج سے ڈاکٹر پیدا کرنے کی کسی تجویز کو پاگل پن اور ذہنی دیوالیہ پن سے تعبیر کرتے ہیں تو مدارس سے ہی یہ کیوں چاہا جارہا ہے کہ وہ عصری تقاضوں کے نام پر اپنے تعلیمی اداروں کے مزاج اور مواد کا گلہ گھونٹ دیں، اور مدارس سے نکلنے والے لوگ دوسرے علوم میں بھی کامل ہوکر نکلیں۔

اس موقع پر تاریخ کے حوالے سے مسلم سائنس دانوں اور دوسرے علوم کے لوگوں کا ذکر کیا جاتا ہے، عصری اور دینی تعلیم کی تفریق سے ملت کے دونیم ہونے کی بات کہی جاتی ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کے نظام تعلیم وتربیت کا جائزہ لے کر یہ بات کہی جاتی ہے کہ علم کی دوئی کو مٹانا چاہئے، یہ سب بجا ہے؛ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہم جس زمانے کی بات کرتے ہیں، اس زمانہ میں علم کی اتنی شاخیں نہیں پھوٹی تھیں، اب تو ایک موضوع سے پچاسوں ایسی شاخیں نکل آتی ہیں، جن میں اسپیشلائزیشن (Specialisation) کیا جاتا ہے، اور کسی ایک شخص کے لئے ایک ہی موضوع کی مختلف شاخوں میں مہارت پیدا کرنا، ناممکن سا ہورہا ہے۔

مدارس کے نظام تعلیم وتربیت کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے زوردار دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ اس طرح ان کا معاشی نظام مضبوط ہوگا اور سماج میں ان کا مقام ومرتبہ فزوں تر ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں محض بہلاوے کی ہیں، جن لوگوں نے مذہبی علوم میں دستگاہ پیدا کی ان کی معاش بھی مضبوط ہے اور بغیر عصری علوم کے پڑھے ہوئے ان کا مقام ومرتبہ

جو سماج میں ہے اسے کھلی آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے، جو لوگ کمزور رہتے ہیں، ان کی معاش کہیں سے پڑھنے کے باوجود کمزور ہی رہتی ہے، بلکہ اگر سروے کرایا جائے تو عصری علوم کے حاملین میں بے روزگاروں کا تناسب مدارس کے فارغین سے کئی گنا زیادہ نظر آئے گا۔

اس لئے اس مرحلہ میں معاصر دینی تعلیم میں زیادہ سے زیادہ عصر حاضر کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا ہو، تو زبان کی حد تک ہندی انگریزی اور کمپیوٹر کی تدریس کو داخل کر لینا چاہئے، جو پہلے ہی سے بہت سارے اداروں میں داخل ہیں، دار العلوم دیو بند، ندوۃ العلماء اور دیگر اداروں میں اس کا کامیاب تجربہ کیا جاچکا ہے، اس سے زیادہ کسی چیز کا داخل کرنا عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح کے لئے تو ٹھیک ہے، اس سے زیادہ کرنے سے معاصر دینی تعلیم کا رخ اور قبلہ ہی بدل جائے گا، ظاہر ہے جس کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔

تیسرا مرحلہ اعلیٰ تعلیم کا ہے، اس مرحلہ میں کہنا چاہئے کہ دینی علوم کی اعلیٰ ترین کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، ان میں طریقہ تدریس میں تو عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھا جاسکتا ہے، فقہ، تفسیر حدیث اور عقائد کے درس میں آج کے معاملات آج کے حالات، دین پر کھڑے کئے جانے والے نت نئے سوالات اور اعتراضات پر سیر حاصل بحث کی جانی چاہئے تاکہ طلبہ آج کے لب ولہجہ میں ان اعتراضات کا دفاع اور سوالات کے جوابات پر قادر ہو جائیں، اس مرحلہ میں علم کلام کی جو قدیم کلامی بحثیں ہیں اور جن فرق ضالہ منحرفہ کا ذکر بار بار آتا ہے وہ تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں، آج ہمیں جن لوگوں کا سامنا ہے اور جس قسم کے سوالات دین و مذہب پر اٹھائے جارہے ہیں، لادینیت کے فروغ اور خدا بیزار سماج کے لیے جو جدوجہد سرکاری، غیر سرکاری سطح پر کی جارہی ہے، اس سلسلے میں ہمیں طلبہ کی رہنمائی کرنی چاہئے، اور ان کتابوں کا انتخاب کرنا چاہئے جو اس سلسلے میں مدد و معاون ہوں اور طلبہ کو اس کام کے لئے تیار کرسکیں۔

اس مرحلہ کی تعلیم یونیورسٹیوں میں بھی ہوتی ہے اور بعض میں مستقل شعبے دینیات اور

اسلامک اسٹڈیز کے کھلے ہوئے ہیں، ان میں بھی انہیں امور کو ملحوظ رکھنا چاہئے، جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، خلاصہ ان ساری بحثوں کا یہ ہے کہ معاصر دینی تعلیم کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہئے لیکن ایسی ہم آہنگی نہیں جو مدارس اسلامیہ کے کردار اور مزاج کو بدل کر رکھ دے۔

☆☆☆

دینی مدارس کے فارغین میں مطلوبہ صلاحیتوں اور استعداد کی کمی کے اسباب

ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی ☆

اس موضوع پر گفتگو میں سب سے پہلا سوال یہ اٹھتا ہے کہ دینی مدارس کے فارغین سے کس قسم کی صلاحیتیں مطلوب ہوتی ہیں اور ان سے کس نوع اور سطح کی استعداد کی توقع کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ دینی مدارس کے فارغین میں وہ صلاحیتیں نہیں پائی جاتی ہیں جو دینی نصاب کی تکمیل کے بعد اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر ان سے متوقع ہے؟ ہم پہلے دوسرے سوال کو لیتے ہیں، کہ آج کا عنوان اس تسلیم واعتراف کا غماز ہے کہ اب نئے فضلاء مدارس ان صلاحیتوں اور استعداد سے عاری ہو کر نکل رہے ہیں جن سے انھیں آراستہ ہونا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بات علی الاطلاق بہ مشکل ہی تسلیم کی جاسکتی ہے کہ تمام فضلاء مدارس دینیہ میں مطلوبہ صلاحیتوں کا فقدان ہے، کیونکہ صلاحیتوں کا فرق اور استعداد میں تفاوت کسی بھی تعلیمی مظہر کی حقیقت رہی ہے۔ یہ بات ہر دور میں اور ہر نصاب کے اندر دیکھی جاسکتی ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اعلیٰ صلاحیتوں کے حاملین کی تعداد اکثر و بیشتر کم ہوا کرتی ہے۔ اکثریت متوسط صلاحیت والوں کی رہا کرتی ہے۔ اور قدرے قلیل اس سے کمتر استعداد والوں کی رہتی

☆ اسسٹنٹ پروفیسر اسلامیات، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ہے۔ اس عمومی صورت حال سے کوئی زمانہ شاید ہی خالی رہا ہے، اور دور حاضر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

اگر یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ موجودہ دور کے دینی مدارس سے فارغ ہونے والے فضلاء کی صلاحیتوں اور استعداد کا کیا معیار ہے؟ وہ علوم دینیہ پر کتنی دسترس رکھتے ہیں؟ شرعی مضامین کے مآخذ کا مطالعہ کس حد تک ہے؟ قدیم مصادر سے استفادہ کی صلاحیت کتنی پیدا ہوئی ہے؟ عربی دانی اور عربی خوانی میں وہ کس سطح پر ہیں؟ علوم حکمت وفلسفہ سے وہ کہاں تک آشنا ہیں؟ اور عصری مضامین سے ان کی کتنی واقفیت ہے؟ کیونکہ یہ وہ مضامین ہیں جو کم وبیش ہمارے تمام دینی مدارس میں پڑھے پڑھائے جاتے ہیں۔ اور یہاں سے فارغ ہونے والے فضلاء کی صلاحیتوں اور استعداد کا جائزہ انہی مضامین کے تعلق سے لیا جانا مناسب ہے۔

اس حوالے سے اگر ہم دینی مدارس کے فارغین کی استعداد پر ایک گہری نظر ڈالیں تو اس بات سے انکار مشکل ہوگا کہ فارغین کی اکثریت میں مطلوبہ استعداد کی کمی پائی جاتی ہے۔ علوم دینیہ یعنی تفسیر وحدیث اور فقہ اسلامی، جو ان کی تعلیم کا مرکزی محور ہیں، اور آٹھ سے دس سال تک کی وسیع تعلیم کا بڑا حصہ ان ہی مضامین کی تدریس وتفہیم میں خرچ کیا جاتا ہے۔ ان علوم پر دسترس حاصل کر لینے والے فارغین کی تعداد ایک اندازہ کے مطابق شاید دس فیصد سے زائد نہ ہو۔ بڑی اکثریت ان مضامین میں بھی افسوسناک حد تک کمزور صلاحیت کی حامل نکل رہی ہے۔ اور اس افسوسناک صورت حال کا اندازہ اس وقت زیادہ نمایاں ہوجاتا ہے، جب وہ عربی زبان کی نصابی یا غیر نصابی کتابوں کی صحیح عبارت خوانی سے بھی قاصر ہوتے ہیں۔ عبارت فہمی تو اس سے آگے کا مرحلہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مدرسہ کی سند فراغت دراصل علوم دینیہ کے کمرہ میں داخل ہونے کی کنجی ہے۔ یعنی ایک فارغ التحصیل گویا اب اس قابل سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنے طور پر شرعی مآخذ کا مطالعہ کر کے علم وتحقیق کے ناپیدا کنار سمندر سے لعل وگہر نکال سکے۔ لیکن جب فارغین کی اکثریت

اپنے شرعی مضامین کی نصابی سطح پر کمزور ہوتو ان سے یہ کیونکر توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ شرعی علوم کے اولین اور اہم مصادر ومراجع کا مطالعہ کرسکیں گے۔ عصری مضامین سے واقفیت توان کے لئے نا قابل ذکر ہی امر ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر اگر ہم ان فارغین پر نظر ڈالیں جو آج کے دور انحطاط میں بھی قابل رشک صلاحیتوں اور اچھی استعداد سے آراستہ ہو کر نکل رہے ہیں، جن کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہی کہی جاسکتی ہے۔ تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ایک فاضل مدرسہ سے جو صلاحیت مطلوب ہے اس میں وہ کس معیار پر ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس بات کی توقع کی جانی چاہئے کہ وہ شرعی علوم کی نصابی کتابوں پر اچھی نظر رکھتے ہوں گے، متداول شرعی مسائل کا انھیں علم ہوگا، ان کی عربی دانی بھی اس قدر ہوگی کہ وہ شرعی مآخذ ومصادر کا بطور خود مطالعہ کرلیں، اور جس حد تک انھیں عصری مضامین سے واقفیت کا موقع میسر ہوسکا ہوگا، انھوں نے ان میں بھی محنت کی ہوگی۔ ہماری بجا توقع ہے کہ فضلاء مدارس کی کم تعداد ہی سہی، لیکن ممتاز سمجھے جانے والے طلباء اپنی فراغت کے وقت ان مذکورہ صلاحیتوں سے آرستہ ہو جاتے ہوں گے۔

اب ہم ان دونوں قسموں کے فضلاء کی صلاحیتوں اور ان کے پس پشت کارفرما عوامل و اسباب پر ایک تنقیدی اور تجزیاتی نظر' اس تمنائے ناپختہ کے ساتھ ڈالتے ہیں کہ یہ گفتگو کسی ذہن کو کرید اور کسی قدم کو مہمیز کر سکے۔

جہاں تک فارغین کی اکثریت کا معاملہ ہے، جو بہت زیادہ پختہ صلاحیتوں سے آراستہ نہیں ہو پارہے ہیں، ایسے فضلاء کی ایک بڑی کھیپ ہر سال بڑے دینی مدارس سے فارغ ہو رہی ہے، انھوں نے یہاں اپنی عمر عزیز کا بڑا ہی قیمتی عرصہ گذارا ہوتا ہے، ایسا عرصہ جو نہ صرف ان کی سیرت وکردار کی پختگی کے حوالے سے بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے، بلکہ ان کے مستقبل کی رخ بندی اور کار حیات کی تعیین وتشکیل میں بھی مؤثر عامل بنتا ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ فارغین آٹھ دس

سالہ تعلیم کے بعد دین کے مبادی سے واقف ہو چکے ہوتے ہیں، حلال وحرام کے ضروری مسائل سے ان کے گوش آشنا ہو گئے ہوتے ہیں، دینی و مذہبی اصطلاحات اور قرآن وحدیث سے تعلق رکھنے والی ضروری باتوں، نیز سیرت نبویؐ اور عہد صحابہؓ کی تاریخ سے وہ کسی قدر شناسائی حاصل کر چکے ہوتے ہیں۔ یہ معلومات یقیناً بیش قیمت اثاثہ ہیں، یہ مطلوب زندگی اور سرمایہ حیات ہیں، یہ بلاشبہ وہ روشنی ہے جس کے بغیر زندگی تاریک اور منزل روپوش رہتی ہے۔ اس لئے ہم اس سرمایہ کو دل و جان سے عزیز رکھتے ہیں، اور اس سے آراستگی کو اپنی ایسی متاع سمجھتے ہیں جس سے دستبرداری زندگی کی معنوی موت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک سوال ہمارے ذہنوں میں بار بار ابھرتا ہے، وہ یہ کہ کیا اس سرمایہ سے آراستگی کے لئے کم وبیش دس برس کا طویل عرصہ درکار ہے؟ اگر اس طولانی دورانیہ کے بعد فارغ التحصیل طالب علم علوم شرعیہ کے میدان میں داد تحقیق نہیں دے سکتا، عربی دانی اور عبارت فہمی کی ایسی قابلیت اس کے اندر نہیں پیدا ہوتی کہ وہ اسلامی کتب خانہ کے لالہ زار چمن کی سیر کر سکے اور خوش رنگ وخوش ذائقہ علمی پھلوں سے شادکام ہو سکے، اور نہ ہی وہ علم وفضل کے اس مقام بلند پر فائز ہو سکتا ہے جو انسانیت کی راہ حیات کے لئے منارہ نور قرار پا سکے، تو ایسے سینکڑوں فارغین کے لئے یہ طویل عرصہ اپنے جواز کے لئے ہم سے ضرور جواب طلب کرتا رہے گا، اور اپنے مقصد کی شناخت کا ایک بڑا سوال پیدا کرتا رہے گا۔

صورت حال اس وقت مزید محتاج توجہ ہو جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بیس تا پچیس برس کی ابھرتی عمر کے ان فارغین کے لئے اُس وقت نہ تو مزید تعلیم کے لئے کوئی متعین راہ سامنے ہوتی ہے، نہ وہ معاش کے فریضہ کی سمت میں کسی واضح نقشہ سے واقف ہوتے ہیں۔ ان کی اصل شناخت تو دینی تعلیم کے فارغ التحصیل کی ہوتی ہے، اور اس شناخت کے تقاضوں کی ادائیگی ان کی استعداد سے بالا بنی ہوتی ہے۔ پس نہ تو دینی مدارس میں تدریس کے دروازے ان کے استقبال کے لئے کھلے ہوتے ہیں، نہ مذہبی وملی اداروں میں ان کے لئے موزوں خدمت موجود ہوتی ہے،

اور نہ دیگر مذہبی ضروریات کے محدود مواقع اتنی بڑی تعداد کے لئے سال بہ سال کفایت کر پاتے ہیں۔ نتیجہ سامنے ہوتا ہے کہ وہ کسی منصوبہ بندی اور مزاج و مناسبت سے صرف نظر کرتے ہوئے' اور حالات کی تند و تیز موجوں کے حوالہ ہو کر' کارگہہ حیات کی جد و جہد میں افتاں و خیزاں مصروف ہو جاتے ہیں۔

اس صورت حال کی بنیادی وجہ راقم کی نظر میں ہمارا موجودہ تعلیمی نظام ہے، جو پانچ سات برسوں کی غیر منظم ابتدائی تعلیم کے بعد جب اصل دینی تعلیم یا عربی تعلیم کے درجہ اول میں طالب علم کو داخل کرتا ہے تو آٹھ دس برسوں تک مصروف رکھ کر ''عالم'' کے سندی درجہ تک پہنچنے کے بعد ہی تعلیم کی تکمیل کا پہلا موقع فراہم کرتا ہے۔ یعنی اس سے پہلے کوئی طالب علم اپنی تعلیم نا مکمل تو چھوڑ سکتا ہے، لیکن کسی سند کے ساتھ مختصر تعلیمی مرحلہ مکمل کرنا چاہے تو ایسا کوئی نظم اس کے سامنے نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ صرف آٹھ دس برسوں کی عالمیت یا فضیلت ہی پہلا مرحلہ ہوتا ہے، پس ایسے وہ تمام طلبہ جو اپنے سرپرستوں، والدین یا کسی خیر خواہ کی تحریک کے تحت دینی تعلیم کا رخ کرتے ہیں، ان سب کے لئے؛ اس بات سے قطع نظر کہ ان کا تعلیمی رجحان کیا ہے' وہ اس تعلیم میں کس قدر دلچسپی دکھا پا رہے ہیں؛ اور ان کی تعلیمی کارکردگی کیسی رہ رہی ہے؛ تعلیم کی پہلی منزل ہی آٹھ دس برسوں پر محیط عالمیت یا فضیلت مقرر ہو جاتی ہے۔

اب اگر یہ طلبا عمر کی دو دہائی مکمل کرتے ہوئے ''عالم'' کی باوقار دستار فضیلت سر پر رکھ کر' فارغ التحصیل ہوتے ہیں، لیکن اس کے تعلیمی تقاضوں کی تکمیل کے لئے وہ ذہنی طور پر آمادہ اور مطلوبہ قابلیت سے آراستہ نہیں ہیں، تو اس کی وجہ نہ تو وہ خود ہیں، نہ ان کے اساتذہ اور نہ نصاب درس۔ کیونکہ اسی نصاب و استاذ کے زیر عمل اچھی صلاحیتوں والے فضلاء بھی فراغت حاصل کر رہے ہیں۔ بلکہ نظام تعلیم ہے، کیونکہ یہ فارغین دس سالہ نظام کی تکمیل کے بعد جس سرمایہ سے آراستہ ہو کر نکل رہے ہیں وہ سرمایہ محض دو تین سالہ تعلیم میں فراہم ہو سکتا ہے۔ اگر اس نظام تعلیم

نے انھیں ضروری شرعی علوم اور سیرت نبوی و تاریخ اسلامی پر مشتمل تین سالہ تعلیم کے بعد اس طور پر ایک مرحلہ مکمل کرنے کا موقع فراہم کیا ہوتا؛ کہ اس کے بعد وہ اپنے ذوق کے مطابق مزید تعلیم کی کوئی راہ منتخب کرتے یا اپنے معاش کی کسی تیاری سے وابستہ ہو جاتے: تو اس صورت حال سے جڑے کئی مسائل جنم ہی نہ لیتے، نہ تو خود یہ فضلاء اس احساس کے بوجھ میں دبے ہوتے کہ وہ عالم دین ہیں لیکن مطلوبہ علمی قابلیتوں سے عاری ہیں، اور نہ یہ سوال اٹھتا کہ وہ اب کیا کریں؟ کیونکہ اس ابتدائی مرحلہ کے بعد وہ لازماً کسی تعلیم یا تیاری کی جانب متوجہ ہو جاتے۔ بلکہ یہ فارغین مزید دوہرے فائدے سے مستفید ہوتے، ایک طرف وہ اپنی عمر کے ان اہم برسوں کو اپنے ذوق و رجحان کے مطابق مستقبل کی رخ بندی میں صرف کرتے، اور دوسری جانب ابتدائی دینی تعلیم کا یہ مرحلہ ان کی زندگی کو ہمیشہ دین و اخلاق کے نور سے منور رکھتا، اور ایک باعمل مسلمان بن کر وہ زندگی کے مختلف میدانوں میں مصروف عمل ہوتے۔

یہ گفتگو ان فارغین مدارس کی اکثریت کے تعلق سے تھی جو متوسط درجہ کی یا اس سے بھی کمتر صلاحیت لے کر فارغ ہو رہی ہے۔ سب سے افسوسناک صورت حال اسی گروہ کی ہے، جن کی نہ تو مدارس کے علمی و تحقیقی حلقہ میں پذیرائی ہے اور نہ وہ عصری علوم کی راہ کے اچھے رہرو سمجھے جاتے ہیں اور نہ معاشی جدوجہد کی کسی راہ سے وہ آشنا ہوتے ہیں۔

جہاں تک ان فضلاء مدارس کا تعلق ہے جو اچھی صلاحیت کے حامل کہے جاتے ہیں، تو وہ روایتی طرز تعلیم اور معیار تعلیم کے مطابق اپنی قابل قدر محنت اور قابلیت کی شناخت بنا لیتے ہیں، اسی گروہ سے دینی مدارس کو قابل اساتذہ فراہم ہوتے ہیں۔ اور تحقیق و تحریر کے میدانوں میں بھی ان کی جولانیوں سے اچھی توقعات وابستہ رہتی ہیں۔ ان کی صلاحیتوں اور استعداد کا اندازہ اگر ان کے رائج نصاب درس اور موجود تعلیمی ماحول سے لگایا جائے تو ان کی استعداد و قابلیت اطمینان بخش قرار دی جائے گی۔

لیکن ان کی بابت بھی ایک گمبھیر سوال ہنوز برقرار رہتا ہے، اور یہی ہماری گفتگو کے بالکل آغاز میں اٹھائے گئے پہلے سوال کی تفصیل بھی ہے کہ دینی مدارس کے فارغین سے کس قسم کی صلاحیتیں مطلوب ہیں؟ اور کس استعداد کی ان سے توقع کی جانی چاہئے؟ ان فارغین کی بابت سوال یہ ہے کہ کیا زمانے کے تقاضوں اور ان کے متوقع رول کی نسبت سے بھی ان کی قابلیت اطمینان بخش کہی جاسکے گی۔ یہاں اثبات میں جواب مشکل ہے۔ موضوع کے اس پہلو پر گفتگو سے پہلے یہاں کچھ سوالات رکھے جاتے ہیں، جن سے بات زیادہ واضح ہوسکے گی۔ کیا یہ فاضلین عصر حاضر کی مشکلات و مسائل کا اندازہ رکھتے ہیں؟ کیا انھیں اس بات کا علم رہتا ہے کہ اسلامی شریعت اور نظام زندگی پر کیا اعتراضات وارد کئے جارہے ہیں؟ کیا مذہبی تقاریب کے علاوہ مواقع پر وہ اہل علم و دانش سے خطاب کرنے اور ان کے اشکالات دور کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں؟ بلکہ چند سوالات براہ راست ان کے مضمون و نصاب کی بابت پیدا ہوتے ہیں۔ مثلا کیا یہ فاضلین اپنے موضوعات یعنی تفسیر و حدیث اور فقہ اسلامی کے میدانوں کی جدید پیش رفت اور نئے رجحانات سے واقف ہوتے ہیں؟ کیا علوم حکمت و فلسفہ کی ان کی تعلیم عصر حاضر کے متعلقہ مسائل سے انھیں آشنا کرتی ہے؟ اور کیا وہ اپنے بنیادی مضامین کی تعلیم کے ساتھ ان کا تاریخی، تقابلی اور معروضی مطالعہ بھی رکھتے ہیں؟ جواب یہاں بھی نفی کی جانب مائل ہے۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا تعلیم کی کوئی انتہاء ہے؟ اگر نہیں تو ہمارے یہ ذہین طبقہ فضلاء میں سے محدود تعداد ہی کے لئے سہی؛ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے دینی پیغام اور دعوتی کردار کے ساتھ عصری علوم میں سے کسی بھی مضمون میں امتیاز پیدا کرکے اس موضوع پر شریعت اسلامی کی بالادستی ثابت کریں۔ مثلا پولیٹکل سائنس، سوشیالوجی، اکونومی یا قانون کی تعلیم حاصل کرکے دنیا کو ان کی زبان میں بتاسکیں کہ اسلام کا نظام حکمرانی کیسا شفاف اور عادلانہ ہے۔ اسلام کا پیش کردہ سماجی نظام کس طرح فطری خوبیوں سے آراستہ اور انسانی رشتوں کو امن و راحت سے

آراستہ کرتا ہے۔ اسلامی معاشیات کیونکر دنیا میں معاشی عدل پیدا کر کے انسانیت کو ان بے شمار معاشی مسائل سے نجات دلاتا ہے جن کے خطرناک نتائج نے انسانی زندگی کو جہنم زار بنا رکھا ہے۔ اسی طرح اسلامی قانون کس طور پہ حقیقی عدل وانصاف فراہم کرتا ہے۔ یہ بطور مثال چند مضامین ذکر کیئے گئے، ورنہ ماحولیاتی مطالعہ، سماجی عمل اور طب و سائنس وغیرہ کے متعدد مضامین ہیں جہاں ہمارے فضلاء مدارس اگر اپنے دینی پیغام و کردار سے وابستہ رہ کر کچھ کر دکھانے کے جذبہ سے ممتاز مقام حاصل کرتے ہیں تو وہ نہ صرف ایسی خدمت دین کر سکیں گے جن کے دور رس اثرات مرتب ہوں گے، بلکہ دین و دنیا کی مصنوعی دوئی کو ختم کر کے نئی مثال قائم کر سکیں گے۔

واضح رہے کہ یہ سوالات ان ہی فضلاء کی بابت ہیں جو نہ صرف ذہین وذکی اور ممتاز ہیں بلکہ جنھوں نے دینی مدارس کے مروجہ نصاب کو رائج نظام کے تحت اچھی طرح پڑھا ہوتا ہے۔ پھر اگر یہ فاضلین اپنے سامنے ایسے بنیادی سوالات رکھتے ہیں تو اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان فضلاء نے محنت سے جی چرایا ہے، یا مقررہ نصاب کو ٹھیک سے نہیں پڑھا ہے۔ پھر اگر انھیں زمانہ میں ایک مؤثر رول ادا کرنے میں رکاوٹیں درپیش ہیں، تو اس کی وجہ چند سنجیدہ اور غور کے قابل امور ہیں:

اول تو یہ کہ ہمارے یہ ذہین فضلاء اپنی حتی الوسع محنت کر کے بھی اسی نصاب کے دائرہ میں بڑی حد تک محدود رہیں گے جو ان کے لئے مقرر شدہ ہے، یہ بات کیونکر ممکن ہوگی کہ فقہ اسلامی کی تعلیم میں تو ہم اُن مثالوں کی مدد سے تفہیم کا کام لیں جو آج دنیا سے ہی ناپید ہیں، اور یہ توقع کریں کہ ہمارے فضلاء جدید مسائل پر رائے دے سکیں گے۔ جب زندگی کا سفر جاری ہے، اور مسائل نئے پیدا ہوتے جا رہے ہیں تو ہمارے نصاب میں بھی اس کی شمولیت یا نمائندگی ہونی چاہئے۔

دوسرے یہ کہ علم و تحقیق کا سفر رواں دواں ہے۔ ہمارے فضلاء کو بھی اسی رفتار کے ہمدوش بن کر سفر جاری رکھنا ہوگا۔ ورنہ یا تو ہم ان راہوں پر دوبارہ چل رہے ہوں گے جن سے علم و تحقیق

کا کارواں گذر چکا ہے۔ یا ہم ایک انجام پا چکی علمی محنت کا بے ضرورت اعادہ کر رہے ہوں گے۔ جب کہ بہتیرے نئے کام اور نئی محنتیں ہماری پیش روی کی منتظر ہوں گی۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ہمارے نصاب تعلیم کا دائرہ اتنی کشادگی رکھتا ہو کہ وہ اپنے دامن میں جدید پیش رفت اور نئی تحقیقات و خدمات کو سمو لے۔ تاکہ فقہ اسلامی کا فاضل جدید فقہی مباحث اور تحقیقات سے، علم حدیث کا فاضل فن حدیث کے میدان کی بیش قیمت تحقیقات و خدمات سے اور علم تفسیر کا فاضل میدان تفسیر کی پیش رفت اور ضروریات جدیدہ سے کما حقہ واقف ہو۔

تیسرے یہ کہ کسی بھی نصاب کی تدریس میں ایک مؤثر کردار معلمین اور اساتذہ کا ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اساتذہ اپنے موضوع کے میدان میں کس حد تک قدیم و جدید معلومات سے آراستہ ہیں؟ طلبہ کی استعداد کے دائرہ اور وسعت سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام میں اساتذہ اور معلمین کو ان کے متعلقہ موضوعات پر واقف (Update) رکھنے کا کوئی نظم نہیں ہے۔ حالانکہ تدریسی عمل کے لئے یہ انتہائی ضروری اقدام ہے۔ ضرورت ہوگی کہ (Refresher Course) کے طرز پر اساتذہ و معلمین کو جدید ترین معلومات سے آراستہ رکھنے کے لئے نظم بنایا جائے۔

چوتھے یہ کہ ہمارے طلبہ ایسے مواقع سے محروم رہتے ہیں جہاں وہ دیگر تعلیمی اداروں اور نظام کا مطالعہ کرسکیں اور دیگر اداروں کے طلبہ کے ساتھ تبادلہ خیال کرسکیں، ایسے اسٹڈی ٹورس (Study Tours) ان کے لئے منظم کئے جائیں جہاں وہ ملک کے دیگر مدارس کے طلبہ کے ساتھ تبادلہ خیالات اور مباحثوں میں شریک ہوں اور اداروں کا مطالعہ کرسکیں۔ اس سے نہ صرف ان کے ذہنی افق میں وسعت پیدا ہوگی، بلکہ وہ معاصر مسائل کو سمجھنے اور جواب دینے کی سمت عملی قدم اٹھاسکیں گے۔

فارغین مدارس کی استعداد کے حوالے سے ان کے کردار سے متعلق دو اور باتیں قابل توجہ ہیں:

پہلی یہ کہ مدارس کی تعلیم کا اصل پیغام کردار سازی ہے، اپنی بھی اور دوسروں کی بھی۔ تعلیم کا سلسلہ خواہ مدرسہ سے فراغت کے ساتھ ختم ہو جائے، یا مزید تعلیم جاری رکھی جائے، یا عمل کے کسی بھی میدان میں مصروفیت اختیار کی جائے۔ یہ پیغام ان کی زندگی کا لازمی عنصر ہونا چاہئے۔ اس کے بغیر ان کی علمی استعداد کچھ بھی کارگر نہیں ہو سکتی۔ اس حوالے سے صورت حال بہت اطمینان بخش نہیں ہے۔ اس جانب بہت جرأت مندانہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ موجودہ زمانے میں اس پر کھل کر گفتگو کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس رویہ نے نقصان کو بڑھاوا دیا ہے کہ اپنے حلقوں میں اس سے چشم پوشی ہو، جب کہ غیروں کی نگاہیں اعتماد کو مجروح کر رہی ہوں۔ دوسری بات یہ کہ دینی تعلیم کی ایک اہم اور نمایاں شناخت یہ رہی ہے کہ یہاں اساتذہ صرف زبانی معلم نہیں ہوتے، بلکہ وہ پیکر تعلیم ہوتے ہیں۔ وہ نئی نسل کی کردار سازی میں زبان سے زیادہ عمل سے کام لیتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ دینی تعلیم کی یہ منفرد ''شناخت'' متنوع قسم کے مسائل کے گرد وغبار میں دھندلانے لگ گئی ہو۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ معاصر دینی تعلیم کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔

☆☆☆

تیسرا باب

مدارس کا نظام تربیت

دینی مدارس میں تربیت کا نظام - ایک جائزہ

مولانا اشہد رفیق ندوی ☆

مدارس دین کی تعلیم کے لئے قائم ہوئے ہیں اور دینی تعلیم کا منتہائے مقصود افراد اور معاشرہ کی تربیت وتزکیہ ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ پیغمبروں کی بعثت کا یہی اصل مقصد رہا ہے کہ وہ اپنی قوم کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے تھے اور اس کی روشنی میں ان کے نفوس کا تزکیہ کرتے تھے۔ قرآن مجید انبیاء کرام کے حوالہ سے اس فریضہ منصبی کا بڑی اہمیت کے ساتھ ذکر کرتا ہے(۱)، احادیث اور سیرت کی کتابیں بھی اس طرح کے مواد سے لبریز ہیں (۲)، دینی مدارس کے مقاصد، نصب العین اور اعلانات ودعاوی کا جائزہ لیا جائے تو یہ بھی اس انبیائی مشن کے وارث اور اس کی خدمت میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ دینی تعلیم جس طرح شخصیت پر تطبیق کا تقاضا کرتی ہے، انبیاء، ائمہ، محدثین، صلحاء اور اکابرین ماضی میں تعلیم کے ساتھ تربیت وتزکیہ پر جیسی توجہ دیتے رہے ہیں، کیا ایسا کوئی موثر تربیتی نظام ہمارے مدارس میں بھی موجود ہے، جو اکابر کے خطوط پر معاشرہ کے لئے لائق اور مفید افراد تیار کر رہا ہو۔ پیش نظر مقالہ میں اسی بات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ تربیتی نظام کے تجزیہ سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تربیت وتزکیہ کا مفہوم واضح کر دیا جائے تاکہ اسی کو معیار بنا کر مروجہ نظام کو پرکھا جاسکے۔

☆ (استاذ سینئر سکنڈری اسکول علی گڈھ مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ)

تزکیہ کا مفہوم

عربی زبان میں تزکیہ کا مطلب کسی چیز کو صاف ستھرا بنانا، اس کو نشو ونما دینا اور اس کو پروان چڑھانا ہے۔اس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں، اول کسی چیز کو آلائشوں اور کمزوریوں سے پاک کیا جائے، دوم: اس کی صلاحیتوں کو ممکنہ حد تک پروان چڑھایا جائے، تزکیہ کا عمل مختلف چیزوں پر مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ زمین کا تزکیہ یہ ہوگا کہ اسے جھاڑ جھنکار سے صاف کیا جائے، اسے کھاد پانی دے کر اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق کسی صالح بیج کو نشو ونما دے سکے اور اس سے پھل پھول حاصل ہوسکیں۔ اگر یہ کوشش انسانی نفوس کے لئے ہو تو انہیں باطل نظریات سے پاک کرنا، قابل اعتراض رویوں سے بچانا، باپ دادا کی اندھی تقلید سے روکنا، توہمات اور سماجی برائیوں سے پاک کرنا شامل ہے(۳)۔

تزکیہ نفس قرآن مجید کی ایک جامع اصلاح ہے جو اپنے اندر ہمہ اقسام کے اسلامی تعلیمی مقاصد کو سموئے ہوئے ہے۔ اس کے ذریعہ فرد اور معاشرہ دونوں کا تزکیہ ہوتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کے ہر گوشے پر محیط ہے، یعنی یہ جسم، روح اور عقل تینوں کو پاک کرنے اور نشو ونما دینے کا کام انجام دیتا ہے۔ اس کے علاوہ تزکیہ نفس اپنے نتیجہ کے لحاظ سے اعلیٰ کردار پر منتج ہوتا ہے۔ ہر انسان کو سلیقہ زندگی سکھاتا ہے(۴)۔

تزکیہ کا عمل شخصیت کے ارتقاء کے ساتھ معاشرہ کی تعمیر وترقی میں بھی بھرپور کردار ادا کرتا ہے، معاشرتی اقدار کا تحفظ اور صالح خطوط پر ارتقاء افراد کے کردار پر منحصر ہوتا ہے۔ تزکیہ نفس کا نظام افراد کے اندر تقویٰ، خلوص، دیانت داری، بھائی چارہ، رحم دلی، عفو ودرگذر اور عزم وبہادری جیسے انفرادی اوصاف اسی لئے پیدا کرنا چاہتا ہے کہ فرد معاشرہ کی بہترین اکائی بنے اور اس کی تعمیر وترقی میں بھرپور کردار ادا کرے۔ اس کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ خالصۃً معاشرہ کی تطہیر کے لئے ہر مسلمان پر عائد کیا گیا ہے، تاکہ معاشرہ میں معروفات

فروغ پائیں، منکرات کا ازالہ ہو اور سماج بحیثیت مجموعی بہترین اخلاقی اصولوں کے ساتھ دنیاوی ترقی اور اخروی کامیابی اور نجات کی جانب گامزن ہو۔

تزکیہ اپنے مفاہیم میں وسعت کے ساتھ اپنا ایک موثر و مبسوط نظام رکھتا ہے، اس کے لئے تزکیہ کے علاوہ تربیت، تصوف اور احسان و سلوک جیسی دوسری اصطلاحات بھی رائج ہیں اور تاریخ کے ہر دور میں وقت اور افراد کے مزاج کے ساتھ اس کے طریقے بدلتے رہے ہیں اور اس میں مدوجزر بھی دیکھا گیا ہے۔

اوپر تربیت وتزکیہ کا جو مختصر اور سادہ مفہوم بیان ہوا ہے، وہ دراصل اس کا کم سے کم حصہ ہے جو اس نظامِ تربیت میں پایا جانا چاہئے جو اس مقصد کے لئے وضع کیا جائے، اس کم سے کم حصہ کے بغیر اس مقصد کا حصول ممکن نہیں ہے۔

مدارس کے تعارفی لٹریچر میں تربیتی نظام

اسی تعارف کی روشنی میں مدارس میں مروج نظام تربیت کی تلاش وجستجو کی کوشش کی گئی ہے اور سب سے پہلے بڑے مدارس کی مطبوعہ تاریخ اور تعارفی لٹریچر میں اس نظام کی اہمیت، مقاصد، اہداف اور طریقہ کار کے سلسلے میں مطبوعہ مواد تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔

تاریخ دارالعلوم دیوبند میں تعلیمی وتربیتی نقطۂ نظر سے اس کا مسلک ان الفاظ میں درج ہے۔ پھر یہی باتیں دوسرے تعارفی لٹریچر میں بھی جگہ جگہ پائی جاتی ہیں۔

’’دارالعلوم دیوبند کا مسلک اہل سنت والجماعت، حنفی مذہب اور اس کے مقدس بانیوں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے مشرب کے موافق ہوگا۔ دارالعلوم کے مسلک کی حفاظت تمام ارکان و متعلقین دارالعلوم کا فرض ہوگا۔ کسی ملازم، طالب علم کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ کسی ایسی انجمن یا ادارے یا جلسے میں شرکت کرے جس کی شرکت دارالعلوم کے مسلک یا مفاد کے لئے ضرر رساں ہو (۵)، یہ مسلک اعتدال سات اصولی

بنیادوں پر قائم ہے۔ علم شریعت، پیروی طریقت، اتباع سنت، فقہی حنفیت، کلامی ماتریدیت، دفاع ضلالت اور ذوق قاسمیت ورشیدیت اس مسلک اعتدال کے عناصر ترکیبی ہیں"(٦)۔

مذکورہ سطور سے دار العلوم دیوبند کا تربیتی موقف اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ مگر ان اصول کو حاصل کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس کا کوئی تفصیلی خاکہ تحریری شکل میں موجود نہیں۔

تاریخ ندوۃ العلماء اور اس کے دیگر تعارفی لٹریچر میں تربیتی نظام کا تفصیلی تذکرہ نہیں ملتا۔ البتہ ندوہ نے مسلک ومشرب کی حصار بندی کے بجائے "قدیم صالح اور جدید نافع" کے حصول کو شعار بنایا ہے، اکابرین ندوہ میں کئی بڑے اہل اللہ گزرے ہیں۔ اس کے فارغین نے تزکیہ، تصوف اور احسان وسلوک پر وافر مقدار میں مواد فراہم کیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا مناسب ہوگا کہ وہاں کا تربیتی نظام اسی نقطۂ نظر کا مظہر ہوگا۔

مظاہر العلوم سہارنپور کی تاریخ (٧) بھی تربیتی نظام کے تذکرے سے خالی ہے۔ اس کا تعارفی لٹریچر بہت کم حاصل ہو سکا۔ مگر جو کچھ دستیاب ہے وہ بھی تربیتی نظام کے تذکرے سے خالی ہے۔ البتہ اکابرین مظاہر العلوم نے بہت بڑی عالمی تبلیغی تحریک برپا کی ہے جو اپنا بھرپور تربیتی نظام رکھتی ہے بلکہ اس کا زیادہ زور تربیت پر ہی ہے، بجا طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ یہ نظام اپنے منبع ومرکز پر پوری طرح سایہ فگن ہوگا۔

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ایک صدی قدیم مدرسہ ہے، مگر اس کی تاریخ ابھی مرتب نہیں ہو سکی ہے، اس کے دیگر تعارفی لٹریچر میں بھی تربیتی نظام کا کوئی مربوط خاکہ یا مفصل گائڈ لائن موجود نہیں ہے، البتہ اس کے دستور العمل میں تربیتی نقطۂ نظر ان الفاظ میں واضح کر دیا گیا ہے۔ "یہ مدرسہ اہل سنت والجماعت کے مختلف مذاہب کا سنگم ہوگا، یہاں حنفی اور اہل حدیث دونوں ملیں، ندوی، دیوبندی، اصلاحی سب تعلیم دیں۔ جزئیات کے اختلاف کے باوجود سلف

کے طریقے پر آپس میں شیر وشکر ہو کر رہیں اور مسلمانوں کے آپسی اختلافات کو مٹادیں"(۸)۔

یہ مدرسہ استاذ امام حمید الدین فراہیؒ کے افکار کا ترجمان ہے، جو قرآن وسنت کے شیدا تھے۔ مسلک ومشرب کے حصار سے آزاد، سادہ اور ٹھیٹھ مسلمان کہلانا پسند کرتے تھے۔ قرآن وسنت سے مستنبط ہر اصول کو حرز جان بنائے رکھتے تھے۔ مدرسہ کا تعلیمی وتربیتی نظام ان کے علمی وعملی زندگی کا ترجمان ہے۔

جامعۃ الفلاح بلریا گنج اپنی عمر کے نصف صدی مکمل کرنے کو ہے۔ مبسوط مطبوعہ تربیتی نظام سے اس کا دفتر بھی خالی ہے۔ یہ مدرسہ الاصلاح اور تحریک اسلامی کے افکار کا حامل ہے۔ تحریک اسلامی نے اس موضوع پر بہت معیاری اور وقیع لٹریچر تیار کیا ہے، یہاں کے مروج تربیتی نظام میں اس لٹریچر کا انعکاس پایا جاتا ہے۔

موجود ومقبول تحریری سرمایہ

مدارس کے تعارفی لٹریچر میں تربیتی نظام کا کوئی مبسوط خاکہ یا گائڈ لائن دستیاب نہیں ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنا بڑا نظام صرف سینہ بہ سینہ معلومات پر چل رہا ہے۔ البتہ نظم وتربیت کے حوالہ سے جو مواد اکثر مدارس کے تعارفی لٹریچر میں درج ہے وہ خطابت وصحافت کی مشق، تحقیق ومطالعہ کی ترغیب، کھیل کود اور ورزش کے مواقع، اساتذہ ومصلحین کے وعظ وپند، نیز خارجی جماعتوں وتحریکوں میں شمولیت اور عملی تربیت وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ احکام شریعت کی پابندی، اخلاقی حدود کی پاس داری، وضع قطع کا لحاظ اور منکرات سے اجتناب کے لئے کچھ اصول وضوابط بھی مقرر ہیں جن کی خلاف ورزی موجب سزا ہوتی ہے۔ یہ مختلف ذرائع تربیت بھی لٹریچر میں تعارف وترغیب کے لئے مذکور ہیں۔ ورنہ ان میں کسی کا کوئی بھی تفصیلی خاکہ درج نہیں ہے(۹)۔

مربی رنگراں راتالیق

مدارس میں تربیت کا بڑا ذریعہ مربی رنگراں راتالیق کی ذات گرامی ہوتی ہے، اس کی صلاحیت، وژن، دینی واخلاقی کیفیت، ذوق ومزاج اور محنت ولگن پر تربیتی نظام کا انحصار ہوتا ہے۔ چوں کہ اس کے سامنے کوئی واضح نظام یا نقشہ کار نہیں ہوتا، اس لئے اسے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی ہوئی روایات کا اپنے ذوق ومزاج اور وجدان سے تربیت کا پورا نظام چلانا ہوتا ہے اس لئے وہ جیسے چاہتا ہے اس نظام کو چلاتا ہے۔ اور اس میں ان طلبہ کو سیکھنے کے زیادہ مواقع ملتے ہیں جو مربی محترم سے قریب رہتے ہیں اور ان کی ذاتی خدمت میں وقت گذارتے ہیں۔

مدارس کے تربیتی نظام کا یہی ماحصل ہے، اس نظام سے آراستہ ہو کر جو طلبہ اور نوجوان فارغ ہوتے ہیں وہ بعد کی زندگی میں تین طرح کے راستے اختیار کرتے ہیں۔

۱- اپنے خاندانی کاروبار اور مشاغل میں مصروف ہوجاتے ہیں، مثلاً تجارت، یا کھیتی باڑی وغیرہ۔ جہاں مدرسہ کی تعلیم وتربیت کا فیض ان کی ذات اور خاندان تک محدود رہ جاتا ہے۔ دوسروں کو فیض یاب کرنے کا موقع زیادہ نہیں ہوتا۔

۲- اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے یونیورسٹیوں کا رخ کرتے ہیں، یہاں ماحول کی کثافت مدرسہ کی پاکیزہ تعلیم وتربیت پر بہت جلد غالب آجاتی ہے، مدرسہ کی برسہا برس کی تربیت کے اثرات چند ہفتوں یا مہینوں میں کافور ہوجاتے ہیں۔ یونیورسٹیوں کا رخ کرنے والے فارغین مدرسہ کی ایک بڑی اکثریت میں مدرسی تربیت کا شائبہ تک باقی نہیں رہ جاتا۔

۳- مدارس ومکاتب میں تدریس یا مساجد کی خدمت پر مامور ہوتے ہیں۔ قرآن وسنت کے امین اور انبیاء کے وارث ہونے کی وجہ سے یہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں جی جان لگادیتے ہیں، مگر معاشرہ انہیں عزت وتوقیر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ ان کی خدمت کے عوض جو حقیر معاوضہ پیش کیا جاتا ہے اسے بھی عزت نفس مجروح کئے بغیر ادا نہیں کیا جاتا۔ دیوبند کے شیخ

الحدیث حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے ''کھوٹے سکے'' تیار کرنے کا دعوی جس پس منظر میں بھی کیا ہو، معاشرہ انہیں واقعی ''کھوٹا سکہ'' ہی تصور کرتا ہے۔

صورت حال کی یہ حقیقی تصویر ہے، اس پورے نظام کا مقصد اور نتیجہ کے اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو کامیابی کا اوسط بہت مختصر نظر آتا ہے، خاص طور سے اگر تربیت وتزکیہ کا بنیادی مقصد معاشرہ کے لئے لائق افراد تیار کرنا پیش نظر رکھا جائے اور فارغین مدارس کا معاشرہ کی تعمیر وترقی میں کردار تلاش کیا جائے تو بہت مایوس کن صورت حال سامنے آتی ہے، امت کا کوئی طبقہ اس صورت حال سے مطمئن نہیں، اقبال نے مدرسہ وخانقاہ سے نمناک اٹھنے کی بات کہی تو حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے اسے ''کاغذی پھول'' سے تعبیر کیا ہے (۱۰)۔

مبسوط نظام تربیت کی ضرورت

صورت حال حقیقۃً مایوس کن ہے۔ جو فوری توجہ کی مستحق ہے۔ نظام مدارس پر غور وفکر اور تنقید وتصحیح کا سلسلہ ایک صدی سے جاری ہے مگر اس کی پوری توجہ نصاب تعلیم پر ہے۔ نظام تربیت خال خال ہی زیر بحث آتا ہے۔ نظام تربیت کو موضوع گفتگو بنا کر کمزوریوں کا ادراک واعتراف کرنے اور ایک ایسا مبسوط اور مؤثر نظام تربیت مرتب کرنے کی ضرورت ہے جس سے زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرنے والے اسلام کی سچی تصویر ابھر کر سامنے آئے اور اسلام محض عبادتی مذہب بن کر نہ رہ جائے۔

نیا تربیتی نظام کیسے مرتب ہو، اس کے بنیادی خدوخال کیا ہوں، اس کے لئے ذرا مڑ کر ماضی میں جھانکنے کی ضرورت ہے۔ نفس کا تزکیہ اور شخصیت کے ارتقا پر اسلاف نے بہت وقیع لٹریچر تیار کیا ہے۔ معاصر عہد کی مقبول روایت بن گئی ہے کہ منصوبہ چھوٹا ہو یا بڑا پہلے اس کی گائڈ لائن تیار ہوتی ہے، معاصر نظام تعلیم کا جائزہ لیا جائے تو وہاں ہر کام کی مفصل گائڈ لائن تحریری طور پر موجود ملے گی۔ مثلاً تدریس کے لئے اگر ایک کتاب نصاب میں مقرر ہے تو اس کتاب کو

پڑھانے کا مقصد کیا ہے، کیسے پڑھائی جائے، کیسے امتحان لیا جائے، ٹیچر گائڈ میں الگ سے لکھا ہوا ملے گا۔ اسی طرح اگر کھیل کود کے لئے کوئی گھنٹی مخصوص کی گئی تو کھیل کیسے ہوگا۔ اس سے کیا فائدہ حاصل ہوگا، کھیل کا طریقہ وضابطہ کیا ہوگا۔ کامیابی وناکامی کے اصول کیا ہوں گے۔ سب کچھ تحریری طور پر موجود ہوگا (۱۲)۔

مدرسہ کا تعلیمی وتربیتی نظام ابھی قدیم طرز پر چل رہا ہے، اس سطح پر منصوبہ بندی اور لٹریچر کی تیاری کا رواج نہیں ہے، مگر اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کم از کم اہم امور مثلاً نظام تعلیم اور نظام تربیت کا مفصل خاکہ اسلاف کی تحریروں کی روشنی میں ضرور مرتب کیا جانا چاہئے۔ تاکہ معلم یا مربی کے لئے صرف اس سانچے میں ڈھالنے کا کام باقی رہے، سب کچھ مربی کی صواب دید پر چھوڑ دیا جائے تو افراط وتفریط کا امکان ہمیشہ باقی رہے گا۔ متوقع نتائج برآمد ہونے کا امکان کم ہی رہے گا۔

مقاصد

نظام تربیت کی ترتیب کا آغاز مقاصد کی تعیین وتوضیح سے ہوگا۔ نظام تزکیہ کے وہی مقاصد ہوں گے جو کسی مدرسہ کے قیام کے مقاصد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً:

☆ قرآن مجید کی ہمہ جہت تعلیم اور ان تعلیمات کا شخصیت پر انطباق تاکہ طلبہ "کان خلقه القرآن" کے اسوہ نبوی کا نمونہ بن سکیں۔

☆ سنت وسیرت نبوی کی ہمہ جہت، تعلیم اور اسوہ رسول ﷺ کی روشنی میں شخصیت کی تشکیل کی سعی وجہد جو عبادات، اخلاقیات، معاملات اور زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہے۔

☆ قرآن وسنت کے بیان کردہ توحید، رسالت اور آخرت جیسے بنیادی عقائد کی واضح تعلیم اور اس کی روشنی میں ایسی تربیت کہ شرک وبدعات جیسی خرافات راہ نہ پاسکیں۔

☆ اسلام ایک مکمل نظام حیات کا نام ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کرتا ہے۔ اس

کی دینی بصیرت بہم پہنچانا۔

☆ تطہیر افکار، تعمیر معاشرہ اور معاشرہ میں شریعت الٰہی کے نفوذ کے لئے کوشاں رہنا۔

☆ فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ادائیگی کے لئے سپاہی تیار کرنا۔

☆ دنیا میں رائج افکار و نظریات سے باخبر رہنا اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کا مقابلہ کرنا۔

☆ ایسا ماحول برپا کرنا کہ طلبہ گروہی، جماعتی اور مسلکی اختلافات سے بالاتر ہوکر وسعت قلب و نظر کے ساتھ معاشرہ کی اصلاح و تعمیر کا فریضہ انجام دے سکیں۔

☆ صحت و تندرستی کے نقطہ نظر سے صاف ستھرا ماحول اور کھیل و کود کے مواقع بہم پہنچانا۔

عملی خاکہ

مدارس کے تعارفی لٹریچر کا جائزہ لیا جائے تو کم و بیش ایسے ہی مقاصد لکھے ہوئے ملیں گے۔ ان مقاصد کو حاصل کیسے کیا جائے۔ اس کے لئے بھی تفصیلی خاکہ کی ضرورت ہوتی ہے یعنی اگر قرآن مجید کی ہمہ جہت تعلیم کا دعوی ہے تو اس کا باقاعدہ نظام بھی ہونا چاہئے، اسی طرح تعلیمات نبوی ﷺ میں مومن کا جو آفاقی تصور ملتا ہے اور اس سے جس مجاہدانہ کردار کی رہنمائی ملتی ہے، ایسا مجاہد تیار کرنے کی جدوجہد ہونی چاہئے نہ کہ صرف عبادات کے رسوم و آداب بتا کر اسے مومن کامل تصور کرلیا جائے، افکار کی تطہیر اور معاشرہ کی تعمیر کے لئے وسیع مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مختلف افکار و نظریات کے لئے بڑے پیمانے پر لٹریچر فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ دیکھا یہ جاتا ہے کہ بعض مدارس میں دوسرے مکاتب فکر کے متعلق لٹریچر کو پڑھنے پر پابندی عائد ہے۔ اعلی مقصد کے حصول کے لئے مثبت تبدیلی کی ضرورت ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بہت اہم ہے۔ اس کے لئے خاص طور سے بڑی پتہ ماری کی ضرورت ہے۔ مگر بعض جماعتیں چند معروفات کے فروغ کے لئے کوشاں رہتی ہیں اور نہی عن المنکر کا فریضہ بر بنائے

مصلحت آئندہ کے لئے اٹھا رکھا ہے۔طلبہ کی تربیت اگر انہی کی مرہون منت ہوگی تو وہ منکرات کے ازالہ کے لئے کیسے جرأت کرسکیں گے، صحت مند، پرامن اور صلح جو ماحول کے برپا کئے جانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے مگر اپنے مسلک، اپنی جماعت اور اپنے فکر کی بالادستی ثابت کرنے کے لئے تمام جتن کر ڈالے جاتے ہیں۔ یہ رویہ بھی بنیادی مقصد سے متصادم ہے، واقعی وسعتِ قلب وفکر پیدا کرنے کے لئے رویہ میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔الغرض مؤثر نظام تربیت بنانے کے لئے مقاصد سے ہم آہنگ تفصیلی عملی خاکہ کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔تفصیلی نقشہ کار موجود نہ ہونے کی وجہ سے منتظمہ، مربی اور طلبہ اپنے تصوراتی خاکہ پرعمل آوری کے لئے آزاد ہوتے ہیں۔کسی سطح پر محاسبہ کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی اور گاڑی نامعلوم منزل کی طرف دوڑتی رہتی ہے۔

مربی کی تربیت

عملی خاکہ تیار ہونے کے بعد سب سے پہلے نگراں و مربی حضرات کو اس کی اچھی طرح تفہیم کرائی جائے بلکہ ان کی تربیت کا باقاعدہ نظام بنایا جائے۔ ذاتی زندگی کے کسی معاملہ میں ناتجربہ کار افراد پر بھروسہ نہیں کیا جاتا، نوآموز ڈرائیور کے ساتھ سفر کرنا پسند نہیں کیا جاتا، ناتجربہ کار درزی کا سلا ہوا کپڑا پسند نہیں آتا، ناپختہ باورچی کو تقریبات سے دور رکھا جاتا ہے۔مگر ایک نسل کی تربیت کے لئے ناتجربہ کار مربی یا اتالیق کے حوالہ کر دیا جائے، اس کے پاس نہ کوئی عملی خاکہ نہ باقاعدہ تربیت کا نظام، پھر یہ توقع کرنا کہ وہ لائق وفائق افراد ڈھال کر نکالے گا۔ یہ نیم کے درخت سے آم کی توقع کرنے کے مترادف ہے۔اس لئے تربیتی نظام کے ساتھ اتالیق اور مربی کی تربیت کا بھی نظام بنایا جانا چاہئے۔عیسائی مشنری ادارے یا آر ایس ایس جتنے اسکول، بورڈنگ یا تربیتی ادارے چلاتے ہیں، مضمون کے ماہرین کے ساتھ ہر جگہ ذہن سازی اور تربیت کے لئے اپنا ٹرینڈ کیڈر ضرور ساتھ لگاتے ہیں۔عدلیہ، انتظامیہ اور بیوروکریٹس (Bureaucrats) میں اس ذہنیت کی بھرمار اسی وجہ سے ہے۔ہمیں بھی عبرت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

فاعتبروا یا أولی الأبصار۔

مروجہ نظام میں اصلاح

عملی خاکہ مرتب ہو جائے گا تو مروجہ نظام کی کمزوریاں اپنے آپ گرفت میں آجائیں گی تاہم چند باتیں فوری طور پر توجہ طلب ہیں۔

مشق وخطابت

تقریباً تمام مدارس میں طلبہ کو خطابت کی مشق کرائی جاتی ہے۔ تاکہ وہ میدان عمل میں جا کر دعوت کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دے سکیں۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور جامعۃ الفلاح بلریا گنج جیسے اداروں میں مثبت فکر، موضوعات میں تنوع، زمانہ سے ہم آہنگی، سنجیدہ ومعیاری اسلوب کی مشق کرائی جاتی ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں رد بریلویت، ردمودودیت اور رداہل حدیثیت پر طلبہ کو کمربستہ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ موضوعات زور بیانی اور جارحیت کے متقاضی ہیں۔ جارحیت اور شائستگی ساتھ نہیں چل سکتے۔ اسی طرح بریلوی مکتبہ فکر کے مدارس میں رددیوبندیت پر زور صرف ہوتا ہے اور ان کا اسلوب مزید جارحانہ ہوتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ اسلوب رسول اکرم ﷺ کے اسلوب خطابت سے میل کھاتا ہے۔ خاتم الانبیاء ﷺ پورے وقار کے ساتھ، سکینت اور پوری توجہ کے ساتھ، سامعین کی نفسیات اور ذہنی سطح کو ملحوظ رکھ کر بات سمجھاتے اور جملے بار بار دہراتے کہ وہ باتیں دل میں اتر جائیں مگر آپ کا نام لینے والا اور آپ کی محبت کا دم بھرنے والا مقرر آگ کے شرارے اڑائے، ایسا فرد کسی معقول انسان کو کیسے متاثر کرسکتا ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے بارے میں تمام مکاتب فکر کے علماء کو سوچنا چاہئے اور طلبہ کی اس طرح تربیت کرنی چاہئے کہ عوام کی داد وتحسین کی فکرمندی کے بجائے اپنی تقریر کے بارے میں آخرت کی جوابدہی کا احساس بیدار ہو۔

نظم طعام

مدارس میں طلبہ کے لئے کھانا فراہم کرنے کے تین طریقے رائج ہیں۔ کچھ مدارس اجتماعی طور پر ایک ساتھ کھانا کھلانے کا نظم کرتے ہیں۔ کچھ مدارس ملازمین کے ذریعہ طلبہ کے کمرے میں کھانا باعزت طریقے سے بھجوا دیتے ہیں اور کچھ مدارس میں تقسیم کے وقت طلبا اپنا برتن لے کر قطار میں لگتے ہیں اور کھانا لا کر کمرہ میں کھاتے ہیں۔ تیسرا طریقہ خاص طور سے قابل اصلاح ہے۔ بڑے عاقل و بالغ طلبہ جو کل فارغ ہو کر معاشرہ میں قائدانہ کردار ادا کرنے کے لئے کمر کس رہے ہیں، وہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے کاسہ بدست قطار اندر قطار کھڑے ہوں، اس سے ان کی عزت نفس ضرور مجروح ہوتی ہوگی، تقسیم طعام کا یہ نظم جب بنایا گیا تھا ہوسکتا ہے کوئی مجبوری یا کوئی تربیتی پہلو پیش نظر رہا ہو۔ مگر آج کے زمانے میں اس کا نقصان فائدہ سے زیادہ ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ اس لئے اس طریقہ کی اصلاح کی فوری ضرورت ہے۔

اختتامیہ

تربیت کے حوالہ سے یہ معروضات اس توقع کے ساتھ پیش کی جارہی ہیں کہ مدارس کے مسائل ومشکلات پر غور وفکر کے وقت شاید کچھ کام آئیں۔ خوب سے خوب تر کی جستجو مدرسہ کی ہی تربیت کا نتیجہ ہے، مدراس کا ایک خوشہ چیں ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ مدارس کے تئیں احسان مندی کا احساس رہتا ہے اور خواہش، کوشش اور دعا رہتی ہے کہ اللہ تعالی شرور وفتن سے ان کی حفاظت فرمائے۔ ان کی افادیت کو عام کرے اور انہیں دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔

مہ وانجم کے خالق کچھ نئے تارے فروزاں کر
کہ پھر آفاق میں بے رونقی معلوم ہوتی ہے

☆ ☆ ☆

حوالہ جات

۱- قرآن مجید، آل عمران ۱۶۴، سورۃ الجمعہ ۲

۲- ریاض الصالحین، باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر، حیات رسول امیؐ، خالد مسعود، قرآن وسنت اکیڈمی، نئی دہلی، ص ۵۷۵

۳- تزکیہ نفس، مولانا امین احسن اصلاحیؒ، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی ۱۹۹۱ء، ص ۳۳-۳۴

۴- تعلیم کی اسلامی بنیادیں: ڈاکٹر بدر الاسلام وہائٹ ڈاٹ پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۹ء، ص ۱۳۲

۵- تاریخ دار العلوم دیوبند: سید محبوب رضوی، جلد اول، ادارہ اہتمام دار العلوم دیوبند، ۱۹۹۲ء ص ۴۲۴

۶- حوالہ مذکور، ص ۴۳۱

۷- تاریخ مظاہر: مولانا محمد زکریاؒ، کتب خانہ اشاعت العلوم، سہارنپور، ۱۹۷۲ء

۸- ذکر فراہی: ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، دائرہ حمیدہ، مدرسۃ الاصلاح، اعظم گڈھ ۲۰۰۱، ص ۳۸۰

۹- تفصیلات کے لئے مدارس کے تعارفی لٹریچر سے رجوع کیا جائے۔

۱۰- علامہ اقبال کا مشہور شعر ہے۔

اٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے نمناک　　　　نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

۱۱- پاجا سراغ زندگی: مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام، ۱۹۸۹ء، ص ۹۵

۱۲- تفصیلات کے لئے NCERT کا تدریسی لٹریچر یا اقرا انٹرنیشنل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے نصابی اور تدریسی لٹریچر سے رجوع کیا جائے۔ اقراء کی ویب سائٹ ہے:

www.iqrafoundation.com, www.iqra.org.

☆☆☆

دینی مدارس اور تربیت اساتذہ

مولانا محمد طاہر مدنی☆

۱۔ اسلام اور علم

اسلام اور علم میں کچھ ایسا ہی رشتہ ہے جیسا انسانی جسم اور اس میں بسنے والی روح کا، اسلام اگر جسم ہے تو علم اس کی روح، اور بغیر روح کے جسم کا تصور ناممکن ہے۔ دنیا میں بہت سے مذاہب پائے جاتے ہیں مگر اسلام میں علم، طلب علم اور تعلیم کو جو اہمیت دی گئی ہے وہ غیر معمولی اور لاثانی ہے اور فکر انگیز بھی۔ پہلی وحی الٰہی میں نبی امی کو جو خدائی حکم ملتا ہے وہ یہ ہے۔ **اقرأ باسم ربک الذی خلق خلق الانسان من علق اقرأ وربک الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان ما لم یعلم** (العلق: ۱ تا ۵)۔

(یعنی پڑھیے اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون کے لوتھڑے سے، پڑھئے آپ کا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جو وہ نہیں جانتا تھا)

ان آیات مبارکہ میں نبی آخر ﷺ کو پڑھنے کا حکم دیا جاتا ہے اور پھر پڑھنے کی اہمیت بتادی جاتی ہے۔ یعنی قلم کا ذکر کردیا جاتا ہے قلم ہی وہ واسطہ ہے جو انسانی تہذیب وتمدن کا ضامن ہے اور محافظ بھی، اسی کے ذریعہ انسان وہ علم سیکھتا ہے جو اسے معلوم نہیں، انسانی علم محض جبلی نہیں

☆ جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ

ہوتا کبھی بھی ہوتا ہے اور اس میں روز مرہ اضافہ بھی ہوتا جاتا ہے۔ وجہ یہ کہ ہم اپنے آباءواجداد کے تجربوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنے ذاتی علم کا اس میں اضافہ بھی کرتے رہتے ہیں اور بالآخر اس کو آئندہ نسلوں تک منتقل بھی کر دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیات قرآنی میں آنحضرت ﷺ کو پڑھنے کا حکم دینا ہمیں سوچنے کے لئے مجبور کر دیتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس کے بعد کے ۲۳ برسوں میں جو کلام الٰہی نازل ہوا اس میں متعدد آیات ایسی ملتی ہیں جن میں علم کی تعریف اور اس کی اہمیت سمجھائی گئی ہے۔

امام غزالی نے ''احیاء علوم الدین'' کی جلد اول کے پہلے باب ''علم کے فضائل'' میں ہی اس ضمن میں قرآنی حکم کی ۲۲ آیات مبارکہ اور ۱۵۵ احادیث نقل کی ہیں ان میں سے چند پیش خدمت ہیں۔

شهد الله انه لا اله الا هو والملئكة واولو العلم، قائماً بالقسط (آل عمران:۱۸)۔

''اور گواہی دی اللہ نے اس کی کہ بجز اس کے کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں، اور فرشتوں نے اور اہل علم نے بھی اور معبود بھی وہ اس شان کے ہیں کہ اعتدال کے ساتھ انتظام رکھنے والے ہیں''۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے گواہی کی ابتداء اولاً اپنی ذات سے فرمائی پھر فرشتوں کا ذکر فرمایا اور بعد ازاں اہل علم کا۔ علم کے عزوشرف کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو سکتی ہے۔ **"انما یخشی الله من عباده العلماء"** خدا سے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھنے والے ہوتے ہیں۔

"قال الذی عنده علم من الکتاب انا آتیک به" (النمل:۴۰) جس کے پاس کتاب کا علم تھا اس نے کہا کہ میں اس تخت کو تیرے سامنے لا سکتا ہوں۔ مطلب یہ کہ تخت کو چشم زدن میں لانے کی قدرت علم کی بنا پر تھی۔ **"وتلک الامثال نضربها للناس، وما یعقلها إلا العالمون"** (عنکبوت:۴۳)۔

ہم اس قرآن کی مثالوں کو لوگوں کو سمجھانے کے لئے پیش کرتے ہیں۔ ان مثالوں کو

بس علم والے ہی سمجھتے ہیں۔اب چند احادیث مبارکہ پیش خدمت ہیں:

☆ اللہ جس کی بھلائی چاہتا ہے اسکو (دین کا) علم اور سمجھ دیتا ہے (بخاری، مسلم)۔

☆ علماء انبیاء کے وارث ہوتے ہیں (ابوداؤد، ترمذی)۔

☆ زمین وآسمان کی تمام چیزیں علماء کے لئے دعاء مغفرت کرتی ہیں (ابوداؤد، ترمذی)۔

☆ قیامت کے دن تین آدمیوں کی شہادت قبول ہوگی، انبیاء کی، علماء کی، اور پھر شہیدوں کی (ابن ماجہ)۔

☆ عالم کی فضیلت، عابد پر ایسی ہی ہے جیسے چودہویں کے چاند کی تمام ستاروں پر (ترمذی)۔

یہاں ایک بات ضمناً عرض ہے۔ مذکورہ احادیث میں عالم سے مراد دین کا صحیح علم رکھنے والے ہیں صرف سند یافتہ حضرات نہیں، علاوہ ازیں ''گود سے گور تک علم حاصل کرنے، طلب علم کو مسلمانوں کے لئے فرض کیے جانے، جیسے متعدد اقوال مبارکہ کو ضرب المثل کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ یہ اِس زندگی کی بات تھی۔اب اُس زندگی کے بارے میں مسلم کی روایت دیکھیں:

''جب ابن آدم مر جاتا ہے تو اس کے عمل کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے مگر تین چیزوں سے منقطع نہیں ہوتا، ایک علم سے جس کا فائدہ اوروں کو ہو، ایک صدقہ جاریہ سے، اور ایک صالح اولاد سے جو اسکے لیے دعاء مغفرت کرے۔'' اسلام کے نزدیک علم، تہذیب، اخلاق اور ذہن وفکر کی تربیت کا ایک وسیلہ ہے۔ اس سے انسان میں صلاح وکمال اور پختگی پیدا ہوتی ہے اور وہ تدبر اور تفکر کا عادی ہوتا ہے سائنس اکتساب علم اور غور وفکر کا ایک عمل ہے اور اس ضمن، میں جو سائنسی تجربے اور عملی اقدامات کیئے جاتے ہیں ان کو ٹکنالوجی کہتے ہیں قرآن مجید نے خود اسکی ترغیب دلائی ہے۔ اس نے کائنات کا دقت نظر سے مطالعہ کرنے، اس کے نظام اور اسکی مخلوقات پر غور کرنے، فکر ونظر اور تدبر سے کام لینے کی بار بار دعوت دی ہے۔ اور اشیاء کے حقائق کو معلوم کرنے اور انفس وآفاق کا مشاہدہ کرنے کی پیہم تلقین کی ہے ارض وسما اور بحر وبر کے انسان کے لئے مسخر

کیے جانے کے نتیجہ میں حیات وکائنات اور وسائل کی تحقیق وجستجو کا مطالبہ کیا ہے فرمان الٰہی ہے:

"وسخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض جمیعا منه، ان فی ذٰلک لایات لقوم یتفکرون" (جاثیہ:۱۳)۔

اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کی تمام چیزوں کوتمہارے لئے مسخر کردیا۔ بیشک اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جوغور وفکر کرتے ہیں۔

"قل انظروا ماذا فی السمٰوٰت والارض" (یونس:۱۰۱)۔ ان سے کہو زمین وآسمان میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھیں۔اورخود انسان کے اپنے وجود کے اندر جونشانیاں پوشیدہ ہیں انکی تلاش وجستجو کی اس طرح دعوت دی گئی ہے "زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لئے اور خودتمہارے اپنے وجود میں۔کیاتم کوسوجھتانہیں"

و فی الارض آیات للمو قنین و فی أنفسکم أفلا تبصرون (زاریات:۲۱)۔

اوراس ضمن میں نبی آخر ﷺ کی یہ دعا بھی پیش نظر رکھیں:

اللھم أرنی حقائق الاشیاء کما ھی (خداوند مجھےاشیاء کی اصل نوعیت کاعلم عطا فرما)۔

یہ توصداقت اور حقیقت ہے کہ ایک مسلمان کے لئے علم کا سرچشمہ قرآن حکیم اوراس کی فکری وعملی تشریح،احادیث رسول اللہ ہے قرآن کی ۶۶۶۶ آیات مقدسہ میں صرف عقائدووظائف کا ہی ذکرنہیں ہے بلکہ ایک محقق کے بقول ان میں سے سینکڑوں سے زائد کا تعلق،اس ہر لحہ وسیع تر ہوتی جاتی کائنات اوراس کے داخلی اور خارجی مظاہر سے ہے جن پرغوروفکر کے لئے متحرک کیا گیا ہے امام غزالیؒ کی تحقیق کے مطابق،صرف نظم کائنات سے متعلق،مختلف اسلوب میں ۷۶۳ جگہوں پرغوروفکر کے لیے ابھارا گیا ہے۔**"لعلکم تعقلون، لعلکم تفکرون،لعلکم تذکرون"** فرماکرآخرکس بات پر متوجہ کیا گیا ہے کیا یہ سب دلائل ربوبیت کواجاگر کرنے کی غرض سے نہیں

ہیں جو مظاہر عالم پر غور وفکر کے باعث ظہور میں آتے ہیں؟ ترمذی کی ایک حدیث شریف ہے:

''قرآن کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔'' یعنی ہم غور وفکر کرتے رہیں اور اسرار عالم دریافت کرتے رہیں۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں نے وہ تمام علوم حاصل کیے جو ان سے پہلے موجود تھے، مگر انہوں نے کسی علم وفن، کسی تہذیب وتمدن اور مذہب کو اپنے اوپر مسلط نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی دینی خصوصیات کو باقی رکھتے ہوئے تحصیل علم کو اولیت دی خواہ وہ کسی ملک کا ہو۔ کیونکہ:

(الحکمة ضالة المؤمن) حکمت ودانائی مومن کی گم شدہ متاع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تیسری صدی ہجری سے لیکر بعد کی کئی صدیوں تک مسلمانوں کی تعلیمی درس گاہیں، تجربہ گاہیں اور علمی مراکز تعلیم، سائنس و تحقیق وانکشافات کا گہوارہ بنی رہیں، جہاں سے بے شمار مفکرین، دانشوران اور ماہرین علوم، سائنس داں تک پیدا ہوئے جنہوں نے طبعیات، ریاضی، جیومیٹری، الجبرہ، طب، ہیئت، ارضیات وغیرہ میں تحقیقی معلومات کا انبار لگا دیا، آج کی سائنس، انہیں ہمارے سائنس دانوں اور مفکرین کی رہین منت ہے۔

آج ان ذروں کو بھی ناز اپنی تابانی پر ہے
تیرے در کا نقش سجدہ جن کی پیشانی پر ہے

حقیقت یہ ہے کہ ہم قرآن کے ایک حصہ کو ضروری اور بعض احکام کو ''غیر ضروری'' نہیں قرار دے سکتے۔ اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو ہماری روش یہود ونصاریٰ کی طرح ہو جائے گی جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ أفتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض (بقرہ:۸۵)۔

کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصہ کا انکار کرتے ہو۔

۲۔ دینی مدارس: ابتدا اور ارتقاء

اسلام میں مدارس کی ابتداء خود حضور اکرم ﷺ کے دست مبارک سے ہوئی۔ ہجرت

کے بعد جب مسجد نبوی تعمیر ہوئی تو اس کا ایک حصہ، تعلیم گاہ کے طور پر مخصوص کر دیا گیا۔ اس کو ہم صفہ کا نام دیتے ہیں۔ اس میں کچھ تو دن کے طالب علم اور کچھ دن و رات دونوں کے طالب علم شامل تھے۔ اس درس گاہ کے ابتدائی مرحلے میں، متعدد شعبے تھے جو متعدد لوگوں کے سپرد تھے، اس ضمن میں ابن ماجہ کی ایک حدیث کا مفہوم پیش کرنا مناسب ہوگا۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ اپنے حجرے سے نکل کر مسجد کے اندر آئے اور دیکھا کہ وہاں دو گروہ ہیں ایک گروہ تسبیح پڑھنے اور ذکر واذکار میں مشغول تھا۔ دوسرا گروہ علم حاصل کر رہا تھا آپ نے فرمایا کہ اگرچہ دونوں گروہ اچھا کام کر رہے ہیں، لیکن وہ گروہ بہتر ہے جو تعلیم کا کام کر رہا ہے اور ''انما بعثت معلماً'' (یعنی میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں) فرما کر اس گروہ میں بیٹھ گئے۔

درس گاہ صفہ میں ایک طرف ایسی چیزیں ملتی ہیں جن میں ایک طرف علم کی اہمیت بتانے کے ساتھ اس کے حصول کی ترغیب بھی دی جاتی ہے تو دوسری طرف ایسے انتظامات بھی نظر آتے ہیں جن کے باعث علم کا حصول آسان ہو جائے۔ مثال کے طور پر غزوہ بدر کے قیدیوں سے فدیہ کے بجائے یہ شرط کہ وہ دس مسلمانوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں۔

آپ مختلف علوم کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ اور چاہتے تھے کہ مسلمان ان علوم کو سیکھیں۔ قرآن حکیم پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اس میں بے شمار علوم کا ذکر ہے کلام اللہ میں صرف دینی عقائد، اخلاقیات اور عبادات کا ہی ذکر نہیں ہے بلکہ قرآن سارے بنی آدم کی تاریخ ہے اور اس میں ان علوم کا بھی ذکر ہے جنہیں ہم سائنس کہتے ہیں۔ مثلاً: نباتات، حیوانات، علم حجر، علم بحر، علم ہیئت یہاں تک کہ علم جنس کا بھی ذکر ملتا ہے۔ بقول سید امیر علی:

''قرآن خود علم و سائنس پر شاہد ہے'' اور حاجی خلیفہ کی 'کشف الظنون' سے ایک حدیث بھی دیکھیں ''صانع حقیقی کے کاموں پر ایک گھنٹہ کا فکر و تامل، ستر برسوں کی عبادت سے بہتر ہے۔'' آپ علم طب و جراحت کی بھی سر پرستی فرماتے تھے۔ اور دیگر ضروری علوم۔ مثلاً عسکریات وغیرہ کے سلسلے میں بھی لوگوں کو تربیت دیتے تھے، ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ....؟

حضور ﷺ نے اپنے خاص کاتب وحی، حضرت زید بن ثابتؓ کو حکم دیا تھا کہ وہ عبرانی زبان بھی سیکھ لیں۔ چنانچہ آپ کو چار زبانیں آتی تھیں۔ عربی، عبرانی قبطی اور فارسی۔ بیہقی کی ایک حدیث ہے: ''علم حاصل کرو چاہے وہ چین میں ہی کیوں نہ ہو'' محدثین تکنیکی اعتبار سے اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ مگر بقول ڈاکٹر محمد حمید اللہ ''عقلی اور تاریخی اعتبار سے اعتراض کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی بشرطیکہ ہمارا مطالعہ ذرا وسیع ہو اور اپنی علمی میراث سے زیادہ واقفیت ہو۔ خیال ہے کہ چین کے ریشمی کپڑوں کی صنعت اور چین سے عرب تک کی چھ ماہ کی مسافت اس کی وجہ ہوگی۔''

درس گاہ صفہ کی ایک خصوصیت اور تھی۔ یہاں حکام وعوام، کالے وگورے، عرب، غیر عرب، آزاد وغلام، بغیر کسی امتیاز کے حصول علم میں مصروف رہا کرتے تھے۔ آپ کی حیات مقدسہ میں ہی، مدینہ منورہ کی مساجد میں نو مدرسے قائم ہو چکے تھے اور آپ صحابہ کرامؓ کو یہ آیت کریمہ سناتے تھے:

قل هل يستو ى الذين يعلمون والذين لايعلمون (زمر:۹) ''پوچھئے! کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں''۔ دراصل حضورؐ کی تشریف آوری کے بعد، شورائی حکومت الٰہیہ کا مستقر مدینہ، مرجع خلائق بن گیا تھا۔ نہ صرف عرب کے مختلف حصوں سے بلکہ دور دراز ملکوں سے بھی طالبان حق، جوق در جوق آنے لگے تھے۔ ان میں بیشتر لوگ تحصیل علم اور پیغمبر اسلام کی باتیں سننے کے لئے عازم مدینہ ہوئے۔ پیغمبر اسلام کا ایک محبوب موضوع علم کی قدر و منزلت تھا ایک فرمان رسول ہے ''علم حاصل کرو کیونکہ جو شخص راہ حق میں علم حاصل کرتا ہے وہ ایک تقویٰ کا کام انجام دیتا ہے۔

سید امیر علی ''روح اسلام'' میں بجاطور پر لکھتے ہیں:

''رسول عربی کو علم اور سائنس سے جو محبت تھی وہ آپ کو دوسرے تمام معلمین دین سے امتیاز بخشتی ہے اور جدید دنیا کے فکر سے آپ کو ایک نہایت قریبی رشتہ موانست میں منسلک کرتی ہے''۔ خلفاء راشدین کے دور میں بھی اس اسوۂ نبویؐ پر عمل ہوتا رہا فتوحات کے ساتھ

ساتھ لوگوں کی تعلیم کا بھی خاطر خواہ نظم ہوتا رہا تبلیغ دین اور حصول علم کا کام جاری رہا۔ امویوں کا زمانہ، مسلمانوں کے لئے آموزش اور آزمائش کا زمانہ تھا جس میں وہ اپنے کو اس عظیم کام کے لئے جو انہیں تفویض ہوا تھا، خود کو تیار کر رہے تھے عباسیوں کے عہد میں وہ ساری دنیا کے علم وفضل کے خزانہ دار بن گئے دنیا میں جہاں بھی کچھ ملا اٹھا لائے اور مشتاقان علم کے سامنے رکھ دیا۔ ہر طرف مدرسے اور دارالعلوم بن گئے ہر شہر میں کتب خانے قائم ہو گئے، علم اور سائنس کے جو ماہرین ان مدارس میں پیدا ہوئے اور جنہوں نے کسی نہ کسی انداز سے انسانی ترقی کی راہ پر اپنے نقش پا چھوڑے ان کی فہرست اگر تیار کی جائے تو کئی جلدیں درکار ہوں گی اس کا ایک اجمالی تذکرہ ''روح اسلام'' کے باب نو میں مل جائے گا۔

یہ بات واضح ہو کہ یہ سب کچھ ان درس گاہوں میں ہوا جو صرف دارالعلوم اور مدرسہ کے نام سے معروف تھیں اور جن میں آج کی طرح ''دینی'' کا سابقہ نہیں لگتا تھا۔

۳۔ موجودہ صورتحال

سچائی یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ کے لئے قرآن وسنت کی تعلیم اور اسلامی عناصر کے اجزائے ترکیبی کا فہم وشعور اسی قدر اہمیت رکھتا ہے جتنا عام زندگی کے لئے ہوا، پانی اور غذا۔ ہمارے دینی مدارس کے تعلیمی نظام نے مختلف ادوار میں مختلف انداز سے خدمات انجام دی ہیں، اگر ہماری تاریخ میں کچھ قابل فخر اور درخشاں کامیابیاں ہیں اور یقیناً ہیں تو اس میں ہمارے تعلیمی نظام کا بہت زیادہ ہاتھ ہے اگر ہمارے دامن میں ناکامیابیوں کے کچھ حصے اور کچھ ہزیمتیں ہیں تو ان کی ذمہ داری بھی نظام تعلیم ہی کی ہے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ دینی مدارس نے، ماضی بعید ہی نہیں، بلکہ ماضی قریب میں بھی، اپنی ہمہ جہتی ذمہ داریوں کو نباہنے کے لئے بیش قیمت خدمات انجام دی ہیں۔ اپنے ملک ہندوستان ہی میں دیکھیں، ایک زمانہ تھا کہ ہمارے یہاں دینی اور غیر دینی کی تفریق نہیں تھی تقریباً ہزار سال

تک اسلامی دنیا اس تفریق سے نا آشنا رہی۔ جس نظام تعلیم کی پیداوار حضرت مجدد الف ثانیؒ تھے اسی نظام کی پیداوار اسی دور کے تمام دوسرے اہل علم، ارباب سیاست وحکومت اور دیگر اہل علم ودانش بھی تھے حضرت مجدد الف ثانیؒ اور سلطنت مغلیہ کے وزیر اعظم نواب سعد اللہ خاںؒ ہم درس تھے اور ایک ہی استاد کے سامنے زانوئے تلمذتہ کر کے تیار ہوئے تھے تاج اور دیگر عمارتیں تعمیر کرنے والا معمار احمد معمار نے جن درس گاہوں میں تعلیم پائی تھی انہیں میں شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم نے بھی علم حاصل کیا تھا۔

لیکن بعد ازاں ایک بڑا سانحہ ہوا، ہوا یہ کہ مسلم دنیا پر مغربی استعمار مسلط ہو گیا۔ ہندوستان میں بھی یہی ہوا، ہمارا تعلیمی نظام دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ دنیاوی اعتبار سے قیادت کی تیاری اور حصول علم کا سارا نظم ایک خاص سیاسی نظام کے سپرد کر دیا گیا اور مادی بے سروسامانی اور نہایت نا مساعد حالات میں دین کی حفاظت، اسلامی روایات کی پاسداری، قوم کی دینی تعلیم وتربیت اور دینی قیادت کی تیاری کا کام ایک دوسرے نظام نے سنبھال لیا۔

آج کی یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلم معاشرہ دین سے محبت کے جذبات رکھنے کے ساتھ اپنے رویوں سے، سیکولر رجحانات سے بھی کم وبیش اسی درجہ میں وابستہ ہے۔ لمحہ فکریہ یہ ہے کہ عوام ہی نہیں خود علماء کرام بھی، اس میں برابر کے شریک ہیں جو قائدانہ صفات سے عاری ہوتے ہیں معاشرہ نے بھی ان کے لئے، مسجد کی چہار دیواری، نکاح، جنازہ اور ختم شریف کا کردار مخصوص کر دیا ہے ایک اہم سوال یہ ہے کہ اس صورتحال کا ذمہ دار کون ہے؟ ہماری رائے میں صرف استعمار کو ذمہ دار قرار دینا اور اپنی ناکامیوں کی وجہ قرار دینا، آدھا سچ ہوگا اور آدھا ادھورا سچ، خود اپنے لئے تباہ کن ہوتا ہے۔

آج صورتحال یہ ہے کہ مختلف قوتیں، دینی مدارس سے متعلق ہر چیز کو الزامی مہم کے بل بوتے پر ختم کرنے یا کم از کم اسکی ہیئت تبدیل کرنے کی درپے نظر آرہی ہیں۔ لیکن دینی مدارس کے حقیقی دشمن صرف یہی قوتیں ہیں یا بسا اوقات خود ان مدارس کے نظام کار، اور ان کے افراد،

اپنے خلاف وعدہ معاف گواہ کا کردار ادا کر رہے ہیں؟ ایک معروف دانشور سلیم منصور خالد کا یہ جملہ بھی یہاں نقل کرنا بے محل نہ ہوگا اپنے مقالہ ''دینی مدارس میں تعلیم'' میں لکھتے ہیں۔

''مسلم دنیا میں دینی و دنیوی تعلیم کی دو متوازی لہروں کو ملانے اور مختلف علمی روایات کو باہم مربوط بنانے کی کوئی سنجیدہ کوشش دکھائی نہیں دیتی۔ ملی تعلیمی ثنویت، مسلم معاشرہ میں ذہنی انتشار، روحانی اضطراب اور مادی ترقی کے بے رخے پن کی بنیاد ہے جس نے اسلام اور ملت اسلامیہ کے ساتھ، تعلیم یافتہ مسلمانوں کے گہرے تعلق اور تہذیبی احساس کو کمزور بنا دیا ہے۔''

حالانکہ تعلیم کی وحدت کے ساتھ نظام تعلیم کی یکسانیت، یکجہتی، ملت اسلامیہ کی یکجہتی، یک رنگی و یکسانیت کے لئے شرط لازم ہے۔ دراصل یہ دوئی بھی سیکولرزم کے فروغ میں معاون ہو رہی ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ اسلامی تعلیمی نظام کے معنی اگر ایک طرف انفرادی شخصیت کی تعمیر و تشکیل ہے تو ساتھ ہی اپنے تہذیبی ورثہ کی حفاظت اور اس کی اعلیٰ اخلاقی قدروں کی منتقلی اور ترقی ہے۔ اسکے علاوہ، معاشرہ اور تہذیب کے لئے، قوم و ملک کے لئے ایسی قیادت کی تیاری بھی ہے جو عصری علوم وفنون سے آراستہ ہو اور جو وقت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے قوم و ملک کے لئے ترقی مسلسل کی راہیں نکال سکے۔

۴۔ تربیت اساتذہ

عربی زبان کی ایک کہاوت ہے: الحق مرّ یعنی سچائی تلخ ہوتی ہے، مگر سچائی کا سامنا نہ کرنا تلخ تر نتائج کا حامل ہو جاتا ہے. دینی مدارس کے سلسلے میں سچائی یہ ہے کہ یہاں سرے سے اسکا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ اس ضمن میں ایک ماہر تعلیم کا یہ تبصرہ پیش خدمت ہے: ''ہمارے یہاں درس نظامی میں اساتذہ کی تربیت کا کوئی نصاب موجود نہیں حالانکہ دنیا کے تمام نظام ہائے تعلیم میں اسکی اہمیت اور ضرورت مسلم ہے. مدارس میں عملاً یہ ہوتا ہے کہ اچھی استعداد اور ذوق رکھنے والا فاضل کسی نہ کسی مدرسہ میں تدریس کی جگہ حاصل کر لیتا ہے۔ اسکے بعد علماء کی ذہن

سازی اور فکری ترجیحات کے تعین میں وہ کسی اصول، ضابطہ، قانون اور متعین اہداف کا پابند نہیں ہوتا بلکہ یہ معاملہ اسکے ذاتی ذوق اور رجحان پر منحصر ہوتا ہے جس کا اثر لازماً طلبہ پر بھی پڑتا ہے۔" ظاہر ہے "سینہ بہ سینہ" علم منتقل کرنے کا یہ طریقہ ممکن ہے کسی زمانہ میں کارآمد رہا ہو لیکن آج کے سائنس اور تکنیک کے دور میں یہ اذکار رفتہ ہو گیا ہے۔

تربیت اساتذہ دراصل ایک طرح کی فنی مہارت ہے اور فنی مہارتوں کی ہر دور میں اہمیت بدلتی رہتی ہے۔ عہد رسالت مآبؐ میں ایک اسلحہ تھا منجنیق۔ ضرورت محسوس ہوئی تو آپ نے چند صحابہ کرامؓ کو یمن بھیجا کہ منجنیق بنانا سیکھ کر آئیں۔ آپؐ نے طائف کے معرکہ میں اس کا استعمال بھی کیا۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اور ابن تیمیہؒ نے "السياسة الشرعية" میں لکھا ہے کہ ایسی تمام مہارتوں اور تخصصات کا حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے فرض کفایہ ہے جن کے نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان غیروں کے محتاج بن کر رہیں یعنی اپنے تمام دینی و دنیوی معاملات میں خود کفیل بنانا مسلمانوں کے لیے فرض کفایہ ہے۔ جہاں تک تربیت اساتذہ کا بطور خاص تعلق ہے، چند باتیں پیش خدمت ہیں۔

☆ کسی بھی عمل مسلسل میں استاد کی حیثیت کلیدی ہوتی ہے ایسی کہ اس کے اثرات نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں استاد کی اہمیت غیر معمولی نہ ہوتی تو یہ ارشاد گرامی نہ ہوتا "میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں" اس ضمن میں حکومت ہند کے قومی تعلیمی کمیشن کا یہ جملہ نقل کرنے کے لائق ہے "کوئی بھی نظام تعلیم اتنا ہی اچھا ہوتا ہے جتنا کہ اسکا استاذ"۔

☆ اب معلمی ایک فن اور ایک پیشہ بن چکا ہے اور آج کے سائنسی اور تکنیکی دور میں کوئی بھی پیشہ، بغیر پیشہ ورانہ تربیت کے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

☆ انگریزوں نے اس ملک میں اسکولوں کا جال بچھایا تو اساتذہ کی تربیت کا بھی نظم

کیا آزادی کے بعد بھی سرکاری و نیم سرکاری اداروں میں تربیت یافتہ اساتذہ کی ہی تقرریوں پر زور دیا گیا۔ بروقت اس ملک میں آر ایس ایس کا، بچوں کے اسکولوں کا اپنا ایک متوازی نظام ہے اور اساتذہ کی تعلیم کا انکا اپنا ایک انتظام بھی ہے

☆ ۲۰ رکروڑ کی مسلم آبادی والے اس ملک میں مکاتب و مدارس کی تعداد لاکھوں اور ہزاروں میں ہوگی مگر شاید ہی کسی میں کوئی تربیت یافتہ استاد مل سکے نتیجہ بھی ہمارے سامنے ہے سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق اس وقت مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی دلتوں سے بھی بدتر ہے۔

تو پھر کیا کیا جائے، ماتم و آہ وزاری سے تو کچھ ہونے کا نہیں،

بقول عرفی:

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال
صد سال می ہمی بہ تمنا گریستن

دراصل ہمیں ضرورت ہے حقیقت پسندی اور مخصوص عزم و ارادے کی، تاکہ ہم تربیت کے اپنے ادارے قائم کریں، اپنے تربیت اساتذہ کے مراکز قائم کرنے کی چند ایک وجہیں درجہ ذیل ہیں:

۱۔ مکاتب و مدارس کا سماجی، معاشی اور معاشرتی پس منظر، دیگر تعلیم گاہوں سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔

۲۔ طلبہ و طالبات مسلم گھرانوں سے آتے ہیں جنکی اپنی مخصوص تہذیبی و ثقافتی روایات ہیں۔

۳۔ ان تعلیم گاہوں میں درس دینے والے معلمین رمعلمات کا تعلق بھی عموماً اسی پس منظر سے ہوتا ہے

۴۔ ایک تربیت یافتہ استاد، بہتر طریقہ سے بچوں کو تعلیم اور تربیت دے سکتا ہے اور کم

محنت اور وقت میں بہتر عملی نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ معیار تعلیم بلند ہوسکتا ہے۔ تعلیم میں بچوں کا دل لگ سکتا ہے اور ''چھوڑ کر جانے والوں'' کی تعداد پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

۵۔ مکاتب اور مدارس کے اساتذہ کے لئے موجودہ بی۔ ایڈ کا نصاب بے فیض ہوگا۔ کیوں کہ اس نصاب کا مزاج سیکولر ہے جبکہ ہماری درسگاہوں کی بنیاد ''الدین'' ہے۔

پیوندکاری کی افادیت ہمیشہ مشکوک ہوتی ہے۔

٦۔ بی ایڈ کا نصاب صرف فنی ضرورتوں کی تکمیل کرتا ہے اور بدرجہ اتم کرتا ہے مگر دین اور اسکے متعلقات سے سروکار نہں رکھتا۔ ہماری درسگاہوں کو ضرورت ہے ایسے اساتذہ کی جو فنی اعتبار سے بھی اعلیٰ ہوں اور فکری اعتبار سے بھی دینی اقدار کے حامل۔

۷۔ ہم کو ضرورت ہے ایک ایسے تعلیم اساتذہ کے مرکز کی جس میں فکری وفنی ہر دو ضرورتوں کا خیال رکھا گیا ہو۔ اسلئے، ہمارا خواب، ہمارا وژن یہ ہونا چاہیئے کہ مکاتب اور مدارس کے اساتذہ کی فکری وفنی تربیت کیلئے ایک ایسے ادارہ کی بنیاد رکھی جائے جس میں تعلیم وتربیت کے سبھی اہم پہلوؤں کو اس انداز سے منضبط کیا جائے کہ اساس قرآن اور سنت ہو۔ یہ کام دشوار ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ اور کرنے کے لائق بھی ہے۔

۵) مرکز تعلیم اساتذہ، اسلامی تناظر میں

تقریبا 49 برس قبل، ملک کی دینی درسگاہوں میں ''قدیم وجدید'' کا قضیہ زوروں پر تھا۔ ضلع اعظم گڑھ، بالخصوص قصبہ بلریا گنج کے چند ذی شعور ومخلص لوگوں نے ''ایک خواب'' دیکھا قدیم وجدید کی خوشگوار آمیزش کا۔ ایک چھوٹے سے ادارہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اور آج بفضلہٖ تعالیٰ ''جامعۃ الفلاح'' سے ایک عالم آشنا ہے۔ اساسی اراکین میں سے چند اب بھی تعلیم کے ذریعہ دین کی خدمت میں مشغول ہیں مکاتب اور مدارس کی تعلیم وتربیت کو معیاری بنانے میں ان کو ''تربیت اساتذہ'' کی ضرورت اور اہمیت کا شدید احساس ہے ان لوگوں نے پھر ایک خواب

دیکھا ہے اور اسکی عملی تعبیر کے لیے کوشاں ہیں منصوبہ تو کئی سال قبل بن گیا تھا دو سال قبل اسکو ایک کتابچہ کی شکل میں شائع بھی کیا گیا عنوان تھا ''مرکز تعلیم اساتذہ۔ اسلامی تناظر میں''۔

الحمد للہ ملت کے بہت سے دانشوروں نے نہ صرف مثبت ردعمل کا اظہار کیا بلکہ مفید مشورے بھی دیئے اور اصرار کیا کہ اس منصوبہ کو جلد از جلد عمل میں بھی لایا جائے چنانچہ گزشتہ ۵،۶ مئی کی منعقدہ جامعہ کی مجلس شوریٰ میں اس کی منظوری مل گئی اور ۷ رمئی ۲۰۱۰ء کو باقاعدہ ''مرکز تعلیم اساتذہ'' کا قیام عمل میں آ گیا، انشاء اللہ العزیز اس پروگرام سے، جس کی اساس قرآن وسنت ہے، ملک کے دینی مدارس کی یہ ضرورت ایک منفرد انداز میں پوری ہوگی۔

آج اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کی پیش رفت سے آپ سبھی ذی علم حضرات کو واقف کرادیا جائے۔

☆ایک مثبت اور حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ ہمیں، عارضی طور پر عمارت کی سہولت حاصل ہوگئی ہے۔

☆ہمیں اسباق کی تدریسی مشق کے لیے، ابتدائی وثانوی درجات کے طلبہ وطالبات بھی میسر ہیں۔

☆اس جامعہ کے بہت سے معلمین ومعلمات نے اس پرگرام میں شامل ہوکر باضابطہ تربیت یافتہ ہونے کا ارادہ بھی ظاہر کیا ہے۔

☆ حاصل شدہ عمارت کے ایک کمرے میں ایک دار التحقیق قائم کردیا گیا ہے کمرہ ضروری فرنیچر سے آراستہ ہوگیا ہے اور مطلوبہ کتابیں ورسائل آنا شروع ہوگئے ہیں فی الحال اس کے لیے ایک لاکھ روپے کی رقم مختص کردی گئی ہے۔

☆اس اختراعی منصوبہ کو پیش کرنے والے شخص ڈاکٹر ابرار اعظمی کو اس کا نگراں مقرر کر دیا گیا ہے، ایک مجلس تعلیمی نے کام کرنا شروع کردیا ہے، مخصوص طرز کے اس پرگرام کے نصاب

تعلیم کی تیاری کا کام بفضلہ تکمیل کے مراحل میں ہے۔

☆ اللہ کا کرم ہے کہ ہمیں چند ایسے دانشوروں کا تعاون بھی حاصل ہو گیا ہے جو ماہرین فن ہونے کے ساتھ دینی شعور بھی رکھتے ہیں، لیکن ہمارے سامنے ایک بڑا مسئلہ بھی ہے، معقول معاوضہ کے باوجود ہمیں کام کرنے والے افراد نہیں مل رہے ہیں۔

ہم نے اللہ کا نام لیکر اس کے نصرت کے سہارے آغاز کار کر دیا ہے لیکن ہندوستان کی حد تک یہ منصوبہ بالکل نیا ہے اور منفرد بھی، یقین ہے اس محفل کے ذی علم اور دور اندیش شرکاء کرام پر اسکی افادیت واضح ہو گی۔ ہمیں اس سلسلے میں آپ کے قیمتی مشوروں، بیش قیمت آراء اور مخلصانہ تعاون کی پوری امید ہے، آپ کے استفسارات کا ہم خیر مقدم کریں گے اللہ عزوجل آپ کو جزاء خیر سے نوازے۔

کتابیں جن سے استفادہ کیا گیا

۱۔ الغزالی (امام ابو حامد محمد) احیاء العلوم الدین (ترجمہ ندیم الواجدی) ۲۰۰۱ء، دار الکتاب، دیوبند

۲۔ امیر علی (سید) روح اسلام۔ ۱۹۸۶۔ اسلامک بک سنٹر، نئی دہلی

۳۔ حمید اللہ (ڈاکٹر محمد) خطبات بہاول پور۔ ۱۹۹۷، اسلامک بک فاؤنڈیشن۔ دہلی

۴۔ سلیم منصور خالد۔ دینی مدارس میں تعلیم۔ ۲۰۰۲۔ عالمی ادارہ فکر اسلامی۔ اسلام آباد،

۵۔ شہاب الدین ندوی۔ اسلام میں علم کا مقام و مرتبہ۔ ۱۹۸۹، فرقانیہ اکیڈمی۔ بنگلور۔

۶۔ ایضاً۔ قرآن کا نظریہ علم۔ ۲۰۰۲۔ فرقانیہ اکیڈمی۔ بنگلور

۷۔ ضیاء الدین اصلاحی۔ مسلمانوں کی تعلیم۔ ۲۰۰۶۔ شبلی اکیڈمی۔ اعظم گڑھ

☆☆☆

دینی مدارس اور تربیت اساتذہ و معلمین

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مظفر پوری ☆

اس اہم موضوع کے لئے چند منصوص آیات وروایات:

(الف) الحمد لله رب العالمین (ب) رب ارحمهما کما ربیانی صغیرا (ج) ألم نربک فینا ولیداً (د) کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون (ہ) هو الذی بعث فی الامیین رسولاً منهم یتلوا علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب (و) فبما رحمة من الله لنت لهم ولو کنت فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولک (ز) الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس.

روایات

☆حسن نیت وانابت الی اللہ: **إنما الأعمال بالنیات**

☆خداترسی وتقوی: **ومن یتق الله یجعل له مخرجا** (القرآن)۔

☆حلم وتحمل: **کونوا ربانیین قال ابن عباس کونوا حلماء فقهاء علماء، الربانی هو الذی یربی الناس بصغار العلم قبل کباره** (کتاب العلم، بخاری)۔

☆احساس ذمہ داری اور طلبہ کی ہمہ جہت نگرانی: **الدین النصیحة، لا ایمان لمن لا امانة له ولا دین لمن لا عهد له** (مشکوٰۃ)۔

☆ قاضی شریعت دارالقضاء امارت شرعیہ، بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ۔

☆یسر وتیسیر :عن انسؓ عن النبی ﷺ قال یسروا ولا تعسروا (کتاب العلم بخاری)۔

☆ نفسیات کی رعایت: کان عبد اللہ بن مسعود یذکر الناس فی کل خمیس فقال لہ رجل: یا ابا عبد الرحمن لوددت انک ذکرتنا کل یوم قال اما یمنعنی من ذلک أنی أکرہ أن أملکم وانی اتخولکم بالموعظة کما کان النبی ﷺ یتخولنا بھا مخافة السامة علینا (بخاری کتاب العلم)۔

☆ افہام وتفہیم پر خصوصی توجہ:عن انسؓ عن النبی ﷺ کان إذا سلم سلم ثلاثاً وإذا تکلم بکلمة اعادھا ثلاثا (بخاری کتاب العلم)۔

☆ اہم مباحث کو قید تحریر میں لانا یعنی نوٹس تیار کرانا:سمعت أبا ھریرةؓ یقول ما من أصحاب رسول اللہ أحداً أکثر حدیث عنہ منی إلا ماکان من عبد اللہ بن عمرو فانہ کان یکتب ولا اکتب (بخاری، کتاب العلم)۔

☆ طلبہ کی ذہنی وفکری سطح کی رعایت اور غامض مباحث ونکات کے تذکرہ سے اجتناب:قال علی: حدثوا الناس بما یعرفون أتحبون أن یکذب اللہ ورسولہ (بخاری کتاب العلم) وکلم الناس علی قدر عقولھم (مسلم کتاب الایمان) عن عبد اللہ بن مسعودؓ قال: ما انت بمحدث قوماً حدیثا لا تبلغہ عقولھم الا کان لبعضھم فتنة (مقدمہ مسلم)۔

☆ اجتماعی اختبار وشفاہی امتحان:حدیث النخلہ

☆ ذریعہ علم قلم ہے، خواہ عہد جدید کا قلم:علم بالقلم

☆ کمپیوٹر سے کما حقہ استفادہ

☆ تنشیط ذہن کے لئے جائز حدود میں کھیل کود کا موقع فراہم کرنا۔ ان نصوص کی روشنی میں تربیت کے تعلق سے اپنے کچھ تجربات اور بعض مشورے غیر مرتب لکھ دیئے ہیں اللہ تعالیٰ پورے ملک میں علوم دینیہ اور اسلامیہ کی جامعات اور کلیات نیز اہم تحقیقاتی مراکز میں مختلف موضوعات پر تدریسی تربیت کی راہیں پیدا فرمادیں (آمین)۔

دینی مدارس اور تربیت اساتذہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ پورے عالم اسلام میں دین اسلام کی حفاظت واشاعت کا اہم فریضہ معاہد علمیہ، مکاتب قرآنیہ اور مدارس دینیہ بڑے اہتمام والتزام کے ساتھ انجام دے رہے ہیں، اور مسلمانوں کی فکری علمی اور اخلاقی نیز امور دینیہ کے سرحدوں کی حفاظت ان ہی دینی مدارس کے ذریعے ہورہی ہے، ان دینی مدارس نے اس ملک میں تقریباً پونے دوسو سالہ تاریخ میں جس جہد مسلسل اور عمل پیہم کے ذریعے ثمرآور کاوشیں کی ہیں، یقیناً وہ تاریخ ہند کے روشن ابواب ہیں، ان دینی مدارس نے بھی بادشاہوں اور حکومتوں کے سایہ سے دور رہ کر خوشی ومسرت، پریشانی وتنگ دامانی کی حالت میں بھی قناعت پسندی کے ساتھ دین وایمان کی ہمیشہ سے مخلصانہ صیانت وحفاظت کی ہیں، شہری سہولیات سے دور اور صبر آزما حالات میں بھی دین کے ان قلعوں سے مسلمانوں کے عقائد واعمال کی حفاظت ہوتی رہی ہے، ان کی دعوتی محنتیں، مختلف موضوعات اسلامی پر ان کے تصنیفی کارنامے اور علوم شریعت اسلامی پر کئے جانے والے دشمنان اسلام کے بیجا اعتراضات کا مسکت جواب اور اعلاء کلمۂ حق جیسے امور کو انہوں نے اپنا فرض منصبی بنایا، و لیظھرہ علی الدین کلہ جو بعثت نبوی کا مقصد ہے اس کار نبوت میں مصروف ہے۔

دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں انہیں مقاصد کے پیش نظر ایسی کتابیں شامل کی گئیں، جس کی روشنی میں شریعت پر چلنا آسان ہو اور جن کی تعلیم سے طلباء میں اشاعت اسلام اور حفاظت اسلام کا حوصلہ اور جذبہ صادق پیدا ہو سکے، چنانچہ اس حقیقت سے کوئی بھی صاحب عقل شخص انکار نہیں کرسکتا کہ دینی مدارس نے ملک کو با اخلاق باکردار امن پسند، غم گسار، حق پرست،

ایماندار، اور اخلاق کریمانہ اور صفات مومنانہ سے مزین ایسے لاکھوں شہری پیدا کرتے رہے ہیں کہ ملک کے دوسرے تعلیمی ادارے اور جامعات کسی بھی درجے میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے، ابتداء میں دینی مدارس کے طریقہ تعلیم میں خصوصی تربیت کا طریقہ رائج تھا جس میں کوئی صاحب علم شخصیت اپنے تلامذہ کو مختلف علوم وفنون کی وہ تمام اہم کتب کا درس دیتے جو اسے قرآن وسنت کے فہم میں معاون ہوتیں، اس طرح ایسا طالب علم کسی ایک اِستاذ سے کسب فیض کرکے اگر ضرورت محسوس کرتا پھر کسی دوسرے فن کے ماہر کے پاس زانوئے تلمذ تہ کرتا، مگر وقت کی تبدیلی کے ساتھ یہ طریقہ بھی بدلتا گیا۔ اور طلبہ کی کثرت کے پیش نظر بڑے بڑے مراکز قائم ہوئے، اور کلاس سسٹم کے نظام کو اہل مدارس نے اپنایا اس نظام تعلیم کے نتیجہ میں دینی مدارس کا نصاب تعلیم آٹھ دس سال پر مشتمل تیار کیا گیا، پھر مختلف فنونْ کے ماہرین اپنے فن سے متعلق کتابوں کا درس دینے لگے، آج کل مدارس میں یہی طریقۂ تعلیم رائج ہے، ان دونوں نظام تعلیم میں ایک بنیادی فرق ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ پہلے اساتذہ کرام کی تعداد کم ہوتی تھی، جو صاحب علم اپنے فن میں تجربہ کی صلاحیت سے مالا مال ہوتے وہی درس وتدریس کے مشغلہ کو اپناتے اور طلبہ بھی ان ہی سے شرف تلمذ حاصل کرتے، ظاہر ہے ایسے صاحب علم حضرات جنہوں نے درس وتدریس کی دنیا میں اچھا خاصا وقت گزارا ہو، اس راہ کے نشیب وفراز سے اچھی طرح واقف ہوں، طلبہ کے نفسیات سے واقفیت، کتابوں کا طریقۂ تدریس اور افہام وتفہیم کا ان کے اندر بہترین ملکہ ہو ایسے تجربہ کار حضرات سے استفادہ یقیناً انتہائی نفع بخش اور فائدہ مند رہا ہے اور آج بھی ہے۔

مگر آج کے حالات یکسر بدل گئے ہیں، دینی مدارس سے ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں طلبہ سند فضیلت حاصل کرکے مختلف عملی میدان کے ساتھ ساتھ درس وتدریس کے مشغلہ کو اپناتے ہیں، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یقیناً ان کے اندر عربی زبان کی سوجھ بوجھ پیدا ہوجاتی ہے۔ عربی عبارتوں کا وہ ترجمہ بھی کرسکتے ہیں، آیات قرآنی اور احادیث مبارکہ کی تشریح

بھی کر سکتے ہیں کتب فقہ سے مراجعت کے بعد وہ لوگوں کو دینی وشرعی مسائل سے آگاہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں، اصول حدیث، اور اصول فقہ کے بنیادی مباحث بھی ان کے ذہن میں محفوظ رہتے ہیں مگر کیا درس وتدریس کے لئے ان کے اندر ان علمی صلاحیتوں کا پایا جانا کافی ہے، کیا یہ صلاحیتیں انہیں ان کی درس وتدریس والی زندگی کے لئے مکمل طور پر رہنمائی کرسکتی ہیں؟

اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو جواب نفی میں ملے گا کیونکہ ایسا شخص تو باصلاحیت مفسر، باکمال محدث، ممتاز فقیہ بن سکتا ہے، مگر ایک کامیاب مدرس بننے میں انہیں کچھ دیر لگے گی، درس وتدریس کے جوارکان ہیں جن میں خاص طور پر استاد کے اندر اس فن پر دسترس طلبہ کی نفسیات سے واقفیت، موضوع کو سہل اور عام فہم انداز میں طلبہ کے سامنے پیش کرنا اور اسے طلبہ کے ذہن میں بیٹھا دینا، مشکل موضوعات کو آسان سے آسان تر بنا کر پیش کرنا، تعلیمی ماحول اور درسگاہ کی رعایت، وسائل تعلیم سے استفادہ وغیرہ۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے ایک باکمال استاد کا متصف ہونا ضروری ہے، اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے فارغین اور فضلاء ان امور سے اکثر ناواقف ہوتے ہیں، ایک باکمال استاد کے لئے ماہرین فن کے مطابق کن صفات سے مزین ہونا ضروری ہے؟ اس سلسلہ میں بعض ماہرین تعلیم نے اساتذہ کے مطلوبہ صفات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے بعض صفات کا تعلق خود استاد کی ذات سے ہے، اور بعض کا تعلق مشغلہ تدریس سے ہے، استاد کی ذات سے متعلق چند اہم صفات ہیں، جس کا ذیل میں تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱- مشغلہ درس وتدریس سے اسے غیر معمولی محبت ہو، اور وہ اسے نہایت دلچسپی اور شوق ولگن سے ادا کرتا ہو۔

۲- اس کی شخصیت متوازن ہو، کب نرمی کا مظاہرہ کرنا ہے اور کب سختی سے طلبہ سے پیش آنا ہے ان مواقع سے خوب واقف ہو جیسا کہ آیت کا اشارہ ہے **"الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس واللہ یحب المحسنین"** (آل عمران) اور حضور ﷺ سے اللہ کا

خصوصی انعام یہی ہے "فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لانفضوا من حولك"۔

۳-جسمانی لحاظ سے صحت مند ہو۔

۴-نفسانی لحاظ سے انفعالی صورت حال سے دوچار نہ ہو۔

۵-ظاہری نظافت کا اہتمام، خاص طور پر علم کتاب وسنت کے اساتذہ کرام کے لئے اس کا اہتمام اور بھی ضروری ہے۔

۶-فصاحت بیانی، صاف گفتگو، واضح آواز، انداز بیان کی شگفتگی، لہجہ کی خوبصورتی کی صفات سے متصف ہونا بھی ایک اہم صفت ہے۔

۷-ذہانت وتیقظ کے ساتھ تدریسی مشکلات کو اپنے مطالعہ سے بخوبی حل کرنے کی استعداد ہو۔

۸-فن پر مکمل عبور ہو، اس لئے کہ اساتذہ کی غلطی طلبہ میں ان کے بارے میں عقیدت کی کمی کو پیدا کرتی ہے۔ اور دھیرے دھیرے ایسے کلاس میں طلبہ کی حاضری کم ہونے لگتی ہے۔

۹-"كلم الناس على قدر عقولهم" کی روشنی میں موضوع کے اہم اور اساسی مواد کو نوٹ کرانا، غیر ضروری مباحث سے احتراز اور تمامی وہ اقوال جو شروحات میں ہوں سبھوں کے بیان سے اجتناب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اہم اور ضروری مواد ذہن سے نکل جاتے ہیں اور صرف ضمنی نکات اور اقوال یاد رہتے ہیں اور اس طرح موضوع تشنہ رہ جاتا ہے۔

۱۰-وسعت مطالعہ، خاص طور پر دور جدید کے حالات سے واقفیت۔

۱۱-اوقات درس کی پوری پابندی اور مدرسہ کے قوانین کا پورا احترام۔

عمل تدریس سے متعلق حضرات کے لئے کچھ ضروری امور کی رعایت

۱-طلبہ کے عزت نفس کا پاس ولحاظ، اس کے حقوق کی ادائیگی نیز اس کی ضروریات کی

رعایت کرنا۔

۲- درسگاہوں کو منظم کرنا اور اس کے لئے ضروری آلات ووسائل تعلیم سے اسے مزین کرنا

۳-طلبہ کو آپس میں گفتگو کا موقع فراہم کرنا تا کہ وہ اپنی غلطیوں کی آپسی گفتگو سے اصلاح کرسکیں درسگاہ میں طلبہ کو سوالات کرنے پر ابھارنا۔ معقول سوال کی تحسین کرتے ہوئے اس کا جواب اسی وقت یا دوسرے وقت دینا۔

۴- مدرسہ کی مختلف انجمنوں اور پروگراموں میں شرکت کے لئے طلبہ کو متوجہ کرنا اور اس کے لئے مختلف عنوانات بتانا اور اس موضوع کے لئے رہنما مستند کتابوں کی نشاندہی کرنا۔

۵-نامناسب امور کے بارے میں طلبہ کو اچھے تعامل کا مظاہرہ کر کے سمجھانا۔

۶-صرف نظری تعلیم پر اکتفانہ کرنا بلکہ اس کے ساتھ عصری تقاضا کے مطابق اسے عملی انداز میں پیش کرنا۔

۷-طلبہ میں دوران درس نشاط اور دلچسپی پیدا کرنے کے لئے حکیمانہ پاکیزہ لطائف کرنا۔

۸-طلبہ کے کاموں اور ان کی صلاحیتوں کی قدر کر کے ان کے اندر ترقی اور آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کرنا۔ اس کے لئے اچھے جوائز علمیہ اور تشجیعی انعامات دے کر حوصلہ افزائی کرنا۔ ظاہر ہے کہ ان صفات سے مزین ہونے کے لیے پہلے ضروری ہے کہ استاد خود ان صفات سے واقف ہوں۔ ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جس طرح پڑھنا ایک فن ہے، اور بغیر سیکھے کوئی کچھ پڑھ لکھ نہیں سکتا ہے اسی طرح پڑھانا بھی ایک فن ہے اس کی تربیت حاصل کئے بغیر اس راہ میں قدم بڑھانا مشکل امر ہے، درس وتدریس کے تربیت یافتہ اساتذہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اساتذہ کرام اپنی بات کو کم وقت اور سہل الفاظ میں طالب علموں تک پہونچا سکتے ہیں، اور غیر تربیت یافتہ اساتذہ کرام کے مقابلہ میں بہت جلد ایسے اساتذہ طلبہ کے

لئے زیادہ فائدہ منداور کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔

انسانی معاشرہ میں تربیت کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا انسان پیدائش سے لے کر وفات تک زندگی کے مختلف مرحلوں اور شعبہ جات میں تربیت کا محتاج ہوتا ہے، دنیاوی امور کے ساتھ ساتھ دینی امور میں بھی تربیت حاصل کئے بغیر انسان خدااور رسول کو نہیں پہچان سکتا، نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی کی اہم حیثیت مربی اعظم کی ہے، قرآن کریم نے منصب نبوت کا ایک اہم فریضہ تربیت سازی کا بتایا ہے "ویز کیھم (الجمعه)" امام بخاری علیہ الرحمہ نے کتاب العلم کے باب نمبر ۱۲ر کے ذیل میں "کونوا ربانیین" کے ذیل میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول نقل فرمایا ہے کہ "کونوا حلماء فقهاء علماء الربانی الذی یربی الناس بصغار العلم قبل کباره" آیت قرآنی "کونوا ربانیین" کی تفسیر کرتے ہوئے یہ لکھتے ہیں کہ ربانیین سے مراد ایسے لوگ ہیں جو لوگوں کو ابتدائی تعلیم وتربیت دیتے ہیں "الذی یعلم الناس صغار العلم قبل کباره" تاریخ وسیر آپ ﷺ کی صحابہ کرام کی تربیت کے واقعات سے پُر ہیں آپ نے حضرت موسیٰ اشعریؓ کو اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو جب قاضی اور عامل (زکوٰۃ کی وصولی کے لئے) روانہ فرمایا تو آپ نے پہلے ان صحابہ کرام کی تربیت فرمائی۔

آپ ﷺ کی تربیت ہی کا ایک پہلو وہ ہے جس میں آپؐ نے تعلیم کی اہمیت وضرورت بیان کرتے ہوئے طالب علم کی فضیلت ارشاد فرمائی کہ جو شخص علم دین کے حصول کے لئے راستہ میں نکلے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرمادیں گے (مسلم شریف) اسی طرح تربیت کی ضرورت پر حدیث شریف کے اس واقعہ سے روشنی پڑتی ہے جس میں آپؐ نے افعال نماز کی تربیت ایک شخص کو دی، آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو سوالات کرنے کی تربیت دی اور اس پر ابھارا، اور فرمایا کہ علمی پیاس کی سیرابی تو سوال کرنے سے ہوتی ہے، اسی طرح آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو اخذ واستنباط کی تربیت دی، جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ

کرام سے ایک ایسے درخت کے بارے میں دریافت فرمایا کہ جس کا پتہ نہیں گرتا، اور اس کی مثال ایک مومن کی طرح ہے، آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو علمی مناقشہ اور اصل مرجع کی طرف رجوع ہونے کی تربیت فرمائی، حضرت عائشہؓ کے بارے میں آتا ہے کہ انہیں کسی شرعی مسئلہ کے بارے میں کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی، یا کوئی اشکال ہوتا تو فوراً رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع ہوتیں۔

آپ ﷺ نے جہاں اجتماعی تربیت سازی فرمائی ہے، وہیں انفرادی طور پر آپ نے صحابہ کرامؓ کی تربیت کی ہے اس لئے ہمیں احادیث کی کتابوں میں بہت سے واقعات جمع کے صیغے سے ملتے ہیں مثلاً: "کنا نسمع" اور جب کے بہت سے واقعات واحد کے صیغہ سے ملتے ہیں جیسے: "علمنی رسول اللہ ﷺ" تعلیم وتربیت کے باب میں ایک اہم بات یہ ہے کہ جب کسی اہم موضوع کے بارے میں بتانا ہو تو اس سے پہلے موضوع سے متعلق کچھ ایسے کلمات کہے جائیں جس سے مخاطب اور سامعین کے دل میں شوق ورغبت پیدا ہونے لگے جیسے رسول اللہ ﷺ نے غیبت کی شناعت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "اتدرون ما الغیبة"۔

درس وتدریس میں اپنی بات کو طلبہ کے ذہن سے قریب کرنے کے لئے عصری آلات ووسائل تعلیم کا استعمال نہایت مفید ثابت ہوتا ہے اس کی مثال خود سنت نبویؐ میں ملتی ہے، بعض دفعہ آپ نے انگلی کے اشارے سے بہت سی باتوں کو سمجھایا ہے، مثلاً آپ نے یتیم کی کفالت کرنے والے شخص کے بارے میں دو انگلیوں کے اشاروں سے سمجھایا کہ جس طرح یہ دونوں انگلیاں آپس میں قریب ہیں اسی طرح یتیم کی کفالت کرنے والا اور میں جنت میں قریب ہوں گے (یتیم کے بارے میں ہاتھ سے اشارہ کرکے بتایا) ان سب کے ساتھ تربیت سے متعلق ایک اہم اصول یہ ہے کہ ہر وقت بچوں کے ذہن پر تعلیم کا بوجھ نہ دیا جائے، بلکہ انہیں آرام کھیل، کود اور ذہنی تفریح کا بھی کچھ موقع دینا چاہئے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری سستی وکاہلی کے خوف سے ہمیں وقفہ وقفہ سے نصیحت فرماتے تھے "عن

ابن مسعودؓ قال کان النبی ﷺ یتخولنا بالموعظة فی الایام کراھیة السآمة علینا" (کتاب العلم ص ٦٨)۔

یہ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں صحابہ کرامؓ کی تربیت کے چند نمونے ذکر کئے گئے ہیں ورنہ آپ ﷺ کا فرض منصبی ہی ایک ایسے گروہ کی تربیت تھی جو اسلامی علوم اور اسلامی اخلاق میں ایک مثالی قیادت کا کردار ادا کرسکیں، آج اگر ہم اس پہلو سے دینی مدارس کے اساتذہ پر غور کریں تو بہت حد تک مایوسی نظر آتی ہے، بہت سے اساتذہ طلبہ کی نفسیات اور ان کی ذہنی سطح کا لحاظ کئے بغیر دینی مدارس میں پڑھائی جانے والی کتابیں اور مختلف فنون خاص طور پر اس کی حاجت رکھتے ہیں کہ ان کی تدریس سے پہلے اس فن کے طریقۂ تدریس اور عمومی اصول وقواعد تدریس سے ضروری واقفیت حاصل کی جائے اور طلبہ کو مانوس بنایا جائے۔

قرآن وحدیث کے صحیح فہم کے لئے ضروری ہے کہ پہلے عربی کے قواعد واصول سے آدمی پوری طرح باخبر ہو، اس لئے دینی مدارس میں عربی گرامر (قواعد) نحو وصرف پر خاص طور پر توجہ دی جاتی ہے، مگر اس فن کے طریقہ تدریس میں حیرت انگیز طور پر وہی اختیار کیا جاتا ہے، جو عربی ادب کی تدریس میں برتا جاتا ہے، جب کہ کسی فن کے قواعد کی تدریس کا طریقہ بالکل جداگانہ ہوتا ہے، نحو وصرف کی تدریس میں عملی مشق، اور اس کی تفہیم کے لئے بلیک بورڈ کا استعمال نہایت ضروری امر ہے، اس فن کی تدریس میں مختلف قواعد کو زیادہ سے زیادہ مثالوں سے واضح کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، جسے صرف زبان سے بیان کردینے سے بات نہ ہی تو طلبہ کے سامنے واضح ہو پاتی ہے، اور نہ ہی ان کے ذہن تک پہونچ پاتی ہے، اس لئے اساتذہ بورڈ کا استعمال کریں تو یہ مثالیں طلبہ کی نگاہوں سے گزرتے ہوئے ان کے دماغ تک پہونچیں گی۔ جس سے طلبہ ان مثالوں کو اپنے ذہن میں محفوظ کرسکتے ہیں، یہی حال اصول فقہ، اصول حدیث اور اصول تفسیر کی تدریس کا ہے کہ صرف ان قواعد کا ترجمہ پڑھا دینا کافی نہیں بلکہ مختلف مثالوں پر اس کی تطبیق

ضروری ہے۔

عام طور پر ہمارے مدارس میں کتب حدیث کو کتب فقہ سمجھ کر پڑھایا جاتا ہے، احادیث احکام کی تشریح میں فقہاء کے اختلاف ان کے دلائل وجہ ترجیح وغیرہ پر اتنی لمبی بحث کی جاتی ہے کہ اصل فن حدیث کی حیثیت ثانوی درجہ کی ہو جاتی ہے، حالانکہ اگر کتب حدیث کی تدریس میں علم حدیث سے متعلق مباحث کو بیان کیا جاتا ہے تو طلبہ میں علم حدیث کا ذوق بھی پیدا ہوگا اور وہ اس فن کے عمق سے بھی واقف ہوں گے، اسی طرح میراث کے فن کی تدریس میں کتاب میں مذکورہ مثالوں پر اکتفاء کرنا ناکافی ہوتا ہے، جب کہ بلیک بورڈ پر مختلف مثالوں سے ورثاء کے حصوں کی تفصیل نہ ذکر کر دی جائے۔

ظاہر ہے طریقہ تدریس کے اس نہج سے واقفیت اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ اساتذہ کو ان امور کی تربیت نہ دی جائے اس پس منظر میں تربیت اساتذہ کے سلسلہ میں چند اہم باتوں کا ذکر کر دینا مناسب ہے۔

۱- جو اساتذہ کرام چند سالوں سے درس و تدریس کے مشغلہ سے جڑے ہیں، ان کے لئے مختلف فنون کے ماہرین تدریس سے محاضرات اور خطابات اور لکچر کی خواہش کی جائے۔

۲- نئے فضلاء کرام میں جو حضرات درس و تدریس کو اپنا میدان عمل بنانا چاہیں، ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ عملی میدان میں قدم رکھنے سے قبل درس و تدریس کی کم از کم یک سالہ یا اس سے بھی قلیل المدۃ کورس کریں۔

۳- ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں دینی مدارس کے فضلاء کے لئے تربیت المعلمین کے کورس کے لئے ایک ادارہ کا قیام عمل میں لایا جائے، اس لئے ملک بھر کے ممتاز علماء کرام کی میٹنگ رکھی جائے، تاکہ تربیت سازی کے لئے ایک متفقہ اصول وقواعد تیار کئے جائیں اور پورے ملک میں اس تربیت کے نظام کو جاری کیا جائے، اس ادارہ میں خاص طور پر ہر فن کے

لئے طریقہ تدریس کی عملی مشق اساتذہ کو دی جائے، ساتھ میں تدریس کے عمومی اصول وقواعد سے بھی اساتذہ کو واقف کرایا جائے۔

۴-تربیت سازی کے لئے مختلف فنون کے ماہرین علماء کرام سے خاص طور پر استفادہ کیا جائے۔

۵-جدید علوم کے ماہرین سے بھی اس سلسلہ میں مدد لیا جائے کیونکہ تدریس کے باب میں جو مسائل عصری اور دینی مدارس کے مشترکہ ہیں ان چیزوں کے بارے میں عصری درسگاہوں سے مربوط حضرات یقیناً مفید مشورے دے سکتے ہیں۔

۶-ہندوستان کے وہ بڑے مدارس جہاں تخصصات کے شعبے قائم ہیں وہاں ایک شعبہ تربیت اساتذہ کا بھی قائم کیا جائے۔

۷-اساتذہ کی تربیت سے مراد صرف انہیں مختلف فنون کے طریقہ تدریس سے واقف کرانا ہی نہیں ہے، بلکہ تربیت کا دائرہ کار بہت وسیع ہے، جس میں ان کی علمی تربیت، فکری تربیت، اخلاقی تربیت دعوتی وتحریری تربیت بھی شامل ہے، ظاہر ہے تربیت کے ان مختلف امور میں اسی فن کے ماہرین سے استفادہ کر کے بھی صحیح سمت میں تربیت سازی کا کام جاری رہ سکتا ہے۔

☆☆☆

طلبہ کی تقریری وتحریری صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کا طریقہ

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی

زبان وبیان، اور قرطاس وقلم کی اہمیت محتاج اظہار نہیں، رب کائنات نے خود پہلی وحی میں تخلیق انسانی کے بعد قلم کا تذکرہ کرکے انسانی زندگی میں اس کی حیثیت کی وضاحت کردی ہے، اور اس کے نام سے اپنی پاک کتاب میں ایک مکمل سورہ نازل کرکے اور اس کی قسم کھاکر اس کی عظمت ورفعت کو لازوال کردیا ہے، **ن والقلم ومایسطرون** اور اس کے آخری پیامبر کا ارشاد ہے:

ان اول ما خلق الله القلم (سنن ابی داؤد ۴۷۰۰: وصححه الانبانی، ط مکتبہ المعارف، الریاض سنن ترمذی ۳۳۱۹، ۲۱۵۵)۔

اللہ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا۔

اس لئے زندگی کی دوڑ میں وہی قومیں آگے بڑھتی ہیں جنہیں قلم کی حیثیت اور اولیت کا اندازہ ہے اور اسی کے مطابق ان کا عمل ہے۔

''اور امام تفسیر مجاہد نے ابوعمرو سے نقل کیا ہے کہ اللہ رب العزت نے ساری کائنات میں چار چیزیں اپنے دست قدرت سے خود بنائی اور ان کے سوا باقی مخلوقات کے لئے حکم دیا گیا

☆ جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ

"کن" یعنی ہوجا، وہ موجود ہوگئیں، یہ چار چیزیں یہ ہیں، قلم، عرش، جنت عدن، آدم علیہ السلام"
(معارف القرآن ۸ر ۵۸۵)۔

اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے سورہ رحمان میں تخلیق انسانی کے بعد خصوصی طور پر اس کی قوت بیان کا تذکرہ فرمایا ہے:

الرحمن، علم القرآن: خلق الانسان وعلمه البيان (سورۃ الرحمٰن ر۱، ۲، ۳، ۴)۔
رحمان ہی نے قرآن کی تعلیم دی اس نے انسان کو پیدا کیا اور دل کی بات کو ظاہر کرنا سکھلایا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں وہ بے شمار ہیں، ان میں سے خاص طور سے تعلیم بیان کو یہاں ذکر کرنے کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ جن نعمتوں کا تعلق انسان کی نشو ونما اور وجود و بقا سے ہے، جیسے کھانا، پینا، سردی اور گرمی سے بچنے کا سامان، رہنے بسنے انتظام وغیرہ، ان نعمتوں میں ہر جاندار شریک ہے، وہ نعمتیں جو انسان کے ساتھ خاص ہیں، ان میں سے پہلے تو "تعلیم قرآن" کو بیان کیا گیا، اور اس کے بعد "تعلیم بیان" کو، کیونکہ تعلیم قرآن سے فائدہ اٹھانا اور فائدہ پہونچانا بیان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور بیان میں زبانی بیان بھی داخل ہے اور تحریر و کتابت نیز سمجھنے اور سمجھانے کے جتنے طریقے ہیں وہ سب بیان کے مفہوم میں شامل ہیں (دیکھئے معارف القرآن ۸ر ۲۴۴)۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن اپنی تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور زبان سے بھی۔

فمن جاهدهم بيده فهو مومن ومن جاهدهم بلسانه فهو مومن (صحیح مسلم ۱ر ۷۰ کتاب الایمان: باب کون النہی عن المنکر من الایمان)۔

جو ان سے اپنے ہاتھ کے ذریعہ جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو زبان کے ذریعہ جہاد کرے وہ مومن ہے۔

سئل ای الجهاد افضل فقال کلمة حق عند سلطان جائر۔

اللہ کے رسول سے دریافت کیا گیا کہ بہتر جہاد کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ظالم حکمراں کے سامنے حق بات کہنا (رواہ احمد والنسائی، وقال المنذری اسنادہ صحیح التیسیر للمناری ۱/۱۸۲)۔

حضرت انس سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

جاهدوا المشركين باموالكم وانفسكم والسنتكم (رواہ احمد وابوداؤد والنسائی والحاکم وصححه واقرہ الذهبی التیسیر ۱/۴۸۵)۔

مشرکوں سے مال، جان اور زبان کے ذریعہ جہاد کرو۔

حضرت حسان بن ثابتؓ اپنے اشعار کے ذریعہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مشرکوں کی طرف سے کئے گئے بے ہودہ اعتراض کا جواب دیا کرتے تھے، نیز آگے بڑھ کران پر حملہ کیا کرتے تھے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اشعار کے سلسلہ میں فرمایا یہ ان پر تیروں کی بوچھار سے زیادہ سخت ہیں، **فانه اشد عليها من رشق النبل** (صحیح مسلم/۱۵۰۸، طبیت الافکار الدولیۃ)۔

اس کی اثر انگیزی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان من البيان لسحراً

بہت سے بیان جادو کی طرح ہوتے ہیں۔

زبان وقلم کے ذریعہ دلوں پہ حکومت کی جاتی ہے، اس کے ذریعہ تیغ وتفنگ کے بغیر قوموں اور ملکوں کی تاریخ بدل دی جاتی ہے، تاریخ کے دھارے کو موڑ دینے میں ان کا کردار عسکری انقلابات سے زیادہ ہے، ان میں وہ طاقت ہے جو بڑی بڑی سلطنتوں اور فلک بوس ایوانوں میں زلزلہ برپا کردیتی ہے۔

فرق یہ ہے کہ تقریر سے پڑھا، لکھا، ان پڑھ ہر شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس کے ساتھ ہی بولنے والے کی حرکات وسکنات، چہرے کی کیفیت، لب ولہجہ اور طرز تخاطب بھی مخاطب پر اثر

انداز ہوتا ہے-اور تحریر کی رسائی حاضر سے غائب تک ہے،صدیوں بلکہ رہتی دنیا تک اس کا فائدہ باقی رہ سکتا ہے،قلم، بظاہر خاموش رہتے ہوئے بھی بلاغت کے موتی بکھیرتا ہے اور فصاحت کے جادو جگاتا ہے۔

یہ دونوں چیزیں اللہ کی امانت اور انمول تحفہ ہیں،لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کو اس امانت کی حقیقت کا احساس ہے، کتنے ہی لوگ ہیں جو زبان وقلم کے دھنی ہیں لیکن انھوں نے اس کی عظمت کو گہن لگایا ہے، اس کی حرمت کو پامال کیا ہے، روشن خیالی اور آزادی کے نام پر بے حیائی، بدچلنی اور برائی پھیلانے کی کوشش کی ہے۔

غرضیکہ یہ ایک دودھاری تلوار کی طرح ہے جو صحیح ہاتھوں میں ہو تو ظلم وجور اور بے حیائی کا صفایا کرتی ہے اور غلط ہاتھوں میں ہو تو تباہی اور بربادی کے خیمے گاڑ دیتی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اسلامی مزاج اور اسلامی علم رکھنے والے نوجوان اس امانت کو سنبھالیں، معاشرہ سے برائی کا خاتمہ ہو اور بھلائی کو پنپنے اور پھیلنے کا موقع ملے۔

تقریر وتحریر کے عناصر

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر انسان کے اندر تقریر وتحریر کی صلاحیت رکھی ہے،بس کوشش اور محنت کے ذریعہ اس صلاحیت کو فروغ دینے کی ضرورت ہے، ہر چیز شروع میں مشکل معلوم ہوتی ہے اور سیکھ لینے کے بعد اس درجہ آسان معلوم ہوتی ہے کہ گویا اس کے لئے کسی محنت ومشقت کی ضرورت ہی نہیں ہے، ایک بچے کے لئے حرف شناسی کس درجہ مصیبت ہے؟ لیکن شعور کی عمر میں اس سے زیادہ آسان کوئی اور چیز نظر نہیں آتی ہے۔

۱-زبان دانی

تقریر اور تحریر دونوں کے لئے سب سے اہم چیز زبان دانی ہے، ایک خطیب اور قلم کار

کے لئے یہ اسی طرح سے ضروری ہے جیسے کہ زندگی کے لئے ہوا اور پانی، زبان پر مکمل دسترس اور اس کے قواعد وضوابط سے آگاہی کے بغیر مطالعے اور مشاہدے کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا میں جتنے بھی نبی اور رسول بھیجے ہیں وہ سب زبان دانی اور شیریں بیانی میں تمام لوگوں پر فائق تھے، سب سے اول اور ہر ایک سے بہتر خطیب انبیاء کرام تھے، اوران پر جو کتاب نازل کی جاتی تھی وہ زبان وادب کا شاہکار ہوتی تھی۔

آخری کتاب قرآن مجید، فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے بے مثال ہے، اور جس ہستی پر اسے نازل کیا گیا وہ اپنے اخلاق وکردار کی طرح زبان وبیان کے بلند مرتبہ پر فائز تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے متعلق خود کہا کرتے تھے کہ میں عربوں میں سب سے زیادہ فصیح ہوں۔

عربوں میں زبان سیکھنے کے لئے اس درجہ اہتمام تھا کہ وہ اس کے لئے اپنے شیر خوار بچے کو خود سے جدا کرلینا گوارا کرلیتے، اور انہیں پرورش کے لئے دیہات بھیج دیتے تاکہ وہاں کی خالص عربی زبان سیکھ سکیں، کہا جاتا ہے کہ خلفاء بنوامیہ میں سے ولید کو کسی وجہ سے دیہات میں پرورش کے لئے بھیجا نہ جاسکا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ صحیح عربی نہیں بول سکتا تھا۔

دعوت وتبلیغ اور اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لئے شیریں بیانی، دلکشی اور روانی وراثت نبوی ہے، اور انبیاء کے وارثوں کو کتاب الٰہی میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ معرکۂ خیر وشر میں، بہتر سے بہتر اسلوب کے ذریعہ دلوں کو جیتنے کی کوشش کریں۔

وجادلھم بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم۔

اور بہتر طریقہ سے ان سے مباحثہ کرو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس شخص سے تمہاری دشمنی ہوگی بہتر اسلوب کی وجہ سے وہ تمہارا دلی دوست ہو جائے گا۔

نیز اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

وقولوا للناس حسناً (اور لوگوں سے اچھی بات کہو)۔

۲-مطالعہ اور مشاہدہ

ایک مقرر اور قلم کار کے لئے زبان دانی کے بعد دوسری اہم چیز مطالعہ اور مشاہدہ ہے کہ اس کے بغیر نہ تو وہ اپنے فن کے ساتھ انصاف کرسکتا ہے، اور نہ دوسروں کو کوئی فائدہ پہونچا سکتا ہے۔

مطالعہ کے لئے کتاب وسنت کے ساتھ تاریخ بھی پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ یہ تینوں چیزیں ایک مسلم مقرر اور خطیب کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں، ایک مقرر اور قلم کار کے لئے کتاب الٰہی اور سنت نبوی سے آگاہی کس درجہ ضروری ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے، اور تاریخ کے ذریعہ قوموں کے عروج وزوال سے واقفیت حاصل ہوتی ہے، انسانی تجربوں کا علم ہوتا ہے، جس کے ذریعہ خیالات میں وسعت اور شعور میں پختگی آتی ہے، اور موجودہ حالات کو سمجھنے اور مسائل کو حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔

۳-مشق وتمرین

تیسری اہم چیز مشق وتمرین ہے کہ اس کے بغیر زبان وبیان پر قدرت، مطالعہ اور مشاہدہ کی وسعت بے معنی ہے کہ مشق نہ ہونے کی وجہ سے جب کسی مجمع میں بولنے کی نوبت آتی ہے تو گھبراہٹ طاری ہوجاتی ہے، خوف وہراس کی وجہ سے زبان بند ہوجاتی ہے، اس لئے مشاقی ازحد ضروری ہے۔

مشق کے دوران صحیح تلفظ، لب ولہجہ میں اتار چڑھاؤ، نیز ایسے حرکات وسکنات پر خصوصی توجہ ضروری ہے کہ یہ چیزیں بھی سامعین پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

مضمون کی رعایت سے نرم وگرم ہونا اور موقع کے لحاظ سے مسرت یا غم آگیں اسلوب اختیار کرنا اور ہر حال میں سنجیدگی کا دامن تھامے رہنا بھی لازمی ہے۔

۴-اخلاص اور حسن اخلاق

ان سب کے ساتھ ایک خطیب اور قلم کار کے لئے ان سب سے اہم اور ضروری چیز ہے، اس کا کردار اور اخلاص، کہ اس کے بغیر نہ تو زبان دانی سے کچھ حاصل ہے اور نہ کثرت مطالعہ اور مشاہدہ کا کوئی فائدہ ہے، اس لئے کہ

آدمی سنتا نہیں آدمی کی باتوں کو
پیکر عمل ہوکر غیب کی صدا بن جا

تجاویز اور مشورے

۱-ہر طالب علم کو خطیب اور قلم کار بنانے کی بجائے ایسے طلبہ کا انتخاب کیا جائے جنہیں تحریر وتقریر سے مناسبت ہو

۲-ان کے معیار کے مطابق ادبی، تاریخی اور سیرت کی کتابوں کا نظم کیا جائے

۳-مشہور قلم کاروں کی کتابوں کا خلاصہ تیار کرایا جائے

۴-مشہور خطیبوں کی کتابوں، نیز ان کی آڈیو اور ویڈیو کیسٹ کے ذریعہ خطیبانہ انداز کی مشق کرائی جائے۔

۵-رسائل وجرائد اور اخبارات کا مطالعہ کر دیا جائے

۶-ان کے درمیان مقابلہ کرایا جائے اور تشجیعی انعامات رکھے جائیں

۷-کسی خاص علاقہ، جگہ، یا ضلعی سطح کی انجمن بنانے کی حوصلہ شکنی کی جائے کہ اس کی وجہ سے تعصب اور علاقائیت کو پنپنے کا موقع ملتا ہے، بلکہ مخلوط انجمنوں کا قیام روبہ عمل لایا جائے۔

۸-مدارس میں تحریر وتقریر سیکھنے کے لئے جو طریقہ رائج ہے اسے مثال اور کارگر بنایا جائے۔

☆☆☆

علم کی اہمیت وضرورت

مولانا انیس الرحمٰن قاسمی☆

”یرفع الله الذین آمنوا منکم والذین أوتوا العلم درجات والله بما تعملون خبیر“(سورہ المجادلۃ:۱۱)۔

(جولوگ تم میں سے ایمان لائے اور جولوگ اہل علم ہیں اللہ ان کے درجات بلند کرتا ہے اور جو کچھ تم کررہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے)۔

علم ایک بیش قیمت صفت ہے اور ایسی شئی ہے جو مال و دولت، عزت ومنصب سے بھی قیمتی ہے بلکہ مال ودولت اور عزت ومنصب کے حصول کا ذریعہ بھی ہے اور دنیاوی واخروی آرام وراحت کا سامان بھی، مگر مسلمانوں کے موجودہ ذہنی وفکری سوچ اور سماجی ومعاشرتی رویہ پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عملی طور پر زمین وجائداد، مکان ودکان اور جاہ ومنصب کی جو اہمیت ان کے نزدیک ہے اس سے کمتر اہمیت علم کو حاصل ہے، ہمیں چاہئے کہ مسلمانوں کی اس سوچ کو بدلیں اور ان کے ذہن ودماغ میں یہ بات پیوست کریں کہ علم واخلاق ہی اصل دولت ہے، باقی چیزیں علم ہی کی راہ سے آتی ہیں اور ان کی حیثیت ثانوی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ قرآن نازل کیا جس میں انسانی زندگی کے تمام مرحلوں اور گوشوں کی ہدایت ہے۔ یہ ہدایت ربانی انسان کے لئے ویسے ہی ضروری ہے جیسے زندگی کی بقاء کے لئے ہوا پانی یا کھانا پینا۔ سب سے پہلی بنیادی ضرورت انسان کی یہ ہے کہ وہ اپنے رب کو

☆ ناظم امارت شرعیہ بہار

پہچانے، اس کے حکم کے مطابق اپنی زندگی گزارے تاکہ اس دنیا میں رہے تو صحیح راہ پر رہے۔ اور آخرت میں وہ منزل مقصود کو پائے اس کے لئے ضروری ہے کہ دین کے سمجھنے والے اور قرآن کو پڑھنے والے افراد موجود رہیں، جن کا اخلاق و کردار ٹھیک اسی طرح کا ہو جو قرآن چاہتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی زندگی اس ہدایت ربانی کے مطابق تھی اور آپ ﷺ نمونہ کامل اور اسوۂ حسنہ کے حامل تھے، یہی حالت آپ ﷺ سے دین حاصل کرنے والے صحابہ کی تھی ان کی زندگی قرآن وحدیث کے مطابق تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مؤمنانہ صفات و کردار سے متعلق قرآن کی جتنی آیات نازل ہوئی ہیں ان کا نمونہ صحابہ کرام کی صنف میں موجود ہے، صحابہ کرام نے جس طرح دین حاصل کیا اور رسول ﷺ سے تربیت پائی، اسی نمونے پر ہمارے دینی مدارس ہیں اور ان کو اسی مقصد سے قائم کیا گیا ہے تاکہ وہاں قرآن وحدیث کی تعلیم اسی طرح دی جائے جس طرح صحابہ کرام حاصل کرتے تھے۔

مدارس کے نصاب تعلیم یا طریقہ تعلیم میں جن بنیادی چیزوں کو اہمیت دی گئی ہے وہ مندرجہ ذیل قرآنی ہدایت کے مطابق ہے۔ اللہ جل شانہ نے فرمایا ہے:

"هو الذی بعث فی الأمیین رسولا منهم یتلو علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة"۔

اس آیت کریمہ میں تعلیم وتربیت کے مدارج کو بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ پہلے قرآن کی تعلیم اس طرح ہونی چاہئے کہ مکتب میں طلبہ ناظرہ قرآن پڑھ لیں، یہ تعلیم امت کے ہر فرد کے لئے ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ اسی کے ساتھ اخلاقیات کی تعلیم ہونی چاہئے تاکہ لڑکا یا لڑکی بلوغ کے مرحلہ سے پہلے گناہوں سے دور رہنے کا عادی بن جائے اور اس کے دل ودماغ میں گناہوں کی نفرت راسخ ہو جائے اگر ان دو پہلوؤں پر ہم غور کریں تو مدارس ومکاتب بنیادی طور پر اسی اصول پر جاری ہیں البتہ پوری امت کو جس درجہ کا قرآنی واخلاقی علم اور تزکیہ نفس ہونا چاہئے وہ نہیں ہے۔

آج صورت حال یہ ہے کہ جس قرآن کو سیکھنا فرض قرار دیا گیا ہے، اگر آپ اپنے گھروں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ چند فیصد افراد ہی قرآن صحیح پڑھتے ہیں، باقی اکثر ایسے ہیں جو قرآن پڑھنا یا تو جانتے ہی نہیں ہیں اور اگر جانتے بھی ہیں تو صحیح تلفظ کے ساتھ نہیں پڑھتے۔ اس لئے قرآن سیکھنے اور سیکھانے پر خاص توجہ دی جائے۔ محلوں اور گھروں میں اس کا اہتمام وانتظام ہو اور جو لڑکے، لڑکیاں اسکول وکالج میں پڑھتے ہیں، ان کے لئے گرمی کے موسم اور دیگر تعطیلات میں قرآن اور عربی زبان کی تعلیم کے خصوصی کلاس بنائیں تاکہ وہ قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے والے بن سکیں۔

مدارس بنیادی طور پر اخلاق وروحانیت پر توجہ دیتے ہیں ان کے علاوہ مدارس کے نصاب میں عصری علوم وفنون کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ اس لئے تاکہ پڑھنے والوں کو زندگی کے دوسرے معاملات کی بھی واقفیت ہو سکے جیسے تاریخ، جغرافیہ، حساب یا لسانیات میں اردو، ہندی، انگریزی یا دیگر زبانیں پڑھائی جاتی ہیں اس سے دو طرح کی معلومات حاصل ہوتی ہیں ایک وہ معلومات ہیں جو انسانی زندگی کے لئے کام آنے والی ہیں جیسے سماجی علوم، جغرافیہ وتاریخ یا سائنس۔ دوسری لسانیات جو ہر صوبے اور خطے کے اعتبار سے نصاب میں رکھی گئی ہیں جن سے ہم ہندوستانیوں کو سابقہ پڑتا ہے اور روزمرہ کے کاموں میں استعمال کے علاوہ دعوت وتبلیغ میں مددگار ہوتی ہے جہاں تک مدارس میں عربی زبان کی تعلیم کا معاملہ ہے تو وہ اس لئے کہ وہ قرآن وحدیث کی زبان ہے اور دینی کتابوں کا اصل سرمایہ اسی زبان میں ہے، یہی حال اردو کا ہے جو عام طور پر وسطی ہندوستان میں رہنے والوں کی زبان ہے اور یہ شمال وجنوب اور مشرق ومغرب کے اکثر شہروں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اسی طرح ہندی جو ملک کی قومی زبان ہے۔ فارسی بھی کسی حد تک مدارس میں داخل ہے کیونکہ بہت سی دینی کتابیں فارسی زبان میں ہیں اور اردو سے اس کا گہرا رشتہ ہے۔ اس طرح ہمارے مدارس میں زندگی کی اہمیت اور ضرورت کو

سامنے رکھ کر یہ نصاب بنایا گیا ہے تاکہ دین کے علوم بھی ہمیں حاصل ہوں اور دنیا کی ضروری معلومات بھی بہم پہنچ سکیں۔ اگر مدارس اور دیگر عصری اسکولوں کے مقصد کا موازنہ کریں تو دونوں میں کھلا ہوا فرق نظر آئے گا۔ مدارس کا مقصد ہدایت ربانی کا حصول اور اس کی ترویج واشاعت ہے۔ جب کہ عصری درسگاہوں کا مقصد انسان کے مادی ضرورت کے لئے بنائے ہوئے علوم کی تحصیل ہے۔

ہدایت کے اسی بنیادی مقصد کی وجہ سے اسلام میں دین کی تعلیم کو حاصل کرنا فرض قرار دیا گیا ہے اور یہ فریضہ دو طرح کا ہے۔ بنیادی طور پر ہر مسلمان کو ہدایت ربانی کا اس قدر حصہ حاصل کرنا ضروری ہے جس سے وہ حق اور ناحق کو پہچان سکے حلال اور حرام کو سمجھ سکے، پاکی وناپاکی اور عبادت کے بنیادی مسائل کو جان سکے یہ ہر شخص کے اوپر فرض عین ہے، تعلیم کا دوسرا حصہ فرض کفایہ ہے اور وہ یہ ہے کہ امت کے کچھ افراد دین کے علم میں ایسی مہارت حاصل کریں جس سے اس دین کی حفاظت بھی ہو سکے اور امت کی اصلاح اور عام انسانوں کی رشد وہدایت کا کام بھی وہ کر سکیں۔ پہلے فریضہ کے بارے میں اللہ جل شانہ نے فرمایا ہے:

"اقرأ باسم ربک الذی خلق، خلق الإنسان من علق، اقرأ وربک الأکرم، الذی علم بالقلم، علم الإنسان ما لم یعلم" (سورہ العلق: ۱-۵)۔

(پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے بنایا، بنایا آدمی لہو کی پھٹکی سے، پڑھ اور تیرا رب بڑا اکریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے، سکھایا آدمی کو جو وہ نہ جانتا تھا)۔

اور دوسرے فریضہ کے بارے میں اللہ جل شانہ نے فرمایا ہے:

"فلو لا نفر من کل فرقة طائفة لیتفقهوا فی الدین" (سورہ التوبہ)۔

(اور تم میں ایک جماعت ایسی ہو جو دین میں مہارت حاصل کرے)۔

مدارس کے اسی بنیادی مقصد ونظام کی وجہ سے آج دین محفوظ ہے اور مسلمانوں کے

اندر دین باقی بھی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو اللہ جل شانہ کا یہ حکم تھا کہ اپنے لئے زیادتی علم کی دعا کرتے رہیں:

"قل رب زدنی علماً" (سورہ طٰہٰ:۱۱۴) (اے پروردگار میری علم ودانش میں اضافہ فرما)۔

چناں چہ رسول اکرم ﷺ اپنے لئے برابر اضافۂ علم کی دعا کرتے تھے۔ حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ صبح بیدار ہو کر یہ دعا مانگتے تھے:

''خدایا مجھے علم نافع، رزق حلال اور عمل مقبول عطا فرما''۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کی ایک مناجات یہ بھی تھی:

''اے اللہ اس علم سے تیری پناہ جو نفع نہ پہنچائے، اس دعا سے تیری پناہ جو قبول نہ ہو، اس دل سے تیری پناہ جو نرم نہ ہو، اس نفس سے تیری پناہ جو سیر نہ ہو، اے خدا ان چاروں سے تیری پناہ''۔

رسول اللہ ﷺ کی سنت یہ بتاتی ہے کہ علم کہیں بھی ملے چاہے وہ مسلمان کے پاس ہو، یا غیر مسلم کے پاس اسے حاصل کرنا ہمارے دین کا تقاضا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے مشرک قیدیوں سے مسلمان بچوں کو لکھنا، پڑھنا سکھلایا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

"کلمة الحکمة ضالة المؤمن فحیث وجدها فهو أحق بها" (ترمذی ابواب العلم) (دانائی کی بات مومن کی گمشدہ سامان ہے وہ جہاں اسے پائے اس کو حاصل کرنے کا زیادہ حقدار ہے)۔

علم کی تحصیل میں جدوجہد، صبر واستقامت اور اس سے نہ تھکنا طالب علم کی شان ہونی چاہئے اور اپنے علم کو مفید بنانا، خود فائدہ اٹھانا، اور دوسروں کو فائدہ پہنچانا عالم کی صفت ہونی چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

تقویٰ کی ایک شان یہ بھی ہے کہ جو علم تمہارے پاس ہے، اس کے ذریعہ وہ علم حاصل

کرو جو تمہارے پاس نہیں ہے۔

اگر علم میں اضافہ کا خیال نہ ہو تو یہ علم کا نقص ہے۔ مزید علم کی خواہش نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ آدمی اپنے علم سے فائدہ نہیں اٹھا رہا ہے۔ اپنے علم کو مفید بنانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی علم سکھائے، اس لئے کہ علم کا حصول سب کے لئے ضروری ہے۔ چاہے مرد ہو یا عورت، حضور ﷺ نے ایسے لوگوں کو دعا دی ہے جو خود علم سیکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی سکھا لاتے ہیں:

اللہ اس شخص کو سرخرو کرے جس نے ہم سے کوئی بات سنی، یاد رکھی اور دوسروں کو پہنچادی (ابن ماجہ مقدمہ)۔

آپ ﷺ نے منیٰ میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تھا:

دیکھو جو حاضر ہیں، غیر حاضروں کو یہ سب پہنچا دیں، کیا عجب جنہیں پہنچاؤ گے وہ زیادہ سمجھنے والے ہوں (بخاری باب الخطبہ ایام منیٰ)۔

اس وقت یہ زیادہ ضروری ہے کہ جو لوگ علم رکھتے ہیں وہ ان لوگوں، مردوں، عورتوں اور لڑکے اور لڑکیوں کی بنیادی تعلیم کی فکر کریں، جو بے علمی کی وجہ سے نہ صرف جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں، بلکہ ارتداد کے کنارے کھڑے ہیں۔ لہذا اس وقت ایسے مکاتب کے قیام کی خصوصی ضرورت ہے جو ہر محلہ اور قصبہ میں ہوں اور جہاں مسلمانوں کو دین کے مبادیات سے واقف کرایا جائے، اور ان کے بچوں کو ابتدائی دینی تعلیم دی جائے تاکہ وہ حلال وحرام سے واقف ہوسکیں اور کفر وایمان اور توحید وشرک میں امتیاز کرسکیں۔ خاص طور پر اس کے لئے مساجد کو مرکز بنایا جائے تاکہ یہ مساجد صحیح معنوں میں ہماری دینی زندگی کا مرکز بن سکیں اور ائمہ وعلماء ان مراکز سے امت کی رہنمائی اور ہدایت کا فریضہ انجام دے سکیں۔ اگر ایسا نہیں کریں گے تو یہ امت اور پستی میں جائے گی۔

آج صورتحال یہ ہے کہ مسلمان علم کے معاملہ میں دوسری قوموں سے پیچھے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ امت ایمان باللہ اور علم بالکتاب سے تشکیل پائی اور پروان چڑھی ہے۔ حدیث شریف میں ایمان اور علم دونوں کو نور اور روشنی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ دونوں صفتیں انسان کے اندرون تمام اجزاء بدن کو روشن کرتی ہیں، اگر یہ دونوں موجود ہوں تو امت اپنی ترقی کی راہ آسانی سے پالے گی اور ذلت وپستی سے نکل کر حقیقی ترقی حاصل کرے گی اور منزل مقصود تک پہنچے گی۔ ایمان کے بارے میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے:

"وأنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين" (سورہ آل عمران:۱۳۹) (تم ہی سربلند رہو گے اگر تم مومن ہو)۔

ایمان اور علم دونوں رکھنے والوں کو ترقی کی بشارت دیتے ہوئے اللہ جل شانہ نے فرمایا ہے:

"يرفع الله الذين آمنوا منكم والذين أوتوا العلم درجات والله بما تعملون خبير" (سورہ المجادلہ:۱۱)۔

(جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور جو لوگ اہل علم ہیں اللہ ان کے مرتبے بلند کرتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے)۔

اللہ رب العزت نے ایمان والوں کو دنیا اور آخرت کی ترقی کے یہ دو زریں اصول دیئے اور جب تک مسلمان ایمان اور علم کے علم بردار رہے، دنیا کی امامت کے حق دار رہے اور جب ان کا دامن ان دونوں سے خالی ہوا، ذلت وخواری سامنے آئی۔ علم کی اسی اہمیت کی وجہ سے رسول اکرم ﷺ نے علم حاصل کرنے کو فرض قرار دیا ہے:

"طلب العلم فريضة على كل مسلم" (ابن ماجہ مقدمہ) (علم حاصل کرنا ہر مسلمان (مرد وعورت) پر فرض ہے)۔

اس لئے اگر کوئی اپنا فرض انجام نہ دے اور خود علم حاصل نہ کرے یا بچوں کو تعلیم سے محروم کرے تو یقیناً یہ ایسا گناہ ہے، جس پر آخرت میں مواخذہ ہوگا اور سزا دی جائے گی اور جو لوگ

فرض کو ادا کرتے ہیں وہ نہ صرف اس دنیا میں ترقی کرتے ہیں اور اللہ کی حفاظت میں رہتے ہیں بلکہ جنت میں جگہ پائیں گے اور جب تک اس دنیا میں رہیں گے تو دنیا کی تمام مخلوقات اور ہر شی ان کے لئے رحمت و مغفرت کی دعا کرتی رہے گی جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

جو شخص علم حاصل کرنے کے لئے راہ طے کرتا ہے اللہ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کر دیتے ہیں فرشتے اس علم کو طلب کرنے والے کے لئے پر بچھاتے ہیں۔ عالم کے لئے آسمان و زمین کی ہر چیز مغفرت طلب کرتی ہے یہاں تک کہ پانی کی مچھلیاں بھی۔ عالم کی فضیلت عبادت گزار پر ایسی ہے جیسے چاند کی فضیلت دوسرے ستاروں پر۔ علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں۔ بے شک انبیاء درہم و دینار کی وراثت نہیں چھوڑتے بلکہ وہ علم کا وارث بناتے ہیں جس نے علم حاصل کیا اس نے پورا حصہ حاصل کر لیا (ترمذی ابواب العلم)۔

البتہ موجودہ دور میں علم کے عصری درسگاہوں میں اخلاقی و دینی بے راہ روی کی تعلیم کا جو رواج ہے وہ انتہائی مضر ہے اس لئے اس سے بچنا ضروری ہے۔ بہرحال مسلمانوں کو چاہئے کہ علم دین و دنیا دونوں کو حاصل کریں اور اپنے لڑکے و لڑکیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم کے حصول کی وہ کوشش کریں تا کہ انہیں ہر طرح کی ترقی حاصل ہو اور وہ پستی سے نکل کر اونچائی کی طرف جائیں۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ علم ہی انسان کو مرتبہ دلاتا ہے جیسا کہ اللہ جل شانہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ علم والے اور بے علم والے برابر نہیں ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ علم ہدایت ربانی کا علم ہے، اس لئے سب سے پہلے اہمیت کے ساتھ بقدر ضرورت ربانی علم کو حاصل کرنا چاہئے اس کے بعد دوسرے علوم میں وقت لگانا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم سب کو ایمان اور علم سے مزین کرے اور توفیق دے کہ اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کریں۔ آمین۔

☆☆☆

تدریس میں مشق اور ہوم ورک کی اہمیت

مولانا وارث مظہری☆

عصر حاضر میں دینی مدارس کو زیادہ فعال اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے جن اصلاحی نکات پر غور کرنے کی ضرورت ہے، ان میں طریقہ تدریس بھی شامل ہے۔ اس وقت زیادہ تر مدارس کے نصاب کو بحث کا عنوان بنایا جا رہا ہے۔ نظام مدارس کی اصلاح کے تعلق سے دیگر اہم پہلو ہماری بحث کا کم ہی موضوع بنتے ہیں۔ طریقہ تدریس بھی انہی میں سے ایک ہے اور اس کا ایک پہلو اساتذہ کے سامنے پڑھے جانے والے اسباق کی مشق وتمرین اور ہوم ورک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ درس نظامی کے نصاب میں کتابی تبدیلی سے زیادہ طریقہ تدریس میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ کم وبیش تین سو سال کے دورانیے میں تدریس کا جو طریقہ درس نظامی کے مدارس میں مضبوطی کے ساتھ اپنی جگہ بنا چکا ہے، اس کو چیلنج کرنا، نصاب کو چیلنج کرنے کی طرح ہی بہت حد تک ممکن نہیں رہا ہے۔ ظاہر ہے اس وضاحت کا خاموشی کے علاوہ کوئی جواب نہیں ہوسکتا کہ ہمارے اکابر اور بزرگوں اور ان کے بزرگوں کا طریقہ تدریس اور طرز تعلیم یہی رہا ہے۔

دور جدید میں فن تعلیم کی جو ترقی ہوئی اور اس میدان میں جو تجربات کیے گئے، ان کی بنا پر ایک بدیہی اور مشاہداتی حقیقت کے طور پر اس بات کو تسلیم کر لیا گیا کہ درس وتدریس میں اصل اہمیت مشق وتطبیق کو حاصل ہے۔ زبان آموزی کی تو خیر سے بنیاد ہی یہی ہے، مختلف مضامین کی تفہیم اور طلبہ کے ذہنوں میں ان کی ترسیخ اس کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نحو وصرف کا سارا

☆ تنظیم ابنائے قدیم، دہلی

فلسفہ از بر ہونے، بلاغت ومعانی کے سارے دقائق وغوامض پر بصیرت مندانہ نگاہ ہونے کے باوجود طلبہ عربی تحریر وتکلم سے تقریباً نابلد اور بلاغت ومعانی کے اصولوں کی، متعلقہ کتابی مثالوں سے ہٹ کر تطبیق اور استعمال سے ناواقف ہوتے ہیں۔ ضرورت تو اصلاً اس بات کی ہے کہ ایسی نئی کتابیں شامل درس کی جائیں جن میں متون کے ساتھ مشق وتمرین کا بھی التزام کیا گیا ہو، عربی زبان کے تعلق سے عرب ممالک کے علاوہ ہندوپاک سے بھی بکثرت ایسی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن عام طور پر انہیں ارباب اہتمام وانتظام کے حضور میں باریابی حاصل نہیں ہو سکی۔ عربی میں النحو الواضح، اردو میں مفتاح اللغۃ العربیۃ (نور عالم خلیل امینی) اور القرأۃ الواضحۃ (مولانا وحید الزماں کیرانویؒ)، مشق وتمرین کو ہی بنیادی اہمیت دیتے ہوئے لکھی گئی ہے لیکن وہ ہندوستان کے ہزاروں مدارس میں سے کتنے مدارس میں شامل نصاب ہے؟ تمرین کے جس بہترین منہج پر النحو الواضح لکھی گئی ہے اس کا تقاضا ہے کہ اسے ہر عربی مدرسے میں شامل نصاب کیا جائے۔

دوسری کتابوں کو رہنے دیجیے جو کتابیں شامل درس ہیں، اگر ان میں بھی مشق وتمرین کا اہتمام ہو تو منتہی درجات کی متعلقہ مضامین کی اہم کتابوں سے بے نیازی حاصل ہو سکتی ہے اور بچنے والے وقت کو طلبہ دوسرے مفید مضامین کے مطالعے میں صرف کر سکتے ہیں۔

طریقہ کار

اکثر اساتذہ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مدارس میں مشق کا التزام نہیں ہے۔ ان کی نظر میں درس میں استاذ کی تقریر کے دوران یا اس کے بعد طلبہ سوالات کرتے ہیں اور استاذ ان کا ''کافی وشافی'' جواب دیتا اور نفس مسئلہ کی تفہیم پر وضاحتی تقریر کرتا ہے، وہ مشق وتمرین ہی کی تو شکل ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ مشق کا لغوی مفہوم تو ہو سکتا ہے لیکن عملی اور اصطلاحی مفہوم نہیں۔ مزید برآں سوالات وجوابات کی سطح پر صرف چند طلبہ ہی اس عمل میں شریک ہو پاتے ہیں جبکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ روزانہ ہر ایک دن بعد یا ہفتہ وار کلاس کے ہر ہر طالب علم کو مشغول کار کرنے کی

کوشش کی جائے۔ دوسرے وہ صرف تقریری سطح پر ہی نہ ہو، بلکہ تحریری سطح پر بھی ہو، بصورت دیگروہ عمل مذاکرہ زیادہ ہوگا، مشق وتمرین کم، مشق ایک انفرادی عمل ہے، جس میں طالب علم اپنی پوری معلومات اور صلاحیت کو استعمال میں لانے کی کوشش کرتا ہے، جب کہ مذاکرہ ایک اجتماعی عمل ہے، جس میں زیادہ صلاحیت والے طلبہ کی حیثیت سنانے والے اور کم صلاحیت والے طلبہ کی حیثیت سننے والے کی ہوتی ہے۔

ہمارے ایک استاذ، جن کی عربی پر اچھی گرفت تھی، فرمایا کرتے تھے کہ میں نور الایضاح اور قدوری پڑھاتے ہوئے بھی عربی زبان وادب سکھا سکتا ہوں۔ ان کے ذہن میں اس کا خاکہ یہ تھا کہ کتاب کو پڑھاتے ہوئے ضروری قواعد نحو وصرف کو نشان زد کیا جائے اور طلبہ کو ان کے اپنے مترادف جملوں میں اس کی مشق کرائی جائے۔ یہ جملے کتاب سے ہٹ کر ہمارے روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھتے ہوں، بعض ممالک کے سفر کے دوران میری بعض ایسے غیر مسلم اسکالرس سے ملاقات ہوئی جو ایک سال سے بھی کم مدت کا عربی زبان کا کورس مکمل کرنے کے بعد عربی سمجھنے بولنے پر اتنا قادر تھے جتنا کئی سالوں تک عربی کی تعلیم کے بعد بھی ہمارے طلبہ قادر نہیں ہو پاتے۔ یہ دراصل مشق کا ہی کرشمہ ہے۔ زبان کی تعلیم کے تعلق سے اب یہ کلیہ تسلیم کرلیا گیا ہے اور تجربات نے اس کی افادیت پوری طرح ثابت کردی ہے کہ بچے کو براہ راست طریقہ تعلیم (Direct Teaching Method) کے ذریعے زبان پہلے اور اسکی قواعد بعد میں سکھائی جائے، قواعد آموزی کی بنیاد پر زبان سکھانے کا طریقہ طولانی اور پیچیدہ ہے، اس لیے جدید تعلیم گاہوں میں اس پر عمل نہیں ہوتا۔ وہاں اسے ازکاررفتہ تصور کرلیا گیا ہے۔ ذرا غور کرنے کی بات ہے کہ انہی عربی مدارس کے طلبہ جو کئی سالوں تک عربی نصاب پڑھنے کے بعد بھی عربی نہیں سیکھ پاتے، صرف ایک دو سال میں انگریزی کی اتنی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرلیتے ہیں کہ وہ حسب ضرورت اسے بول بھی سکیں اور سمجھ بھی سکیں، اس کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ عربی کے مقابلے میں انگریزی زبان کی تعلیم کا طریقہ رائج اور معروف طریقے کے مطابق، قواعد کی تحفیظ کے بجائے

قواعد کی تطبیق اور زیادہ سے زیادہ لکھنے، بولنے اور سمجھنے کی مشق پر مبنی اور نہایت خشک ہوتا ہے جس کی وجہ سے طلبہ کو درس سے دل چسپی بھی نہیں ہو پاتی۔

عربی زبان کی طرح مثال کے طور پر بلاغت اور اصول فقہ وغیرہ کی تعلیم میں مشق وتطبیق کو اولیت دی جانی چاہیے۔ مجرد یا نپی تلی اور ڈھلی ڈھلائی مثالوں کے حوالے سے ان کی تعلیم طلبہ کے لیے پیچیدہ ہو جاتی ہے اور عموماً متعلقہ عبارات سے باہر آ کر وہ کچھ سمجھنے اور سمجھانے کے اہل نہیں ہو پاتے سلطان احمد اصلاحی نے بجا طور پر اس صورت حال کے تناظر میں لکھا ہے کہ

"کچھ کتابوں کے محدود صفحات کی گھسائی ذہن ودماغ کی ایسی تنگی اور محدودیت پر منتج ہوتی ہے کہ متن کے ساتھ اس کے حواشی کو بھی فاضل مدرسہ ویسا ہی الہامی اور نا قابل تبدیل باور کرنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی مسئلے کے ساتھ اس کی نصف صدی سے اوپر کی مثال کو بھی وہ اس کا لازمی حصہ خیال کرتا ہے اور مثال کی تبدیلی سے نفس مسئلہ کا اس کے ذہن سے غائب ہو جانا ورنہ کم سے کم اس کے سلسلے میں التباس کا شکار ہو جانا ہمارے روزمرہ کے مشاہدے کا ایک حصہ ہے" (ہندوستان میں مدارس عربیہ کے مسائل ص:104)۔

فقہ میں نظری جمود کی فی زمانہ بنیادی وجہ اصول فقہ میں بصیرت ومہارت کی کمی ہے اور میری نظر میں اس کمی کا تعلق مشق اور تطبیق کے بغیر ان مضامین کی مجرد قواعد کی تفہیم پر مبنی تعلیم سے ہے۔

ہمارے اکثر مدارس میں بلیک بورڈ کا استعمال نہیں کیا جاتا، حالاں کہ یونیورسٹیز میں بی.اے اور ایم.اے کے طلبہ کے لیے بھی بلیک بورڈ کے استعمال کی ضرورت پڑتی ہے۔ دراصل مدارس کے نظام تعلیم اور منہج تدریس کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہاں اصل فن اور موضوع کے بجائے کتاب کی تعلیم کو مرکز توجہ اور مقصود بنا لیا گیا ہے۔ اس لیے طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے درس وتدریس کا عمل انتہائی سپاٹ اور سطحی ہو کر رہ گیا ہے۔ ضرورت اسلام کے دور عروج کے املا کے طریقے کو رائج کرنے کی ہے جس میں اصل زور نفس مضمون کی تفہیم پر ہوتا ہے، نہ کہ دور زوال کے پیش پا افتادہ طریقے پر انحصار کرنے کی، جس میں ساری توانائی اور صلاحیت صرف متعلقہ

کتاب کے متون کی تعقیدات کو حل کرنے اور ان کو سمجھنے سمجھانے میں صرف ہوتی ہے۔ مشق وتمرین سے تغافل کیشی کی روایت جواب کافی پختہ ہو چکی ہے، ہمارے نظام تعلیم کی اسی بنیادی خامی وکمزوری کا شاخسانہ ہے۔ شبلی نعمانی اور مولانا ابو الکلام آزاد سمیت اصلاح نصاب کے موضوع پر لکھنے والوں کی اکثریت پچھلی ایک صدی میں بار باراس کی طرف توجہ دلاتے رہے لیکن مروج اسلوب تدریس میں تبدیلی پر غور نہ کیا جاسکا۔

ہوم ورک کی اہمیت اور اس کا عملی خاکہ

اسی طرح ہوم ورک کا مسئلہ ہے۔ مدارس میں پڑھنے پڑھانے والوں کا ذہن تعلیم کے اس بنیادی فلسفے کو عملی طور پر برتنے کے لیے آمادہ نہیں کہ تعلیم کا تعلق اسکول یا مدرسے سے زیادہ گھر سے ہوتا ہے۔ اسکولوں کے اساتذہ، طلبہ اور ان کے والدین اس بات کو ذہن نشیں کرانے میں بہت حد تک کامیاب رہے ہیں کہ صرف کلاس روم کی حاضری سرے سے کوئی معنی نہیں رکھتی، اس بنیاد پر کوئی طالب علم ایک قدم بھی تعلیم کی راہوں میں آگے نہیں بڑھ سکتا، لیکن مدارس کے اساتذہ اور انتظامیہ اس میں کامیاب نہیں ہیں۔ وجہ واضح ہے کہ مدارس کے نصاب اور طریقہ تعلیم میں ہوم ورک کو بہ مشکل ہی کچھ اہمیت دی گئی ہے۔ چنانچہ طلبہ کی اکثریت کا ذہن درس گاہ سے اپنی قیام گاہ پر لوٹنے کے بعد اس فکر سے خالی ہوتا ہے کہ اس کے ذمہ کچھ واجبات منزلیہ (ہوم ورک) بھی ہیں جنھیں انجام دینا ضروری ہے۔ وجہ یہ ہے کہ واجبات منزلیہ کو طلبہ کے لیے اختیاری (Optional) خانے میں رکھا گیا ہے، یعنی اگر وہ پڑھے ہوئے اسباق کا مطالعہ ومراجعت کرتے ہیں تو بہت بہتر ورنہ ظاہر ہے، کسی بھی طرح اس معاملے میں ان سے بازپُرس نہیں کی جاسکتی۔

اصل کمی دراصل یہیں سے پیدا ہوئی ہے، ہوم ورک کی اصل اہمیت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ لازمی ہو اور اس کا لازمی ہونا اسی شکل میں متحقق ہوسکتا ہے کہ اس تعلق سے طلبہ سے باضابطہ بازپُرس کی جائے۔ اس وقت چھوٹے اور بڑے تمام مدارس کی ایک بڑی کمزوری طلبہ کی

تعداد بڑھانے کی ہے۔ ایک درجے میں پچاس پچاس طلبہ ہوتے ہیں۔ ایسے میں یہ کس طرح ممکن ہوسکتا ہے کہ ہر طالب علم کو روزانہ مختلف مضامین کی تدریس میں ہوم ورک دیا جائے اور اس کی انجام دہی کو ہر صورت میں یقینی بنانے کی کوشش کی جائے، جیسا کہ اسکولوں میں ہوتا ہے۔ طلبہ سے زیادہ سے زیادہ یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ عبارت پڑھ کر آئیں، پھر عبارت پڑھنے والے بھی چند مخصوص ہی طلبہ ہوتے ہیں۔ دوسرے طلبہ کو پورے سال استاذ کے سامنے عبارت پڑھنے کی نوبت نہیں آتی، دراصل اساتذہ بھی انہی طلبہ کو مرکز توجہ بناتے ہیں جو تیز فہم اور روانی کے ساتھ عبارت پڑھنے والا ہو، کمزوروں کو وہ درخور اعتنا نہیں سمجھتے، اس طرح یہ گلوبلائزیشن کے شعبدہ بازوں کا سا شیوہ ہوا، یعنی قوی کو قوی تر اور کمزور کو مزید کمزور تر کرتے چلے جانا، اب آخر اس ''جرم ضعیفی کی سزا'' فشلِ مفاجات'' کی شکل میں سامنے کیوں نہ آئے؟ اسکولوں میں ایک کلاس میں طلبہ کی تعداد عموماً 30,20 سے زیادہ نہیں رکھی جاتی، اس کا فائدہ یہ ہے کہ ہر طالب علم کی نقل وحرکت اور اس کی کارکردگی کلاس روم میں استاذ کی نگاہ میں رہتی ہے۔ استاذ سے ہر طالب علم کا براہ راست رابطہ قائم رہتا ہے۔ استاذ کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ طالب علم کو اسباق سے متعلق مختلف کام دے کر انہیں اسکول کی طرح گھر پر بھی مصروف رکھ سکے۔

اسی نظریے کے تحت کہ بچے کی تعلیم کا جتنا تعلق اسکول سے ہوتا ہے، اتنا ہی تعلق گھر سے بھی، اسے چھٹیوں کے ایام کے دوران کرنے کے لیے ضروری کام دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح طویل ومختصر چھٹیوں کے درمیان بھی طالب علم کا ذہن اسکول اور اس سے متعلق درس ومطالعے کی سرگرمیوں سے وابستہ رہتا ہے۔ مدارس میں رمضان کی تقریباً دو ماہ کی طویل فرصت میں بھی ان کے پاس استاذ کی طرف سے مفوضہ کوئی کام نہیں ہوتا، نتیجتاً اس پورے عرصے میں طالب علم کا ذہن دروس واسباق کی فکر اور ذمہ داریوں سے یکسر خالی رہتا ہے۔ اس مکمل انقطاع ذہنی کا ایک بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اگلا تعلیمی دور شروع ہونے کے بعد اس کو دوبارہ اپنے ذہن کو درس ومطالعے پر مرتکز کرنے میں کئی ہفتے صرف ہوجاتے ہیں۔ اس لیے یہ بات عام طور پر سننے میں آئی ہے کہ نیا

سال شروع ہونے کے بعد تعلیم یا اس کی باضابطہ سرگرمیوں کا آغاز تو عید الاضحیٰ کے بعد ہی ہوتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ رمضان کے بعد اور عید الاضحیٰ کی فرصت سے قبل ایک ڈیڑھ ماہ کا تعلیمی دورانیہ عموماً اساتذہ کے احوال و واقعات اور علمی اسفار و فتوحات کے بیان میں ہی گزر جاتا ہے۔

سال کے اس چوتھائی حصے کو بہتر طور پر اس وقت کام میں لایا جاسکتا ہے جب کہ ہوم ورک کے تصور (Concept) کو عمل میں لاتے ہوئے طلبہ کو اس عرصے میں مشغول رکھنے (Engage) کی کوشش کی جائے۔

اسی ضمن میں اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے کہ مدارس کے تعلیمی نظام میں طلبہ کے والدین یا سرپرستوں کو طلبہ کی تعلیمی کارکردگی اور ان کے مجموعی طرز عمل، جس میں ان کی اخلاقی حالت، اساتذہ اور ہم درجہ طلبہ کے ساتھ ان کا برتاؤ، ان کی خارجی نصاب میں سرگرمیاں وغیرہ شامل ہیں، سے آگاہ رکھنے کی کوشش نہیں کی جاتی، طلبہ کے والدین اور سرپرستوں کو ان کی مجموعی تعلیمی و اخلاقی حالت کا اندازہ بہ مشکل ہی ہو پاتا ہے۔ طلبہ جس طرح چاہتے ہیں اپنی حسن کارکردگی سے متعلق اپنے والدین/سرپرستوں کو قائل کر دیتے ہیں۔

اس تجویز پر غور کیا جاسکتا ہے کہ سال کے اخیر میں فرصت کے ایام کے لیے باضابطہ ہوم ورک دیا جائے اور سال بھر کی کارکردگی پر مشتمل کارکردگی رپورٹ بھی اس سے منسلک کر کے ان کے سرپرستوں کے پاس ان کے ملاحظے کے لیے بھیجی جائے۔ مسئلہ یہ ہے کہ چونکہ مدارس کی تعلیم مفت یا کم خرچ پہ ہوتی ہے، اس لیے والدین کو اس بات کا حوصلہ نہیں ہو پاتا کہ وہ اساتذہ سے طالب علم کی کارکردگی پر اسکول میں پڑھنے والے طالب علم کے والدین کی طرح دوٹوک انداز میں بحث و گفتگو کر سکیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مدارس میں جتنا کچھ وہ پڑھ کر حاصل کر لیتے ہیں وہ بسا غنیمت ہے۔ ان کی یہ قناعت پسندی، طلبہ کے حق میں کس قدر نقصان دہ ہے، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ بعض والدین پر اساتذہ کے احترام و تعظیم کا بھی ضرورت سے زیادہ غلبہ ہوتا ہے۔ اس لیے بھی ان کی نگرانی اور شاگردی میں تعلیمی سطح پر پروان چڑھنے والے اپنے بچوں کی ناقص کارکردگی پر

سوالیہ نشان قائم کرنا انہیں غلط اور خلاف ادب محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ طے شدہ تعلیمی تصور کے مطابق، بچے کی تعلیم، بچہ، استاذ اور والدین تینوں کے مجموعی محور پر گھومتی اور آگے بڑھتی ہے، لیکن مدارس کی تعلیم میں والدین کا رول بالکل صفر ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ پہلو بلاشبہ قابل غور ہے۔

میرے خیال میں چوں کہ طلبہ کی اکثریت گھر اور علاقے سے دور مدارس میں اقامت کے ساتھ ہی تعلیم حاصل کرتی ہے، اس لیے والدین کو بچے کی تعلیم میں مشغول (Engage) کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ طریقہ عیدین کے مواقع پر سال میں ہونے والی فرصت کے لیے انہیں ہوم ورک دینے کا ہے۔ جیسا کہ اوپر وضاحت گزر چکی ہے، یہ ہوم ورک اس ہوم ورک کا بدل نہیں ہو سکتا جو روزانہ یا ہفتے میں چند دن طلبہ کو دیے جائیں۔

بہر حال دینی مدارس کے نصاب کی تدریس میں مشق اور ہوم ورک کے اہتمام کی دیگر امور کے مقابلے میں زیادہ ضرورت واہمیت ہے۔ یہ بنیادی طور پر طریقہ تدریس کی خامی ہے لیکن اس کا براہ راست تعلق نصاب اور اس میں شامل کتابوں سے ہے، یہ کتابیں مشق و تمرین کے پیٹرن پر نہیں لکھی گئی ہیں، یہ کتابیں اس دور کی یادگار ہیں جب اسلامی دنیا میں مسلم فکر کو زوال آچکا تھا۔ مدارس کے مروجہ نصاب تعلیم پر نظر ثانی کی ضرورت انیسویں اور بیسویں صدی کے پورے عرصے میں شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی رہی ہے۔ خاص طور پر ملک کی آزادی کے بعد نئے سیاسی وسماجی ماحول میں پورے غور وفکر کے ساتھ نظام تعلیم کے جائزے کی ضرورت تھی تا کہ ہم پر یہ حقیقت آشکارا ہو سکے کہ ماضی میں ہم نے کون سا قدم بالارادہ یا بادل خواستہ اور کون سا قدم بادل ناخواستہ اور سیاسی حالات کے جبر کی بنیاد پر اٹھایا تھا۔

نصاب ونظام اور طریقہ درس کے حوالے سے مشق اور ہوم ورک کا موضوع غور وفکر کی ایک جہت ہے، ایسی بہت سی جہات ہیں جن پر ہمارے لیے اپنے نظر وفکر اور عمل کا قبلہ درست کرنے کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

دینی مدارس اور تربیت اساتذہ

ڈاکٹر سرور عالم ندوی☆

اسلام ایک جامع تصورِ حیات کا نام ہے، اس کی اساس عقائد، اصول اور اقدارِ حیات پر قائم ہے، وہ ایک مخصوص انفرادی کردار کے ساتھ صالح سماج کی تشکیل کرتا ہے وہ نہ قدامتوں کا ایسا داعی ہے جو محض روایت پرستی کو لائق پرستش سمجھتا ہو اور نہ ہی جدیدیت کا ایسا دیوانہ ہے کہ اسے ہر جدید چیز پرکشش معلوم ہوتی ہو، بلکہ وہ ایک متوازن اور معتدل نظامِ زندگی کا علمبردار ہے۔

اور اسلام کا اعتدال و توازن بغیر تعلیم کے ممکن نہیں ہے، کیونکہ تعلیم اسلامی نقطۂ نگاہ سے ایک معاشرتی عمل ہے جسکے ذریعہ معرفتِ الٰہی حاصل کرنا، اپنے آپ کو پہچاننا، کائنات کی حقیقت کو معلوم کرنے کے لئے جستجو کرنا ہے، اور یہی وہ بنیادی فرق ہے جو اسلام کے نظریۂ تعلیم اور دیگر نظریات کے مابین پایا جاتا ہے۔

سقراط نے صرف حقیقت کی تلاش کو تعلیم کہا، افلاطون نے معاشرے کی متوازن تنظیم کو تعلیم سے تعبیر کیا، ارسطو نے تعلیم کو جسمانی اور عقلی تربیت کا وسیلہ بنایا، لیکن اسلام جسم اور روح دونوں کی تربیت کو مقاصدِ تعلیم قرار دیتا ہے تا کہ ذات اور معاشرہ کو پاکیزہ سے پاکیزہ تر بنایا جا سکے۔

اسلامی فلسفۂ تعلیم کا مقصد صرف انفرادی اصلاح نہیں بلکہ فرد اور اجتماع دونوں کی فلاح و بہبود ہے، وہ نوجوانوں کی ذہنی، علمی اور دماغی صلاحیتوں کو اعلیٰ اقدار پر استوار کرنا چاہتا ہے۔

کیونکہ نوجوان ملت کے وہ قیمتی اثاثہ ہیں جن کے بقا و تحفظ پر ہی انسانیت کا انحصار

☆ شعبۂ عربی پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قومی، ملی، دینی، تہذیبی اور اخلاقی میراث محفوظ رہے اور نسلاً بعد نسل اسی طرح ایک دوسرے تک منتقل ہوتی رہے تو ہمارا اخلاقی فریضہ بلکہ انسانیت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم اپنی جدید نسل کی ذہنی وجسمانی نشو ونما اور صحیح تعلیم وتربیت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں اور ان کے لئے وہ ساری سہولیات فراہم کریں جو ان کی شخصیت کی تعمیر میں اہم رول ادا کرسکتی ہیں، کیونکہ آج کے یہی نوجوان درحقیقت ملک وملت کے معمار ہیں، انہیں پر اقوام وملل کے عروج وارتقاء کا انحصار اور انہیں کے کاندھوں پر قومی، ملی، دینی اور مذہبی روایات وتشخصات کے تحفظ کا بار رکھا جانے والا ہے۔

یہ اپنی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے اہل اسی وقت ہوسکتے ہیں جب ان کی تعلیم وتربیت اور ذہنی وجسمانی نشوونما مکمل تندہی اور چابک دستی کے ساتھ کی گئی ہو، اور گھر، خاندان، معاشرہ مملکت وحکومت اور اسکول ومدرسہ سب کا بھرپور اشتراک رہا ہو؛ اس لئے کہ تعلیم وتربیت کی ذمہ داری ان میں سے ہر ایک پر عائد ہوتی ہے، یہ اور بات ہے کہ کسی پر کم اور کسی پر زیادہ؛ مگر بہر حال اعانت ہر ایک کی لازمی ہے۔

لیکن حالات اور زمانہ کے موجودہ تناظر میں ان میں سب سے زیادہ اہمیت ہماری دینی اور مذہبی اداروں کی ہے؛ کیونکہ یہی وہ ادارے ہیں جو صحیح تعلیم وتربیت کے ذریعہ انسانی خدوخال کو اس کے حقیقی اور مطلوبہ روپ میں نکھار اور سنوار سکتے ہیں، کیونکہ زمانہ کے ترقی پسند نظریات اور معاشی اور اقتصادی مسائل کی کثرت نے سماجی اور معاشرتی شیرازہ بندی کو بالکل منتشر کر کے رکھ دیا ہے، کوشش وکاوش کا سارا محور صرف ذات تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے، کسی کو چنداں اس کی فکر نہیں کہ وہ معاشرے اور سماج کیلئے کیا کرنا چاہتا ہے۔

ایسے نازک حالات میں ہماری یہ دینی ادارے ہی درحقیقت راہب کا چراغ بنکر راہ سے بچھڑے لوگوں کو منزل کا سراغ دے سکتے ہیں، لیکن یہ عمل جتنا ضروری اور اہم ہے اتنا مشکل

بھی ہے، یہ کام صرف کتابوں کے چند اوراق رٹا دینے سے پورا نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لئے ایک مکمل نظام کی ضرورت ہے، اور اس نظام کا اصل محور حضرات اساتذہ کرام کی ذات اور شخصیت ہے۔

تعلیم کے کسی بھی نظام میں استاد کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے، اس لئے استاذ کے انتخاب میں بھی غایت درجہ احتیاط کی ضرورت ہے، نہ تو ہر صاحب علم استاد بن سکتا ہے اور نہ ہی ہر استاد صاحب علم ہوسکتا ہے، یہی وہ بنیادی اور اہم نکتہ ہے جس کی روشنی میں جدید دور کا ہر نظام تعلیم استاد کی اپنی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام کرتا ہے اس لئے کہ کوئی استاد اس وقت تک کامیاب استاد نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ فن تدریس سے واقف نہ ہو۔

بلاشبہ کچھ لوگوں میں تدریس کا قدرتی ملکہ ہوتا ہے لیکن فی زمانہ یہ ایک ایسا فن ہے جسے دلچسپی لے کر سیکھا جاسکتا ہے اور اس سلسلہ میں عملی تربیت کے ذریعہ جدید ترین ذرائع کے استعمال سے بھی واقفیت حاصل کی جاسکتی ہے جس کی طرف ہمارے مدارس کی نگاہ التفات کما حقہ اب تک نہیں ہے یا اگر ہے تو بہت کم ہے، کیونکہ حصول تعلیم کا مقصد بیشتر ذمہ داران مدارس کے سامنے اب تک واضح نہیں ہے، وہ طلباء کی ایک بھیڑ کو تیار کر لینے کے خواہاں ضرور ہوتے ہیں لیکن ان کے ذہنی اور عقلی نشوونما کے ساتھ علمی اور تربیتی نشوونما کی ویسی فکر نہیں ہوتی جیسی ہونی چاہئے۔

موجودہ حالات میں اپنے تعلیمی معیار کو بلند کر کے طلباء مدارس کو صالح معاشرے کی تشکیل میں اہم رول ادا کرنے اور عصر حاضر کے تقاضوں کی تکمیل کے لائق بنانے کیلئے ضروری ہے کہ ہم اپنے اساتذہ کی تربیت پر بھی اتنی ہی توجہ مبذول کریں جتنی طلباء کی تعلیم و تربیت کی طرف کرتے ہیں، جب تک اساتذہ صحیح تربیت کے حامل نہیں ہوں گے اس وقت تک طلباء کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا، اساتذہ کیلئے خصوصی تربیتی ادارے اس دور کے ہر نظام تعلیم کا جزو ہیں، اسلامی نظام کے تحت یہ ادارے غیر معمولی اہمیت کے مالک ہوں گے؛ اس لئے کہ در

اصل ان کی صحیح نہج پر نظام تعلیم کی صحیح تشکیل کا مدار ہوگا۔

اس تربیتی نظام کا مرکزی نکتہ یہ ہو کہ اساتذہ میں ان کے نصب العین کا واضح شعور اور گہری وابستگی پیدا کرے اور ان میں وہ اخلاقی کردار اور مشنری جذبہ پروان چڑھائے جو انہیں اس منصب کے تقاضے کو صحیح صحیح ادا کرنے کے لئے تیار کرے۔ اس سلسلہ میں ایک مسلم ماہر تعلیم کے اصول وضوابط ضبط تحریر کئے جاتے ہیں جن کی رعایت اس عمل میں رہنمائی کا کام انجام دے سکتی ہے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱- ان کو (اساتذہ کو) یہ تربیت دی جائے کہ وہ اپنے اپنے مضامین اسلامی فلسفۂ تعلیم کی مطابقت میں پڑھائیں۔

۲- انہیں اپنے ملک کے اور بحیثیت مجموعی امت مسلمہ کے بارے میں شعور وآگہی فراہم کی جائے تاکہ وہ بعد میں اپنے زیر تعلیم وتربیت طلباء تک اسے منتقل کرسکیں۔

۳- انہیں اسلام کے فلسفۂ تعلیم، مقاصد تعلیم اور مفکرین تعلیم کے خیالات سے آگاہ کیا جائے۔

۴- مغربی تعلیمی فکر اور طریقہ ہائے تدریس کا مطالعہ تنقیدی نقطۂ نظر سے کروایا جائے۔

۵- نصاب میں ایسے عناصر نہ ہوں، جو ان کے ذہن کو پراگندہ اور ان کی شخصیت کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے والے ہوں۔

۶- ایسی کتابیں استعمال کی جائیں جو اسلامی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہوں، ایسی تحریریں، رسالے یا کتابیں کورس میں نہ ہوں جو اجتماعی نصب العین کے بارے میں ایمان کو کمزور کرنے والی ہوں۔

۷- تدریس کو موثر کرنے کے لئے جدید سمعی وبصری آلات کے استعمال سے واقف کروایا جائے (اسلامی نظام تعلیم کے خدوخال، ص: ۸۷-۸۸، مطبوعہ فاؤنڈیشن فار ایجوکیشن ڈیولپمنٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۳ء)۔

اساتذہ کی تربیت کا نظام دو طرح سے نافذ کیا جاسکتا ہے ایک عمل تدریس کے آغاز سے قبل اور دوسرا دوران تدریس۔

عمل تدریس کے آغاز سے قبل شروع ہونے والے نظام کو ایک مکمل نصاب کے ذریعہ طویل مدتی نظام کے تحت بروئے کار لایا جاسکتا ہے جو ایک سالہ مدتی نظام و نصاب پر مشتمل ہو، جس میں طریق تدریس، اصول تدریس اور مقاصد تعلیم جیسے موضوعات کو شامل کیا جائے اور اس میں عملی مشق کی شکلیں بھی شامل ہوں۔

دوسرا دوران تدریس تربیتی نظام۔

اس میں تدریس کے دوران اساتذہ کی تربیت کیلئے جز وقتی یا مختصر وقتی نظام بنایا جائے، اس کا مقصد تدریسی فرائض انجام دینے والے اساتذہ کرام کو نئی معلومات سے روشناس کرانا ہوتا کہ اس کے ذریعہ انہیں اپنے طریقۂ تدریس کو آسان، دلکش اور قابل فہم بنانے کے لئے نئے طریقۂ تدریس سے واقفیت ہو سکے، اور ان کے خیالات میں وسعت پیدا ہو، اس کے لئے ریفریشر کورسیز، ورک شاپ، اسٹڈی گروپ وغیرہ جیسا نظام مفید ہوسکتا ہے۔

یہ وہ پہلو ہے جس کی ضرورت، اہمیت اور افادیت ہمارے مدارس نظام تعلیم میں شدت سے محسوس کی جارہی ہے، کیونکہ یہ مدارس موجودہ حالات اور تقاضوں کے تحت اپنے فرائض منصبی کو اسی وقت پورا کر سکتے ہیں جب وہ طلباء کی تعلیم و تربیت کی طرف اپنی توجہ کما حقہ مبذول فرمائیں، اور طلباء کی صحیح تعلیم و تربیت اساتذہ کی تربیت کے بغیر کامل اور مکمل نہیں ہوسکتی۔

☆☆☆

مساجد اور نظام تعلیم

مولانا محمد شبلی القاسمی☆

علوم اسلامیہ کے فروغ واشاعت اور اس کی ترویج وترقی میں مساجد کو ابتدائے اسلام ہی سے مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے، چنانچہ عہد رسالت میں مسجد نبوی کے فرش سے انجام دیئے جانے والے کارناموں کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو ایک طرف وہاں مالک حقیقی کے حضور عجز ونیاز، خشوع وخضوع اور گریہ وزاری سے معمور برگزیدہ پیشانیوں کے زریں نقوش نظر آتے ہیں تو دوسری طرف دین ودنیا کے سارے قوانین ترتیب پاتے نظر آتے ہیں۔ لشکر اسلام کو قواعد جنگ سکھائے جاتے اور یہیں سے جہاد میں فوجیں روانہ کی جاتیں۔ مختلف ممالک دور افتادہ علاقوں اور اطراف واکناف کے وفود یہیں اترتے تھے۔ اسی مسجد میں امام الاولین والآخرین محمد رسول اللہ ﷺ کا دربار لگتا تھا اور اسی میں مقدمات کی سماعت ہوتی اور فیصلے دیئے جاتے، اسی میں مجرمین بھی قید کئے جاتے اور اسی میں حامل وحی ختم الرسل استاذ کامل محمد عربی ﷺ کا درس ہوتا۔ اسلام کا پہلا مدرسہ صفۃ النبی کے نام سے اسی مسجد کے صحن میں قائم ہوا۔ مسجد میں کل وقتی اور جزء وقتی دونوں طرح کے تشنگان علوم ربانی رہا کرتے۔ مسجد نبوی کی زیارت کرنے والے آج بھی صفۂ نبی کو اپنی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں وہ مقام مسجد نبوی کے دیگر مقامات حتی کہ ریاض الجنۃ (جنت کی کیاری) سے بھی قدرے اونچا ہے گویا یہ اشارہ ہے کہ علم کا مقام عبادت سے اور اہل علم کا مقام اہل طاعت وزہد سے

☆ (کنوینر تنظیم تحریک ائمہ مساجد آل بہار پھلواری شریف، پٹنہ)

بلند و برتر ہے اور وہیں سے پوری دنیا کے مسلمانوں کو یہ خاموش پیغام بھی مل رہا ہے کہ آپ کی مساجد بھی تعلیم و تعلم کا مرکز ہوں۔ زمانہ خیر القرون اور اس کے بعد چوتھی صدی ہجری کے ختم تک مسلمانوں کے لئے دنیا میں مساجد ہی درسگاہ اسلامی کی حیثیت رکھتی تھیں۔ موجودہ شکل میں رائج شدہ مدارس کا رواج نہیں تھا۔ مورخ اسلام علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

اگر چہ ۱۴۳ھ کے متصل ہی تمام ممالک اسلامی میں درس و تدریس کا ایک عظیم الشان سلسلہ قائم ہو گیا اور انہی دو تین صدیوں میں جس درجے کے سیکڑوں، ہزاروں مجتہد، فقیہ، ادیب، شاعر، فلاسفر، مورخ پیدا ہو گئے، زمانہ کو نو سو برس کی وسیع مدت میں بھی اس پایہ کے لوگ نصیب نہیں ہوئے لیکن تعجب ہے کہ تاریخ کے صفحوں میں چوتھی صدی کے اخیر تک کسی کالج یا اسکول کا نشان نہیں ملتا، مسجدوں کے صحن، خانقاہوں کے حجرے، علماء کے معمولی مکانات یہی اس وقت کے مدرسے یا دارالعلوم تھے (دیکھئے: مقالات شبلی ۳/۷)۔

آگے لکھتے ہیں: عام خیال یہ تھا کہ اول جس نے مدرسوں کی بنیاد ڈالی وہ دولت سلجوقیہ کا وزیر اعظم نظام الملک طوسی تھا پھر لکھتے ہیں کہ اولیت کی تعین تو ہم بھی نہیں کر سکتے ہیں مگر یہ بتا سکتے ہیں کہ نظام الملک سے قبل علمی عمارتوں کے آثار موجود تھے۔ ۴۰۰ھ میں حاکم مصر نے مصر میں ایک بڑا مدرسہ بنوایا، سلطان محمود غزنوی نے متھرا کی فتح سے واپسی پر ۴۱۰ھ میں دار السلطنت غزنین میں عالی شان مدرسہ بنوایا۔ مکۃ المکرمہ اور اس کے نواح میں ۵۷۹ھ سے پہلے کسی مدرسہ کا نشان نہیں ملتا۔ ۵۷۹ھ میں امیر فخر الدین زنجیلی نے مکہ معظمہ میں ایک مدرسہ بنوایا تھا اس کے بعد ہی دیگر مدارس کے قیام کا علم ہوتا ہے اندلس (اسپین) جس کو یورپ کی استادی کا فخر حاصل ہے اس کے بارے میں علامہ مقری تک نے اقرار کیا ہے کہ تمام اسپین میں ایک بھی مدرسہ نہیں تھا صرف مسجدوں کے صحن تھے جن میں تمام علوم و فنون پڑھائے جاتے تھے (دیکھئے: نفح الطیب تاریخ اندلس مطبوعہ فرانس ۱/۱۳۶)۔

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں: ہم قرطبہ (کارڈوا) غرناطہ (گرینڈا) کی شہرت وعظمت کے منکر نہیں ہیں قرطبہ کے نقشہ میں ہم ۳۸۳۷ مسجدیں ۷۰۰ حمام ۱۴۳۰۰۰ عام رعایا کے مکانات دیکھتے ہیں لیکن اس تمام وسعت میں کسی کالج یا اسکول کا نشان نہیں ملتا (مقالات شبلی ۳/ ۴۷)۔

متحدہ ہندوستان میں بھی علم کی سوتیں مساجد کی راہوں سے ہی جاری ہوئیں۔ بعد میں مدارس کے لئے الگ سے عمارتیں بنانے کا سلسلہ جاری ہوا۔ یادایام کے مصنف لکھتے ہیں:

ہمارے پیرومرشد روحی فداہ نے خاک پاک مدینہ میں جو پہلی عمارت بنائی تھی اور جس کو مسجد نبوی کہتے ہیں وہ ہمارا پہلا مدرسہ تھا اس کے بعد جتنی مسجدیں دنیا میں تیار ہوئیں انہی کو آپ مدارس سے تعبیر کرسکتے ہیں تعلیم کا پرانا طریقہ یہ تھا کہ استاذ مسجد میں آکر بیٹھ جاتا اور اس کے گردوپیش شاگردوں کا حلقہ بن جاتا اساتذہ خالصاً لوجہ اللہ تعلیم دیتے اور ان کے شاگرد چٹائیوں پر بیٹھ کر دود چراغ کھا کر تحصیل علم کرتے، بڑے بڑے شہزادوں کو بھی اگر علم کا ذوق ہوتا تو وہ بھی مسجدوں میں جاتے اور اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب کرکے بیٹھتے یہی طریقہ چوتھی صدی ہجری تک علی العموم جاری رہا اس کے بعد سب سے پہلے نیشاپور میں مدرسہ کے لئے شاندار عمارت بنائی گئی اس کے بعد مولانا نے ہندوستان کی چند مسجدوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں جونپور کا اٹالہ کی مسجد، لاہور میں وزیر خان کی مسجد، نئی دہلی میں ماہم بیگم کی مسجد، پرانی دہلی میں مسجد فتحپوری، سورت میں مرجان شامی کی مسجد کا خاص طور سے تذکرہ کیا ہے (یادایام/ ۳۲)۔

اس وقت دنیا کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی جامعہ ازہر مصر ہے اس کی بھی شروعات مسجد سے ہوئی آج بھی وہ مسجد موجود ہے، متحدہ ہندوستان کی سب سے بڑی دینی وعلمی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی بھی شروعات چھتہ کی مسجد سے ہوئی، مفتاح العلوم مئو یوپی کی مسجد کا آغاز بھی کٹرا کی مسجد سے ہوا، اورنگ زیب عالمگیرؒ نے اورنگ آباد میں جامع مسجد کی تعمیر کی اور اسی کو تعلیم کا مرکز بنایا، فتاوی کی شہرۂ آفاق کتاب فتاوی عالمگیری کی تدوین کا عظیم الشان کارنامہ

بھی اسی مسجد میں انجام پایا، بعد میں اس کے گرد مدرسہ کے لئے الگ سے عمارتیں بنوائیں، جو اب مدرسہ کاشف العلوم کے نام سے موسوم ہے۔ ان کے علاوہ ہزاروں مدارس ملک میں ایسے ہیں جن کی شروعات مسجدوں کی چٹائی اوران کی بوریوں سے ہوئیں۔ طوالت کے خیال سے ہم ان کا تذکرہ چھوڑتے ہیں مگر مذکورہ بالا تاریخی حقائق ذکر کرنے کا مقصد ملت میں اس شعور کو بیدار کرنا ہے کہ مساجد کو دوبارہ تعلیم گاہ بنانے کی تحریک شروع کی جائے۔

جن مدارس میں نظام تعلیم قائم ہے ان کو مفید اور چوکس بنانے کی سعی کرتے ہوئے انہیں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے اوران کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ شہروں سے دوراور شہری سہولیات سے محروم دورافتادہ علاقوں کی مساجد کی ٹوٹی پھوٹی چٹائیوں پر بیٹھ کر چھوٹی چھوٹی عمروں کے معصوم نونہالوں کو خدا اور رسول، عقائد اور بنیادی اعمال سے روشناس کرانے والے معلمین انگلیاں پکڑ کر حروف شناسی کرانے والے اساتذۂ کرام کا ہم احسان مانیں کہ انہیں کے دم خم اور مخلصانہ کوششوں سے اس پرفتن دور میں بھی نئی نسلوں میں دینی شعور زندہ ہے۔ ہم بعض اوقات دانستہ یا نادانستہ طریقہ سے ان معلمین کے سلسلے میں غلط زباں استعمال کر جاتے ہیں جو ہم سب کے لئے لمحۂ فکریہ اور تعلیم کی راہ میں سد باب ہے۔ حالانکہ رسمی مدارس کے مقابلہ میں ان معلمین کو تعلیم کی راہوں میں غیر معمولی مشقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کے باوجود معاشرہ میں انہیں میاں جی مولی صاحب ملاجی وغیرہ الفاظ کے ذریعہ پکار کران کے عظیم کاموں سے صرف نظر کیا جارہا ہے حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ مدارس کے مقابلہ مساجد کی تعلیم اوران کے معلمین کو اہمیت دی جاتی، کیونکہ رسمی مدارس کے مقابلہ مسجدوں میں نظام تعلیم قائم کرنا سہل ہی نہیں سہل تر ہے، نہ جگہ کی تلاش نہ عمارت کی فکر نہ معلمین کے طعام وقیام کی الگ سے ذمہ داری صرف انہیں مساجد کے ائمہ کرام کو مزید وظیفہ دے کر یہ اہم کام لیا جاسکتا ہے۔ غور کیجئے مدارس کے لئے زمین کی فراہمی مکانوں کی تعمیر وغیرہ کتنا اہم مسئلہ ہے پھر بھی مطلوب نتیجہ سے ہم بہت

دور ہیں۔لہذا نئے نئے غیر ضروری مدارس کے قیام سے گریز کرتے ہوئے مساجد کو تعلیم کا مرکز بنانے کی فکر اہل علم ودانش اور رہنمائے قوم وملت کو کرنی چاہئے ممکن ہے کہ بعض اہل علم کو مساجد میں دی جانے والی تعلیم اور طریقہ تعلیم کے بعض عیوب ونقائص سے دل برداشتگی ہو اور وہ اب اس کی افادیت کے قائل نہ ہوں ان کی خدمت میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی تذکیر بسورۃ الکہف کا مختصر سا اقتباس لکھ کر اپنے مقالہ کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لکھتے ہیں:

انتہائی کس مپرسی کے حالات میں گم نام قصبوں اور دیہاتوں کی مسجدوں کے گوشوں میں کچھ پڑھنے پڑھانے والے سمٹ گئے تھے تعلیمی نصاب نقائص وعیوب سے معمور تھا نہ عصری تقاضوں کے مطابق علوم وفنون کی کتابیں اس میں شریک تھیں نہ دنیا کی موجودہ علمی زبانوں میں سے کسی زبان کو اس نصاب میں جگہ دی گئی تھی لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ مذکورہ بالا عیوب ونقائص سے پاک کرکے ان مدارس کو بھی عصری جامعات اور کلیات کے مطابق بنادیا جاتا تو دینی فتنہ کے پچھلے تاریک دنوں میں بچی کھچی نجات کی کچھ کشتیاں جو میسر آرہی ہیں جو ایمان وعمل صالح کی زندگی کے ساتھ قبر کے کناروں تک پہنچنے میں اب تک کامیاب ہوئے ہیں کیا ہم ان نجات کی کشتیوں کو پاسکتے تھے (ص ر ۲۵۴)۔

اخیر میں میری گذارش ہے کہ معقول تنخواہ دے کر باصلاحیت ائمہ کرام مساجد میں مہیا کئے جائیں اور تعلیم کی ذمہ داری ان کے سپرد کی جائیں مساجد میں کل وقتی اور جز وقتی، صباحی اور مسائی نظام تعلیم بنائے جائیں تاکہ ہماری آنے والی نسلوں میں دینی شعور اور مزاج برقرار رہ سکے اور مدارس کو بھی اچھے طلباء میسر ہوسکیں۔

☆☆☆

چوتھا باب

مدارس اور کتب خانے

دینی مدارس کے کتب خانے جمود و ترقی کے آئینہ میں

مفتی محمد ارشد فاروقی ☆

لوح محفوظ اولین کتب خانہ

علم کی صفت الٰہی کا ظہور "علم الانسان مالم یعلم" سے وحی کے ذریعہ ہوا، اس علیم کے علم کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا؛ جیسی اس کی ذات لامتناہی ویسی ہی اس کی صفات غیر محدود، وہی علیم وہی علام، اسی کے عطا کردہ علم سے انسانوں کے دماغ روشن، ضمیر منور، اسی کے نور علم سے عالم ضوفشاں، الله نور السموٰت والأرض علیم وخبیر کے علم کی حفاظت کا مسئلہ نہیں کہ یہ اس کی صفت ہے، وہ بذاتہ العلیم کے ساتھ الحفیظ ہے؛ البتہ اس کی صفت علم کے ظہور کا مخزن "لوح محفوظ" ہے، "بل هو قرآن مجید فی لوح محفوظ" اس طرح اگر تعبیر درست ہو تو تعلیم کا اولین مدرسہ درس گاہ الٰہی ہے اور اولین وآخرین کتب خانہ لوح محفوظ ہے، اس طرح علم مدرسہ، اور کتب خانہ ایک ایسا مثلث ہے کہ انفکاک ناممکن ہے۔

زبور، توریت، انجیل، صحف ابراہیم وموسی کو بہ حفاظت رکھنے کا ہمیشہ اہتمام ادب واحترام کے ساتھ کیا گیا جس طرح ان کی تعلیم کا انتظام ہوتا رہا، اس طرح علم ومدرسے وکتب خانے کا رشتہ جڑا رہا۔

جب منشاء الٰہی کے مطابق آسمان کا رشتہ زمین سے چھٹی صدی عیسوی کے بعد جڑنے

☆ صدر شعبۂ افتاء جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند

لگا اور حراء میں نور چمکا، العلق کی ابتدائی پانچ آیات کا نزول "اِقرا" سے ہوا تو رسول معظم نے اپنے قلب ودماغ میں ان آیات کو محفوظ فرما لیا اور جب وحی کا تسلسل رہا تو بڑی جان فشانی سے حفظ وحی فرماتے، تو الحفیظ نے حفاظت کی ذمہ داری لی: لاتحرک به لسانک لتعجل به إن علینا جمعه وقرآنه۔

جمع قرآن کا ایک طریقہ تو حفظ قرآن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی ذمہ داری خود لی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب ودماغ میں قرآن رچ بس گیا کہ ام المومنین عائشہ فرماتی ہیں: کان خلقه القرآن۔

اسی کے ساتھ وحی الٰہی کے کاتبین مقرر ہوئے اور نزول وحی کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کاتبوں کو لکھنے کا حکم فرماتے، رفتہ رفتہ جستہ جستہ آپ صلی اللہ کی تعلیم کے مطابق آیات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ترتیب کے موافق لکھ لی جاتیں، اور قرآن کریم مکمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں تحریر میں ضبط کر لیا گیا۔

حفاظت علم کے دو طریقے

"إن علینا جمعه" میں اشارہ ملتا ہے کہ ہر دور میں علم کی حفاظت وجمع کے دونوں طریقے کا وجود ضروری ہے: ایک حافظہ انسانی میں محفوظ ہو اور دوسرے تحریر وکتاب کی شکل میں موجود ہو، یہی سنت الٰہی ہے کہ کتب الٰہی کے ساتھ انبیاء ورسل کی بعثت ہوتی رہی اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرآن کریم جسے "ہدی للناس" قرار دیا کا نزول ہوا۔

دو طرح کے کتب خانے

علوم کی حفاظت کے لئے دو طرح کے کتب خانوں کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی۔ ایک شخصیات کی شکل میں دوسرے متداول نظام کتب خانہ کی شکل میں۔

علامہ انور شاہ

سلف میں ایسی مثالیں بہت ہیں جن کو چلتے پھرتے کتب خانے کے نام سے یاد کیا جاتا۔ ہندوستان کیا عالم اسلام کی وہ آخری شخصیت جو اس کا مصداق تھی وہ حضرت الامام علامہ انور شاہ کشمیری تھے۔

امام محمد قاسم نانوتوی

جماعتِ دیوبند کے سرخیل بانی دارالعلوم قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بھی اپنی مثال آپ تھے، وہ ایک مکتوب کے جواب میں لکھتے ہیں: ''میرے پاس کتابیں نہیں ہوتیں''، حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ فرماتے ہیں: ان کے پاس قرآن کریم، صحیح بخاری اور مثنوی مولانا روم ہوتی۔ قابل غور یہ امر ہے کہ کتب کی عدم موجودگی کے باوجود جب وہ خطاب فرماتے یا تصنیف کرتے تو ایسے علوم کے دریا بہتے اور اسرار وحکم شریعت، متکلمانہ انداز میں بیان ہوتے جس کی نظیر نہیں، اور وہ علم کلام کو اپنے دور کے مطابق ڈھالنے والے تھے، اس لئے ایسا کتب خانہ ہی چلتا پھرتا کتب خانہ کا مصداق ہوسکتا ہے۔

لوح محفوظ حافظہ الٰہی

جب ذکر نانوتوی کا آ گیا تو موضوع سے متعلق ان کی ایک تقریر کا خلاصہ پیش کرنا مفید ہوگا۔ حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ نے فرمایا: 'مولانا نانوتویؒ سے پوچھا گیا کہ لوح محفوظ آخر کتنی لمبی چوڑی ہے کہ اس میں ہر چیز محفوظ ہے۔ نانوتوی نے سائل سے دریافت کیا کہ آپ کو بچپن کی باتیں یاد ہیں؟ عمر کے مختلف مراحل کے واقعات یاد ہیں؟ جواب ملا ہاں اگر تحریر میں لائی جائیں تو دفتر کے دفتر تیار ہو جائیں۔ حضرت نانوتوی نے سوال کے جواب کی اس تمہید کے

بعد فرمایا: جب آپ کے حافظہ میں آپ کی زندگی کے احوال کے دفتر کے دفتر موجود ہیں تو خالق کائنات کے حافظہ کا کیا پوچھنا۔ لوح محفوظ اللہ تعالیٰ کا حافظہ ہے (اقتباس از ایک مجلس)۔

ظرفیت میں کتب خانہ کا مفہوم

"بل هو قرآن مجيد فى لوح محفوظ" لوح کو ظرف بتایا گیا جس سے ظرفیت کا معنی واضح ہے اور اسے کتب خانہ کا نام دیا جاسکتا ہے۔

حضرت نانوتوی نے جو اسلوب اختیار کیا اس سے بھی اس مفہوم کی تاکید ہوتی ہے۔

کتب قیمۃ

البینہ کی آیت "فيها كتب قيمة" کے ترجمے میں کتب کا ترجمہ جہاں احکام کیا گیا وہیں کتابیں بھی کیا گیا (ترجمہ عبدالقادرؒ) احکام مانیں یا کتابیں ان کا ظرف صحف قرار دیا گیا تو احکام یا کتابوں کو رکھنے کا مفہوم پایا گیا، اسی مفہوم کی حقیقت کتب خانے ہیں۔

آپؐ کے گھرانے کتب خانے

قرآن کے نزول کے دورانیہ اور تکمیل کے بعد رسول اللہ کے گھرانے کتب خانے تھے اور سب سے بڑی متاع لکھی ہوئی آیات وسورتیں تھیں۔ ام المؤمنین حفصہؓ کے یہاں سے خلیفۃ المسلمین سیدنا عثمانؓ نے قرآن کریم کا نسخہ حاصل کیا، یہ ام المؤمنین کی ذاتی لائبریری میں محفوظ تھا۔

دور جاہلیت اور کتب خانے

اسلام کی آمد کے دور اولین میں کتب خانے کا وجود واہمیت کا اندازہ سطور بالا سے ہوتا ہے، اس کے بعد علم کی وسعت کے بہ قدر کتب خانہ وسیع ہوتا چلا گیا لیکن دور جاہلیت میں بھی کتب خانے کا وجود ملتا ہے بلکہ پبلک لائبریری پائی جاتی تھی، جب شعراء شعر کہتے تو اسے اس

وقت کی سب سے عام جگہ بیت اللہ میں رکھ دیتے، "المعلقات" کی یہی تشریح ہے۔

ارتقائی مراحل

علم کے ساتھ تمدنی ادوار ارتقاء میں کتب خانہ کی معنویت وجامعیت بھی ارتقائی مراحل سے گزرتی رہی اور ظاہری صورت بھی بہتر سے بہتر بنتی رہی، نظم ونسق نے اس کے حسن میں اضافہ کیا اور عالمی سطح پر موجودہ کتب خانے کے وجود نے دنیا کے علوم کو حسین شکل میں پیش کرنے کے ساتھ استفادے کو آسان تر بنادیا، جدید ذرائع نے خوبصورت ترین وسہل ترین بنادیا۔

علم، مدرسہ، کتب خانہ ایک مثلث

دینی مدارس اور کتب خانے میں سے کسی ایک کا تصور دوسرے کے بغیر نہیں کیا جاسکتا، گوان دونوں کا رشتہ عدم توازن وعدم اعتدال کا شکار زیادہ تر رہتا ہے۔

علم جن ادوار سے گزرتا رہا اسی رفتار سے مدرسے اور کتب خانے وجود میں آتے رہے، جب علم کی شمعیں روشن ہوئیں، مدارس کے مینار بلند ہوئے، کتب خانے سنگ میل بنے اور جب علم کی قندیلیں ماند پڑیں، رفتار رکی، جمود وتعطل کا بھیانک سایہ پڑا، تب مدارس ویران ہوئے عمارتیں کھڑی رہیں، ذہن ودماغ پر بجلی گری، فکر فرزانہ جہالت کے دلدل میں پھنستی دھنستی گئی اور علمی ورثہ، کتابوں کا مجموعہ "کتب خانہ" گرد وغبار کی دبیز تہہ میں ہیرے کی طرح چھپ گیا، بازاروں میں ردی کے بھاؤ بک گیا۔

دینی مدارس کے کتب خانوں کی تاریخ

ہندوستان میں مدارس دینیہ کی تاریخ کئی صدی پر محیط ہے اور یہی تاریخ مدارس کے کتب خانوں کی ہے، البتہ اس مختصر تحریر کو ایک خاص عرصہ تک محدود رکھا گیا ہے۔

دینی مدارس

جب سلطنت مغلیہ کا زوال ہوا اور انگریز ہندوستان پر قابض ہوئے تو یہ قبضہ صرف سرحدی زمینی قبضہ نہ تھا بلکہ تہذیبی اور فکری قبضہ تھا، عقائد اسلامیہ و تشخص اسلامی کو مٹانے کا حملہ تھا، اس لئے جو دینی مدارس موجود تھے وہ مختلف اسباب کے تحت ختم ہونے لگے، سلطنت کے خاتمے نے ان کا خاتمہ کر دیا اور مسیحیت کی اشاعت کے لئے اسکول مشنری کے تحت پورے ملک میں کھلنے لگے، ایسی کڑی گھڑی میں سرخیل جماعت دیوبند قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اپنے جلیل القدر موقع شناس رفقاء کے تعاون سے دیوبند میں عربی مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور اسے صرف مدرسہ نہیں تحریک قرار دیا۔ اس مدرسے کے نصاب میں شاہ ولی اللہ کے علوم قرآنیہ اور احادیث نبویہ، فرنگی محلی کے فقہ، خیر آبادی منطق و فلسفہ، عربک کالج دہلی کے علوم عصریہ کو شامل کرنے کے ساتھ اس دور کی ہر ضروری صنف علم کو حصہ نصاب بنایا۔ اور حج سفر سے لوٹتے وقت جب عیسائی مبلغ سے ترجمان کے ذریعہ گفتگو ہوئی تو اس کی خواہش کا اظہار فرمایا کہ زندگی نے وفا کی تو انگریزی سیکھوں گا تاکہ براہ راست اپنی بات کہہ سکوں۔

اس ادارے کے قیام کے بعد اس نہج پر مدرسے قائم ہوتے گئے اور نصف صدی تک یہی طرز ہر لحاظ سے ہر حلقہ میں مقبول رہا۔

اس کے بعد تبدیلی کی ضرورت کا احساس زمانے کے مفکرین کو ہوا اور ندوۃ العلماء کے تحت دار العلوم لکھنؤ میں قائم ہوا۔

پھر مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں وجود میں آیا۔

اور سہارنپور میں مظاہر علوم دیوبند میں مدرسہ کے قائم ہونے کے چند ماہ بعد قائم ہوا۔ البتہ وہاں طرز تدریس میں مطلوبہ جامعیت کی کمی کا احساس حد درجہ یکسوئی کے لئے باعث پایا جاتا ہے۔

دیوبند، سہارنپور، لکھنؤ، سرائے میر کے مدارس کے طرز پر ہندوستان میں مدارس کی بڑی تعداد موجود ہے اور ان کا انتساب دیوبندیت کی طرف ہوتا ہے، اس لئے ان مدارس میں موجود کتب خانوں کو دیوبندی کتب خانے سے تعبیر کیا جائے گا۔

۱- دیوبندی کتب خانے

دارالعلوم دیوبند میں موجود کتب خانے کا شمار ملک کے بڑے ممتاز تاریخی کتب خانوں میں ہوتا ہے۔ درسی کتب کی تعداد کئی لاکھ ہے اور دیگر علوم وفنون پر مشتمل کئی ہزار، ان میں درجنوں نایاب سینکڑوں کمیاب ہیں۔ یہ انتہائی قیمتی اثاثہ ہے۔ وقف دارالعلوم نے بھی ربع صدی کی مدت میں مفید جامع کتب خانہ تیار کرلیا ہے۔

دارالعلوم کا کتب خانہ تعلیمی اوقات (۶ گھنٹے) میں کھلتا ہے۔ جب امتحان قریب ہوتا ہے تو رات میں مقررہ وقت کے لئے محدود حصہ کھلتا ہے۔ اب ایک بڑی عمارت کتب خانے کے لئے زیر تعمیر ہے۔ خدا کرے جدید ذرائع سے مرصع ہو۔

مظاہر علوم سہارنپور کے جدید وقدیم کتب خانے کو ملا کر دیکھیں تو کتابوں کا عظیم ذخیرہ موجود ہے، وقف مظاہر میں قدیم مراجع زیادہ ہیں تو مظاہر جدید میں جدید مراجع زیادہ ہیں۔ دونوں جگہ کا نظم ادارہ کے تابع ہے۔

طلبہ کے کتب خانے

دارالعلوم دیوبند ومظاہر علوم سہارنپور کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں طلبہ کی ضلعی انجمنیں تقریر وتحریر کی مشق کے لئے قائم ہیں اور ہر انجمن کے پاس ایک لائبریری ہے، خواہ وہ ایک الماری میں ہی بند ہو۔ اس میں ان کی ضرورت کی کتابیں ہوتی ہیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا کتب خانہ پرشکوہ عالیشان کئی منزلہ عمارت میں استفادے

کی دعوت دیتا ہے، درسی وغیر درسی کتب کا بڑا ذخیرہ ہے، اور استفادے کو آسان بنانے کی ممکن کوشش کی گئی ہے۔ تعلیمی اوقات میں کھلتا ہے اور رات میں بھی ایک خاص حصہ طلبہ کے لئے کھلا رہتا ہے۔

ندوہ میں تمام طلبہ کے لئے ایک انجمن ہے جس کی مستقل لائبریری ہے، اس میں طلبہ کے اندر خطابت و مقالہ نویسی کی صلاحیت اجاگر کرنے سے متعلق کتابیں ہیں۔

ندوہ کی قابل تقلید خصوصیت

کتب خانے ولائبریری کے حوالہ سے استفادے کی سہولت کے لحاظ سے ندوۃ العلماء کا یہ اقدام قابل ستائش وتقلید ہے کہ ارباب حل وعقد نے ندوہ کے ہر ہاسٹل میں ایک کتب خانہ کی سہولت رکھی ہے جس میں اس ہاسٹل کے طلبہ کے درجات کے لحاظ سے کتابیں ہوتی ہیں اور نگراں کی موجودگی میں رات کے مطالعہ کے لئے مختص دورانیہ میں طلبہ استفادے کے لئے پابند ہوتے ہیں۔

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ اس نے اپنا نام ابھی تک مدرسہ تک محدود رکھا ہے، اس میں موجود کتب خانہ میں غیر درسی کتب کی تعداد چھ ہزار سے زائد ہے۔ اس کے کھلنے کا وقت بھی تعلیمی دورانیہ ہے۔

اہم امتیاز: مدرسۃ الاصلاح کا اہم امتیاز یہ ہے کہ اس میں ایک بہت وقیع گوناگوں علمی اصناف پر مشتمل لائبریری صرف طلبہ کے لئے ہے، اور جگہ کی وسعت، کتب کے تنوع، نظام کی بہتری کے اعتبار سے علمی دنیا میں نمایاں ہے۔

دیوبندی طرز کے مدارس جو ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہیں اور ایک دو کمرے کی مکانی حیثیت رکھتے ہیں یا لق ودق عمارت میں قائم ہیں ان کے دامن میں درسی کتب کا ذخیرہ ایک گوشہ یا حجرہ یا عمارت میں موجود ہے اور ارباب انتظام مطمئن ہیں۔

۱- بریلوی کتب خانے

بریلوی مکتب فکر کی مشہور درسگاہ جامعہ اشرفیہ مبارکپور اعظم گڑھ میں ہے، اس کا مکتبہ اپنے جلو میں کئی ہزار کتابیں رکھتا ہے اور رد دیوبندیت پر کتب کی بڑی تعداد موجود ہے جس طرح دیوبندی کتب خانے میں رد بریلویت پر مشتمل کتب ہوتی ہیں۔

بریلوی مکتب فکر کے مدارس کے تقلیدی کتب خانے بھی زیادہ تر تدریسی کتب اور ان کے متعلقات سے پُر ہیں، نظام بھی بندھا ٹکا سا ہے، بریلی کے مدرسے میں مولانا احمد رضا خانؒ کی تصنیفات و قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔

۳- اہل حدیث کتب خانے

ملک میں اہل حدیث حضرات کے مدارس بھی متعدد ہیں اور حجم کے اعتبار سے ضخیم بھی ہیں، ان کی بڑی درسگاہ جامعہ سلفیہ بنارس ہے، اس کے کتب خانے میں جدید مراجع اور نئی مؤلفات کی کثرت ہے، درسی کتب حسب ضرورت ہیں۔ اس میں ایسی کتابوں کا بھی وجود ہے جو مقلدین ائمہ کی تقلید کو ناپسند کرتی ہیں، جس طرح مقلدین کے کتب خانوں میں عدم تقلید کو ناپسند کرنے والی کتابیں پائی جاتی ہیں۔

جامعہ دار السلام عمر آباد

یہ جامعہ اعتدال پسندی کا نمونہ ہے، بڑی خوبصورت عمارتیں سلیقہ مندی کا پتہ دیتی ہیں، نستعلیقی اسلوب زائر کی داد لئے بغیر نہیں رہتا، اسی صاف ستھرے ذوق کا عکاس مکتبہ کتابوں سے مالا مال ہے۔

شیعی مدارس

ہندوستان کے مختلف شہروں میں شیعہ آباد ہیں۔ ان کے مکاتب کی انجمن تنظیم المکاتب

ہے اور مدرسے بھی بنارس، لکھنؤ کے مدارس شہرت رکھتے ہیں۔ دہلی میں بھی کئی مدرسے قائم ہوئے ہیں۔ گو ان کی علمی مرجعیت قم کو حاصل ہے۔ ان کے کتب خانے میں مناقب اہل بیت پر کتب دستیاب ہیں تو معزز شخصیات سے اظہار ناپسندیدگی کے مضامین پر محتوی کتب بھی ہیں۔

شافعی کتب خانے

ہندوستان کے ساحلی علاقے میں حضرات شوافع کی آبادی پائی جاتی ہے، ان کے مدارس میں جامعہ اسلامیہ بھٹکل بڑا مدرسہ ہے، اور تعلیمی امور میں ندوۃ العلماء سے منسلک ہے، اس ادارے کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ۹۵ فی صد طلبہ صرف بھٹکل شہر کے دارلاقامہ میں رہ کر تعلیم پاتے ہیں، اس کے کتب خانہ میں فقہ شافعی کے مراجع بڑی تعداد میں ہیں۔

سرسری جائزہ بتاتا ہے کہ پانچ طرح کے کتب خانے دینی مدارس میں پائے جاتے ہیں۔ دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، شافعی اور شیعی مکاتب فکر کے ملک میں پھیلے کتب خانوں میں کئی کروڑ کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے جو ملت اسلامیہ ہندیہ کا بہترین اور قیمتی سرمایہ ہے۔ اس کی حقیقی قدر دانی اس سے استفادہ ہے۔ اس لئے بہتر سے بہتر استفادے کی صورتیں نکالنا منتظمین کا فرض منصبی ہے، اگر ان اثاثوں پر تالے پڑے رہیں تو ایسا ہی ہے جیسے کسی خزانہ پر سانپ کی اجارہ داری ہو۔

کوتاہیوں کا ازالہ

عموماً بڑے مدارس کے ساتھ چھوٹے مدارس کے کتب خانے صرف تعلیمی اوقات میں کھلتے ہیں، تعلیم میں مصروف ہونے کے باعث طلبہ فائدہ نہیں اٹھا پاتے، اس لئے سفارش کی جاتی ہے کہ تعلیمی اوقات کے علاوہ کتب خانے کے دروازے کھلیں۔

☆ طلبہ میں کتب بینی اور مطالعہ کا شوق پیدا کیا جائے

☆ مطالعہ کا طریقہ سکھایا جائے

☆ مدارس ہر سال کتب خانہ کے لئے معقول رقم بجٹ میں مختص کریں

☆ جدید ذرائع کا استعمال کیا جائے

☆ سند یافتہ لائبریرین کا انتخاب کیا جائے

پانچ مکاتب فکر کے کتب خانے کے اثرات

دینی مدارس میں پائے جانے والے پانچ مکاتب وفرقے کے پانچ علمی ذخائر کے جامع کتب خانوں کے امت پر اثرات کیا مرتب ہو رہے ہیں اس کا تجزیہ بھی ضروری ہے۔ کسی زمانے میں مسلکی تشدد کو ہوا دی گئی تو خون ریزی تک بات پہنچی اور عباسی دور میں شوافع وحنابلہ کے مابین شدید اختلافات ہوئے، لڑائیاں ہوئیں، معتزلی واشعری اختلافات بھی جنگ کی صورت اختیار کر گئے۔ اس دور میں امریکا واسرائیل مسلمانوں کو دو بلاک (سنی شیعی) میں تقسیم کرنے پر پھر آمادہ ہے۔ ایک طرف مقلدین وغیر مقلدین ایک دوسرے پر سخت تنقید کرتے ہیں، بریلوی دیوبندیوں کو حق کلمہ گوئی سے بھی محروم کرنے پر آمادہ ہیں۔ یہ سوچ یہ فکر ان کتابوں کی رہین منت ہیں جو کتب خانوں میں قرینے بے قرینے رکھی ہیں۔

یہ کتب خانوں کے ردعمل ہیں اس لئے کتب خانوں کا صحیح مقاصد کے لئے استعمال ضروری ہے، ان سے ایسی کتابیں منتخب کی جائیں جو وحدت کی تعلیم دیتی ہوں، تفرقہ سے نفرت دلاتی ہوں اور فضلاء کی ایسی جماعت تیار کی جائے اور ان کی ایسی تربیت کی جائے کہ وہ اعداء کی چال سمجھیں، اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کریں، امت کو انتشار واختلاف سے بچائیں، اختلافی امور میں راہ اعتدال اپنائیں، دوسرے فریق کو معذور سمجھیں۔ اس کے اختلاف مسلک کو جنگ کے راستے پر نہ لے جائیں۔

گروہ بندی کے نقصانات

مسلکی گروہ بندی کے نقصانات میں مضر ترین یہ ہے کہ دنیا مسلمانوں اور اسلام کی خصوصیات سے ناواقف ہو جائے گی۔اور وہ سنجیدہ کاوشیں بے سود ہو جائیں گی جو دعوت اسلام کے محاذ پر جاری ہیں، اس لئے ہر باشعور، غیور مسلمان کی ذمہ داری بنتی ہے کہ اختلافات کو ختم کرنے کے لئے کوشاں رہے۔ان تمام دینی اداروں کا فریضہ ہے کہ وہ ایک سنجیدہ مستعد ٹیم تیار کریں جو امت کے کینسر کا خاتمہ کرے اور کلمہ کی بنیاد پر متحد کرے اور بنیان مرصوص کا مصداق بنے۔

احساس جاں گزیں ہو

ایسے افراد کے اندر یہ احساس جاں گزیں ہو کہ وہ علمی کمالات واختصاصات کسی معیار کو پہنچ جائیں، حقائق سے بالکلیہ واقفیت ضروری نہیں چونکہ احاطہ کرنے والی ذات باری تعالیٰ ہے۔ دین اور دینداری کے فرق کو سمجھیں، بین مسالک گفتگو، انٹرویو، سوال وجواب کے طریقے کو عام کریں، مسالک ومذاہب کے بننے کے عوامل پر نگاہ رکھیں، طلبہ کے درمیان مناقشے کی طرح ڈالیں، عالم اسلام میں پائی جانے والی گروہ بندی کے خاتمے کی سبیل کریں، ایسے اقدامات کریں جن سے وحدت قائم ہو، دوسرے کے قول کو سننے غور کرنے کی عادت ڈالیں۔

اصل شکل نظر آئے

دینی مدارس کے کتب خانوں میں ایسے مقالات اور تصنیفات کو جمع کیا جائے جو مذہبی مسلکی مشربی مکتبی جماعتی اور ذوقی عصبیتوں پر ڈھیر ساری مٹی ڈال دیں اور پڑھنے والے کا دماغ وضمیر ایسا آئینہ بن جائے جس میں القرآن والسنۃ اور مجتہدین ومجددین کی تشریحات اصل شکل میں نظر آئیں۔

مثبت کردار ادا کریں

موجودہ دور میں جو صہیونی سازش کام کر رہی ہے وہ امت مسلمہ کی تقسیم در تقسیم کر کے کمزور ترین کرنے اور ان پر کلی غلبہ پانے کی ہے اس لئے اسلامی و دینی کتب خانوں کا کردار بڑے نازک مرحلے میں داخل ہو چکا ہے، مصنفین و مؤلفین اور مفکرین کی ذمہ داری دو چند ہو چکی ہے۔ اب ضرورت ہے کہ کتب خانے اپنا کردار ادا کریں اور شیعی و سنی اپنے تشخص کے تحفظ کے ساتھ اتحاد قائم کرنے کے لئے مساعی تیز سے تیز تر کر دیں۔ اور دیگر اسلامی مذاہب کے اختلافی مسائل کو باہمی اختلاف و نزاع کا ذریعہ نہ بنائیں، گروہ بندی کی فضا ختم کریں اور ہر اختلافی مسئلے کو سمجھنے کی تہہ تک پہنچنے کی راہ اعتدال نکالنے کی کوشش کریں، اور نقطۂ اتحاد تلاش کریں۔

سنی و شیعی اتحادی فکر کے لئے علوی و صفوی شیعی فلسفے کا مطالعہ علی شریعتی کے مقالات اور تصنیفات کے ساتھ شیخ مہدی، شمس الدین، احمد الکاتب، عبدالحمید کی کتابیں پڑھنے والوں کے اندر شعور پیدا کرے گا۔

علامہ ابن تیمیہ کی مشہور کتاب منہاج السنۃ النبویۃ، فصل الخطاب فی اثبات تحریف کتاب رب الارباب، سید قطب کی ''الامۃ'' ایسی کتابیں ہیں جو گروہ بندی کی جگہ شیرازہ بندی کی صلاحیت پیدا کرتی ہیں۔ ان کے ساتھ المذاہب الاسلامیہ تیمور اور ابو زہرہ کی، اور ''الامۃ'' ناصیف نصار، محمد مبارک اور احمد فرحات کا مطالعہ بھی مفید ثابت ہوگا۔

دیوبندیت و سلفیت کشمکش دور کی جائے

دینی مدارس کے کتب خانوں میں دیوبندیت و سلفیت یا مقلدیت و غیر مقلدیت کے موضوع پر اختلافی کتب کا روز بہ روز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے، جو ان دونوں طبقوں میں پائے جانے والے اختلافات کے عکاس ہیں۔ بات صرف کتب اختلافیہ کی نہیں بلکہ نوبت مناظرہ تک

پہنچ رہی ہے، اس لئے ان دونوں طبقات کے مابین گروہی اختلاف کے ازالہ کے لئے ان کتابوں کے مطالعہ کی حوصلہ افزائی ضروری ہے، جوراہ اعتدال کی رہنمائی کریں۔

یہ طے ہے کہ علماء اہل حدیث وعلماء دیوبند مذاکرے کے ذریعہ ان اختلافات کوختم نہیں کر سکتے اس لئے ضلال وگمرہی کے فتووں سے گریز ضروری ہے، اور مفتی عزیز الرحمٰن، مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند نے اہل حدیث کا شمار اہل سنت والجماعت میں کیا ہے اس لئے اتفاقی امور پر اتحاد اور اختلافی امور میں ایک دوسرے کو معذور سمجھتے ہوئے زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھنا چاہیے۔ دونوں طرف کے اکابر علماء آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ میں اتحاد قائم رکھے ہوئے ہیں اس کی دعوت عام زندگی میں دی جائے، اوران کتابوں کے پڑھنے سے گریز کا مشورہ دیا جائے جو اختلافات پیدا کرتی ہیں۔

دینی کتب خانے کا دنیوی کتب خانے سے مقابلہ میں امتیاز

آج کی دنیا آسمان پر کمند ڈال رہی ہے، مادی ترقی روز بہ روز ہو رہی ہے، تجرباتی علم سائنس نے ایجادات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر رکھا ہے، اور چاند و مریخ تک تحقیقات کا دروازہ کھلا ہے۔ ان علوم کا احاطہ بھی کتب خانہ ہی کرتا ہے، اس لئے دینی مدارس کے کتب خانوں کے بالمقابل عصری علوم کے کتب خانے پوری دنیا میں جدید ترین ذرائع کی شکل میں موجود ہیں، انٹرنیٹ پر کتب کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ موجود ہے۔ اور دنیا کی توجہ کا مرکز ہے، اب سوال یہ ہے کہ دینی مدارس کے کتب خانوں کی ان عصری کتب خانوں کے تئیں کیا ذمہ داری ہے؟ جواب دو ٹوک ہے کہ دینی مدارس کے کتب خانے دینی رہنمائی کا علم رکھتے ہیں اور علم شریعت کا ماخذ اولین قرآن ہدی للناس ہے، اس طرح دینی کتب خانے دین کی روشنی دیگر تمام کتب خانے تک پہنچانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ان کا فریضہ منصبی ہے۔ دین کی روشنی قرآن کی قندیل ہر کتب خانے کو ہر علم کو مفید بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے، روشن کرنے کی لیاقت رکھتی ہے، اور یہ مرکزی

کردار ہے دینی مدارس کے کتب خانوں کا دنیا کے کتب خانوں کو صراط مستقیم پر گامزن کریں اور کتب خانوں کے غلط استعمال پر روک لگائیں، خیرامت اور خیر مکتبہ کا یہی تقاضا ہے۔

دینی کتب خانوں کے لئے چیلنج

آج غیر دینی کتب خانے نے دینی کتب خانے کے لئے جو مشکلات پیدا کی ہیں وہ دینی کتب خانے کے لئے چیلنج ہیں، جیسے مغربی استعمار، صہیونی معرکہ آرائی، آزاد بے ہنگم میڈیا، تعلیمی مشکلات، صنعتی و تکنیکی دشواریوں پر مبنی کتب خانے، مسلم ممالک پر تسلط کی بڑھتی کوششیں، اخلاقی اقدار، سیاسی واقتصادی فلسفے کے ساتھ مسلم امت کے اندر پائی جانے والی خرابیوں اور دشواریوں پر محیط کتب خانے جیسے مسلمانوں کی معاشی پسماندگی، غربت وفقر، جسمانی امراض، معاشرے کی بربادی، ذخیرہ اندوزی، نسلی وعلاقائی عصبیت کے سوا، یک قطبی نظام کی طاغوتی خواہش، اخلاقی ضمیر کی موت، روح کی پژمردگی، تشدد پسندی، خاندانی بکھراؤ، مخدرات کا استعمال، ذہن ودماغ پر چھاپے اور میڈیا کا فکری وعقلی کھلواڑ، کساد بازاری، پروپیگنڈہ بازی، آزادی وحریت کے مفہوم کا غلط استعمال، ایٹمی توانائی پر تسلط اغیار انسانی وجود کے لئے خطرہ، ان تمام مشکلات اور چیلنج سے معاصر عصری کتب خانے بھرے ہیں جو دینی کتب خانے کے لئے کھلا چیلنج ہیں۔

فساد کے مقابل اصلاح

ان فساد پھیلانے والے لٹریچر اور فکری یلغار کرنے والے کتب خانے کا مقابلہ اصلاح پر مبنی لٹریچر اور دینی کتب خانے کے ذریعہ ہی کیا جانا وقت کی ضرورت، انسانیت کی بقا، حیات کے ارتقاء کے لئے لازمی ہے۔ ان کا حل صرف اور صرف قرآن وحدیث میں ہے، دینی کتب خانہ کی اساس اور سب سے بڑا سرمایہ یہ قرآن وسنت ہے، قرآن فساد کا مقابلہ اصلاح سے سکھاتا ہے، فاسد لٹریچر کے مقابلہ میں صالح لٹریچر کا طاقتور ہونا ضروری ہے، قرآن ایمان کی تجدید پر زور

دیتا ہے جس میں ہر عصر کے مطابق مشکلات کے حل تلاش کرنے کی دعوت ہے، قرآن غلط کے مقابلہ صواب پسند کرتا ہے، مختلف صلاحیتوں کے نشوونما کی دعوت دیتا ہے، جسم وعقل اور نسل کے تحفظ کو فرض قرار دیتا ہے، مزاجوں کی رعایت اس کے خمیر میں ہے، ہر چیز میں عادلانہ تقسیم پر ابھارتا ہے، معاشرتی نیشنل وانٹرنیشنل قیام امن کا علمبردار ہے، روحانی ونفسیاتی جذبات کی رعایت رکھتا ہے، اخلاقی ضمیر کی رہنمائی کرتا ہے، صحیح تعلیم کی تلقین کرتا ہے، فکر رسا عقل کی بلندیاں عطا کرتا ہے، کوتاہ عقلی سے دور رکھتا ہے، شدت پسندی سے اجتناب سکھاتا ہے، دھوکہ دہی، جھوٹ، انسانی خواہشات پر بیجا بندش پر پابندی لگاتا ہے، زمینی آبادی کی بربادی کی ہر سوچ کا خاتمہ کرتا ہے۔

ان اصولوں پر مبنی دینی کتب خانہ دنیوی کتب خانے کے مقابلے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دینی مدارس میں موجود کتب خانے سے ان موضوعات کی کتابوں کو نمایاں مقام پر رکھنے کا انتظام کیا جائے۔ اور اساتذہ کی نگرانی میں طلبہ کو مطالعہ کی میز پر بٹھایا جائے، ان اصولوں کا تعارف کرایا جائے، ان کے ذہن ودماغ میں راسخ کیا جائے کہ ان کا ضمیر جاگ اٹھے، خیر کے فوارے ان افکار سے پھوٹیں، شرار بولہبی پر ڈھیروں اوس پڑے، باطل پاش پاش ہو۔ جاء الحق وزھق الباطل إن الباطل کان زھوقا۔

☆☆☆

دینی مدارس اور کتب خانے

مولانا رضوان احمد ندوی ☆

مدارس دینیہ اسلام کی حفاظت و بقا کے مضبوط قلعے اور علوم اسلامیہ کی ترویج واشاعت کے سرچشمے ہیں، یہاں دین کے داعی و مبلغ اور اسلام کے سپاہی و مجاہد تیار ہوتے ہیں اور ضلالت وگمراہی میں ڈوبی انسانیت کو نئی زندگی عطا کرتے ہیں، لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر علم وہدایت کی راہ پر گامزن کرتے ہیں، علماء کا یہی وہ امتیازی وصف ہے جس سے وہ سماج ومعاشرہ میں قبلہ نما کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن اب دنیا کے حالات بہت تیزی سے بدل رہے ہیں، الحاد وبے دینی کے فتنے نئے نئے روپ میں ظاہر ہو رہے ہیں، اسلام مخالف تحریکیں نئے منصوبوں کے ساتھ میدان عمل میں سرگرم ہو رہی ہیں کہ کس طرح اسلام اور مسلمانوں کو زک پہنچایا جائے، ان حالات میں اصحاب مدارس کی ذمہ داری ہے کہ وہ نئے حالات، نئے تقاضوں اور نئے فتنوں کا پوری تیاری اور عالمانہ بصیرت وداعیانہ حکمت کے ساتھ مقابلہ کریں، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے: ”آج زمانے کے خیالات اور دنیا کے واقعات میں اس تیزی سے تبدیلی ہو رہی ہے کہ ان کو جانے اور سمجھے بغیر آپ مسلمانوں کی خدمت نہیں کر سکتے، دنیاوی، سیاسی اور اقتصادی خیالات ایسے چھائے ہوئے ہیں اور انقلاب کی گھڑیاں وہاں اس طرح پے در پے آرہی ہیں اور گزر رہی ہیں کہ ایک عالم دین کے لئے جس کو مسلمانوں کا خدمت گزار ہونا ہے ان کو سمجھنا اور ان کے حل کی تدبیریں سوچنا ضروری ہے، صرف اعراض اور تغافل سے آپ ان مسائل کو حل نہیں

☆ امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ

کر سکتے، آپ کے توجہ نہ کرنے سے نہ دنیا اپنے قاعدے کو بدل سکتی ہے اور نہ زمانہ اپنے رخ کو پلٹ سکتا ہے، مشکلات کا مقابلہ کرنا اور موجودہ جدوجہد میں مناسب حصہ لینا اور ملک وقوم کی زندگی میں مسلمانوں کے مناسب مقام حاصل کرنے کی کوشش کرنا بھی ایک عالم دین کا فرض ہے" (حیات سلیمان ۱۱۷)۔ضرورت ہے کہ مخالفانہ ماحول کے رخ کو پھیرنے کے لئے مدارس کے نظام تعلیم وتربیت اور طریقہ تدریس کو معیاری اور پرکشش بنایا جائے، حاملین علوم نبوت کے اخلاق وکردار کو بلند کیا جائے، ان کی فکری قوتوں کو پروان چڑھانے اور دماغی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے لئے مطالعہ اور کتب بینی کے ذوق وشوق کو ابھارا جائے، معلومات کے دائرہ کو وسیع کرایا جائے، اس کے لئے ہر مدرسہ میں ایک معیاری کتب خانہ قائم کرایا جائے جو مختلف علوم وفنون: تفسیر وحدیث، تاریخ وسیر، فقہ واصول فقہ جیسے امہات الکتب کا بیش بہا خزانہ ہو، کیونکہ مدرسہ اور کتب خانہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، ان دونوں کی اساس اقراء اور قید والعلم بالکتاب پر قائم ہے اور جب تک اس عالم میں اقراء کا سلسلہ قائم رہے گا اس کی تحریک احیاء علوم وکتب کا دریائے فیض رواں رہے گا- تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی عہد میں مسلمانوں کی علمی تاریخ کا باب نہایت شاندار رہا ہے، خاص طور پر عہد عباسی کو اس باب میں امتیاز حاصل رہا ہے، اس دور میں کتب خانوں کی اتنی کثرت رہی ہے کہ اس سے قبل انسانی تاریخ کے کسی دور میں ہمیں کتب خانوں کی اتنی کثرت وتنوع کا کہیں سراغ نہیں ملتا، شاہان عباسی نے خزانۃ الحکمۃ، بیت الحکمۃ، خزانۃ الکتب قائم کرکے کتب خانہ سازی کی تحریک کو عالمگیر تحریک بنادیا۔

جب اسلام کی شعاع برصغیر ہندوپاک میں پھیلی تو ہندوستان کے ہر علم دوست سلاطین نے مدرسوں کے قیام کے ساتھ کتب خانے بھی تعمیر کرائے جس کی ایک طویل تاریخ ہے لیکن جب تک ان کتب خانوں سے استفادہ کرنے والے اصحاب علم وفضل موجود رہے کتب خانوں میں زندگی کی حرارت باقی رہی اور جب علمی زوال آیا، اخلاف نے اسلاف کے علمی ذوق کی قدر

نہ کی تو کتب خانے بھی ویران ہونے لگے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلابی عہد کے بعد جب علماء ہند نے ہندوستان میں مدرسوں کا جال بچھایا تو اس کے ساتھ ہی سیکڑوں ہزاروں کتب خانے بھی قائم کیے، ہر مدرسہ کے احاطہ میں کتب خانہ کی تشکیل عمل میں آئی۔ لیکن اب بھی بہت سے ایسے دینی مدارس ہیں جہاں مدرسہ کے منتظمین مدرسہ کے لئے فلک شگاف عمارتیں تعمیر کراتے ہیں، اس کو گنبد ومحراب سے مزین کرتے ہیں، مگر کتب خانہ کے قیام کے سلسلہ میں بڑی بے توجہی و بے اعتنائی برت رہے ہیں، اس پہلو پر اصحاب الرائے علماء کو غور کرنا چاہئے اور مدارس کے ذمہ داروں سے کہنا چاہئے کہ مدرسوں کے عام بجٹ میں کتب خانہ کی تعمیر اور کتابوں کی خریداری کو بھی لازماً شامل کریں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جن اداروں میں کتب خانہ قائم ہے وہاں مطالعہ کا ذوق وشوق اور کتب بینی کا مزاج کم ہوتا نظر آرہا ہے، جب کہ ہر ایک کتاب کے لئے اس کا پڑھنے والا چاہئے، پڑھنے والے کے بغیر کوئی کتاب چاہے وہ کیسے ہی قیمتی اور عالمانہ کیوں نہ ہو بے معنی و بے مقصد ہے، رابندر ناتھ ٹیگور نے ۱۹۲۸ء کی آل انڈیا لائبریری کانفرنس میں کہا تھا کہ: ''اگر لوگ کتب خانے سے استفادہ نہ کریں تو ایسے کتب خانہ پر فخر کرنا جہالت و نادانی کی بات ہوگی''۔ علامہ بدیع الزماں ہمدانی نے اپنے بھانجے کو ایک خط میں لکھا کہ ''تم میرے بیٹے ہو جب تک علم تمہاری شان اور مدرسہ تمہارا مکان ہے، قلم دوات تمہارا ساتھی ہے اور کتاب تمہاری دوست ہے، اگر تم اس میں کوتاہی کروگے تو پھر تمہارا کوئی مددگار نہ ہوگا'' (الرسائل لبدیع الزماں ہمدانی ۱۳۴۹ھ، ۱۲۴۹۱۵۲)۔ یہی وجہ ہے کہ مطالعہ سے عدم دلچسپی کے باعث مدرسوں کے اکثر کتب خانوں میں کتابیں منتشر اور بکھری رہی ہیں، بے ترتیب کتابوں پر گرد وغبار کی تہیں تک جم جاتی ہیں جن سے استفادہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے، اس بے حسی کو دور کرنے کی ضرورت ہے کہ کتابوں کو منظم اور مرتب انداز میں رکھا جائے، اس کے لئے مستقل ایک اندراج کتب رجسٹر بنایا جائے جس میں کتاب کا نام، مصنف کا نام، زبان، مطبع، سن طباعت اور صفحات کی تعداد کی صراحت ووضاحت ہو اور یہ بھی تحریر کردیا جائے کہ یہ کتاب لائبریری میں کب آئی اور کہاں سے

آئی، خریدی گئی ہے یا کسی نے ہدیہ وتحفہ میں عنایت کی ہے، پھر ان کتابوں پر مہر لگا کر فن وار الماریوں میں ترتیب اور سلیقے سے جمانی چاہئیں، ہر فن کی کتابوں پر علیحدہ علیحدہ چٹ لگا کر الماریوں میں رکھی جائیں ان کتابوں میں طلبہ کی ضرورت کے لحاظ سے درسی کتب کے کئی کئی نسخے کتب خانوں میں موجود رہیں تاکہ استفادہ میں سہولت ہو، اس کے علاوہ مختلف علوم وفنون کی غیر درسی کتب کا بھی معتد بہ ذخیرہ کتب خانے میں ہونا چاہئے، تاکہ اساتذہ وطلبہ فرصت کے اوقات میں ان سے استفادہ کرسکیں یا کسی موضوع پر تحقیق وریسرچ میں ان سے مراجعت کریں(۱)۔ یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ کتب خانے پرفضا مقام پر صاف ستھرے ہونے چاہئے تاکہ اس کے ظاہری حسن وجمال کے خوشگوار اثرات نظر پر پڑسکیں، کتب خانہ میں فن وار حروف تہجی کے اعتبار سے کٹلاگ کا بھی انتظام ہونا چاہئے تاکہ متعلقہ موضوع کی کتابیں آسانی سے دستیاب ہوسکیں۔ بہرحال جدید تعلیمی نظام میں کتب خانہ کی اپنی اہمیت رہی ہے اور اس سے کوئی بھی علم دوست حضرت بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ خدا کرے یہ چند کوئی چھوٹی سطریں اس بات کا داعیہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوں جس کے نہ ہونے سے ہماری تعلیمی زندگی میں ایک بڑا خلا پیدا ہو رہا ہے۔ یا ہونے کے باوجود عدم دلچسپی پائی جارہی ہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

حاشیہ:

(۱) جیسا کہ ملک کے بیشتر مرکزی اداروں میں اس طرح کا نظم ہے:

(الف) کتب خانہ دارالعلوم: دارالعلوم دیوبند کا کتب خانہ بڑا قیمتی اور معیاری ہے جس میں معرکۃ الاراء کتابوں کے علاوہ علوم عصریہ کی بھی قابل ذکر کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے، یہاں ایک لاکھ سے زیادہ کتابیں موجود ہیں۔

(ب) ندوۃ العلماء کا کتب خانہ: دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا کتب خانہ علوم اسلامیہ کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے جس میں پچاسی ہزار کتابیں ہیں ٦٧٠ کتابیں نوادرات میں شمار ہوتی ہیں۔

اور مختلف علوم وفنون میں مخطوطات کی تعداد تین ہزار کے قریب ہے۔

(ج) جامعہ رحمانی مونگیر کا کتب خانہ: جامعہ رحمانی مونگیر کا کتب خانہ شاندار اور جدید طرز کی عمارت میں قائم ہے جس میں تقریباً ۲۵ ہزار کتابیں ہیں۔

اس کے علاوہ مظاہر علوم سہارنپور، ضیاء العلوم رائے بریلی، دار العلوم حیدر آباد، سبیل السلام حیدر آباد، المعہد العالی الاسلامی حیدر آباد، جامعۃ الفلاح بلریا، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ، خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف وغیرہ جیسے اداروں کی لائبریریوں میں موزوں کتابوں کا بڑا ذخیرہ موجود ہے جس کی حیثیت علمی گلزار کی ہے۔

☆☆☆

پانچواں باب

مدارس میں عربی کی تعلیم

ہندوستان میں عربی زبان وادب
ماضی اور حال کے آئینہ میں

مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی ☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وخاتم النبيين محمد وعلى آله وصحبه أجمعين۔

حضرات! اس سیمینار کے لئے جو موضوعات اختیار کیے گئے ہیں، ان میں ایک موضوع ''دینی مدارس میں عربی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر مروج کرنے کی ضرورت اور اس کے لئے تدبیریں'' بھی ہے، اس مسئلہ کا تعلق بنیادی طور پر اس بات سے ہے کہ عربی زبان وادب کے بارے میں ہمارے علماء کا موقف کیا رہا ہے اور کیا ہے؟ اور مدارس کے نصاب میں اس کو کیا حیثیت دی گئی ہے، یہ بہت تفصیلی موضوع ہے، اس کے لئے نصاب کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے، ہم یہاں پر صرف عہد قدیم اور موجودہ عہد میں جو موقف رہا اس پر اکتفا کریں گے۔

نصاب تعلیم پر مستقل سیمینار کی ضرورت ہے، پہلے یہ طے کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم نصاب تعلیم اور منہج تعلیم میں تبدیلی کے لئے کم از کم غور کرنے کے لئے تیار بھی ہیں یا اپنے اس نظام کو کلی طور پر باقی رکھنے کا عزم کیے ہوئے ہیں۔

حضرات! گزشتہ صدیوں میں ہندوستانی علماء اور باشندوں کے عربی زبان وادب سے

☆ ندوۃ العلماء، لکھنؤ

شغف کا بنیادی سبب علوم اسلامیہ اور ان کے سرچشمہ قرآن وحدیث سے تعلق اور ان کو سیکھنے سکھانے کا جذبہ تھا، اسی طرح فقہ سے تعلق بھی تھا جس پر عہد اسلامی میں تمام توجہات مرکوز ہو گئی تھیں۔ ایک دوسرا سبب عربی زبان سے ان کی محبت بھی تھا، جیسا کہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی طرف اشارہ کیا ہے، علوم اسلامیہ کی تاریخ کا جائزہ لینے والا اس حتمی نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ تمام علوم اسلامی: نحو، صرف، بلاغت اور لغت وغیرہ کا بنیادی مقصد فہم قرآن کو سہل اور آسان بنانا ہے، اور یہی چیز شعر جاہلی پڑھنے پڑھانے کا قوی محرک بنی، چنانچہ آمدِ اسلام کے بعد عربی زبان اسکالروں اور باحثین کا مرکز توجہ اور ان کا حقیقی ہدف بن گئی تھی، اس لئے کہ عربی زبان تمام اسلامی علوم وفنون کی کنجی ہے، اسی وجہ سے ہندوستانی علماء نے تمام زمانوں میں عربی زبان سیکھنے اور اس میں عبور حاصل کرنے پر بھرپور توجہ دی، عرب فاتحین کی آمد اور یہاں اسلامی حکومت کے قیام کے بعد سے وسیع پیمانے پر مدارس قائم کیے گئے اور عرب ملکوں سے امہات کتب اور مراجع کے حصول کو آسان بنانے کے لئے تمام علوم وفنون میں کتابیں تصنیف کی گئیں۔

اس علمی سرگرمی کے نتیجہ میں ہندوستان میں عربی زبان وادب کے بڑے بڑے ماہرین اور مرجع کی حیثیت رکھنے والے نابغۂ روزگار علماء پیدا ہوئے، ان میں سرفہرست صاحب "العباب الزاخر" شیخ حسن بن محمد صغانی متوفی ۶۵۰ھ، صاحب "مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل ولطائف الاخبار" شیخ محمد طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ، صاحب "الفرائد شرح الفوائد" شیخ محمود بن محمد عمری جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ اور صاحب "تاج العروس شرح القاموس" سید مرتضی زبیدی متوفی ۱۲۰۵ھ ہیں۔ اس طرح ان صدیوں میں عربی زبان تصنیف وتالیف کی زبان تھی اور فارسی زبان کے ملک کی سرکاری زبان ہونے کے باوجود عربی زبان علماء اور اسکالروں کی مرکز توجہ بن گئی تھی۔

عہد بعہد نصابِ تعلیم کا سرسری جائزہ بتاتا ہے کہ علوم عقلیہ اور فقہ کی طرف رجحان عام کے باوجود نصاب میں عربی زبان کو ہمیشہ مرکزی مضمون کی حیثیت حاصل رہی ہے، اس لیے کہ

عربی زبان حکام، امراء اور وزراء کا تقرب اور حکومت میں اعلیٰ مناصب حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ تھی، اس طرح عربی ادب کے دونوں پہلو نظم ونثر میں ہندوستانی علماء نے گراں قدر تصنیفات پیش کی ہیں، اور ان کے نثری اور شعری نمونوں کو عربی ادب میں بڑا مقام حاصل ہے، درج ذیل حضرات شاعری میں درجہ کمال پر فائز نظر آتے ہیں۔

قاضی عبد المقتدر کندی صاحب القصیدۃ اللامیۃ (متوفی ۷۹۱ھ)۔ شیخ احمد بن محمد تھانیسری صاحب القصیدۃ الدالیۃ (متوفی ۸۲۰ھ)۔ شیخ غلام نقشبندی صاحب القصیدۃ المدحیۃ اللامیۃ (متوفی ۱۱۲۶ھ)۔ شیخ غلام علی آزاد بلگرامی صاحب السبع السیارۃ (متوفی ۱۲۰۰ھ)۔ مفتی اسماعیل بن وجیہ لکھنوی متوفی ۱۲۵۳ھ، شیخ فضل حق خیر آبادی صاحب القوافی والتجنیس (متوفی ۱۲۷۸ھ)۔ صاحب الشعر الرصین الرقیق سید احمد حسن قنوجی متوفی ۱۲۷۷ھ، مفتی صدر الدین دہلوی متوفی ۱۲۸۵ھ، شیخ فیض الحسن سہارنپوری متوفی ۱۳۰۴ھ، شیخ ذوالفقار علی دیوبندی متوفی ۱۳۲۲ھ اور استاد ادب دار العلوم ندوۃ العلماء شیخ عبد الرحمٰن کاشغری متوفی ۱۹۷۱ء۔

حضرات! ہندوستانی علماء نے علوم اسلامیہ میں ایسی ایسی عظیم تصنیفات پیش کی ہیں جو صدیوں عالم اسلامی اور عالم عربی میں داخل نصاب رہیں، اور ہندوستانی مسلمانوں نے بیش بہا کتب خانہ تیار کر دیئے، جن علماء عظام نے کتب حدیث کی شروح لکھی ہیں اور علم حدیث، فقہ اور اصول فقہ میں ان کی تصنیفات کو زبردست مقبولیت حاصل ہوئی ان کی فہرست طویل ہے، اسی کے ساتھ ایسے ایسے نابغۂ روزگار ادباء اور محققین بھی ہوئے ہیں جنہوں نے عربی ادب (نثر ونظم) کی کتابوں کی شرح اور ایسی تحقیقی خدمات انجام دی ہیں کہ عربی ادب کے اسکالروں اور شائقین کو غیر ہندوستانی علماء اور محققین اور متقدمین کی تحقیقات اور شروحات سے بے نیاز کر دیا، بروکلمان نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''تاریخ الادب العربی'' میں ایسے متعدد محققین کا تذکرہ کیا ہے، اخیر عہد میں عربی زبان وادب کے عظیم محقق شیخ عبد العزیز میمنی راجکوٹی (متوفی ۱۹۷۸ء) نے اپنی علمی،

تاریخی اور ادبی تحقیقات وتعلیقات اور قیمتی حواشی کی بنا پر عرب ادباء سے خراج تحسین حاصل کیا ہے، عرب ادباء نے ان کی معرکہ آراء کتاب ''سمط اللآلی شرح الآمالی'' اور'' ابوالعلاء وما الیہ'' کو بحث وتحقیق اور نقد وتمحیص کے میدان میں ٹکسالی نمونہ قرار دیا ہے، پہلی کتاب میں میمنی صاحب نے ابوعبید بکری کی آراء اور قالی پر نقد کی علمی وتاریخی بحث کی ہے، اور دوسری کتاب میں ڈاکٹر طہ حسین کی کتاب '' ذکری ابی العلاء'' کا مدلل جواب دیا ہے۔ اسی طرح ان کی کتاب 'الفائت من شعر ابی العلاء والمتنبی '' عالم عربی میں مقبول ہوئی، شیخ سعید انصاری صاحب نے لوئیس شیخو یسوعی کی کتاب '' شعراء النصرانیہ'' پر سخت نقد کیا، علامہ شبلی نعمانی نے جرجی زیدان کی کتاب '' تاریخ التمدن الاسلامی'' کے بعض مضمون پر سخت مواخذہ کیا، جس کا عالم عربی میں اعتراف کیا گیا، علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی معرکہ آراء کتاب ''ارض القرآن'' میں عربوں کے علم جغرافیہ میں قیمتی معلومات کا اضافہ کیا جو تاریخ ادب عربی میں اہمیت کی حامل ہیں، ہندوستانی علماء کی بعض تصنیفات کو عربوں میں بڑی پذیرائی ملی، ان کی طباعت واشاعت کا انتظام ہوا، اور نصاب تعلیم میں شامل کی گئیں، جن دیگر کتابوں کو عالم عربی میں بڑی مقبولیت اور پذیرائی ملی ان میں شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب '' حجۃ اللہ البالغۃ'' علامہ صدیق حسن خاں قنوجی کی تالیفات اور علماء فرنگی محل شیخ عبدالباری فرنگی محلی اور ابوالحسنات علامہ عبدالحی فرنگی محلی کی تصنیفات ہیں، جو تحقیق وتعلیق کے بعد بڑے پیمانے پر عالم عربی میں طبع ہو کر مقبول ہوئیں۔

حضرات! ملک کی آزادی کے بعد عربی زبان کو تعلیمی اور ادبی مقاصد کے ساتھ ساتھ سیاسی اور تجارتی مقاصد کے لئے بھی اختیار کیا جانے لگا، اور اسے عالمی زبانوں میں ایک اہم مقام حاصل ہو گیا، ہندوستان اور عالم عربی کے مابین دوستانہ روابط، تجارتی وسفارتی تعلقات مستحکم ہو جانے اور دیگر اسباب کی بنا پر عربی زبان وادب کو بڑا فروغ ہوا، ان اسباب میں سے ایک سبب انگریزی سامراج کے اثرات کو مٹانا اور قدیم مشرقی تہذیب کے خلاف مغربی یلغار کا

مقابلہ تھا، لہٰذا دینی اور اسلامی مدارس میں عربی زبان کی تعلیم کے پہلو بہ پہلو ہندوستان اور عالم عربی کے مابین تعلقات استوار کرنے اور تمام سیاسی، اقتصادی اور علمی میدانوں میں تعاون اور اشتراک کو مضبوط بنانے کے لئے سرکاری حلقوں کی طرف سے بھی اس پر توجہ دی گئی، اور اس کے لئے سرکاری اداروں اور یونیورسٹیوں میں عربی زبان وادب، اسلامیات اور مطالعات مشرق وسطی کے شعبے قائم کیئے گئے۔

اس رجحان کو ان کانفرنسوں اور علمی مذاکرات سے اور تقویت ملی جو ہندوستان میں منعقد ہوئے اور ان میں عالم عربی کے ممتاز علماء اور محققین شریک ہوئے یا وہ عالم عربی میں منعقد ہوئے اور ان میں ہندوستان کے علماء شریک ہوئے، عالم عربی اور ہندوستان کے درمیان محققین، اسکالرز اور ماہرین کا تبادلہ شروع ہوا، ایک دوسرے کے یہاں تعلیمی وفود کی آمد ورفت ہوئی، ان تمام باتوں سے عربی زبان پر اور زیادہ توجہ مرکوز ہوئی اور بہتر ین مستقبل کے متلاشیوں میں اس سے شغف اور تعلق پیدا ہوا، عربک لینگویج کے سنٹر قائم ہوئے، عالم عربی اور ہندوستان کے درمیان تعلقات کو مستحکم کرنے کے لئے حکومت نے بھی عربی زبان کے ادارے قائم کیے، وزارت دفاع نے دہلی اور پونہ میں لسانیات کے شعبے قائم کیے، حیدرآباد میں غیر ملکی زبانوں کا سنٹرل انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا اور دیگر وزارتوں نے بھی اس طرح کے سنٹر قائم کیے، ان تمام اداروں نے عربی زبان کے فروغ میں بڑا حصہ لیا، اور عربی زبان کے اچھے جاننے والے تیار ہوئے، عربی زبان کی تعلیم کو آسان بنانے کے لئے اس موضوع پر کتابیں بھی تصنیف کی گئیں، عالم عربی میں ہندوستانی وزارت خارجہ میں کام کرنے والوں کے لیے عربی ترجمہ اور بول چال کے مختصر کورس تیار کیے گئے، اس طریقہ سے عربی زبان کو علمی اور مادی مقاصد کے لیے سیکھا جانے لگا، جس سے عربی زبان کو فروغ ملا، ادبی، علمی اور مادی مقاصد کے لئے جو ادارے قائم ہیں، وہاں جدید عربی زبان وادب اور عالم عربی کے سیاسی اور ثقافتی رجحانات پر زیادہ توجہ کی جاتی ہے۔

حضرات! مدارس عربیہ کے نصاب کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں ہو کر سامنے آئے گی کہ اخیر کی صدیوں میں ان کے نصاب درس کے عربی ادب کے نصاب میں ایک تو زبان کو عملی طور پر سکھانے کا کوئی نظم نہیں رکھا گیا، عربی ادب کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ قدیم عہد سے تعلق رکھتا ہے، مثلاً ''نفحۃ الیمن''، ''مقامات حریری'' اور نظم میں معلقات، دیوان متنبی اور لامیۃ العرب والعجم وغیرہ کو عربی ادب کا اصل نمونہ سمجھا جاتا رہا، اور اب بھی زیادہ تر مدارس میں انہی کتابوں پر اکتفا کیا جاتا ہے، کچھ مدارس میں اب بعض نئی کتابیں جیسے ''القراءۃ الواضحۃ'' وغیرہ نصاب میں شامل کی گئی ہیں، اور جو کتابیں عربی ادب کے نصاب میں شامل رکھی گئیں ان میں لغوی اور علمی افادیت کے پہلو کو ترجیح دی گئی، بلاغت، نحو وصرف اور لغت کو زیادہ اہمیت دی گئی، تا کہ قدیم علمی اور فلسفی کتابیں سمجھی جاسکیں، متغیر اسالیب بیان اور قوت تعبیر پیدا کرنے والی کتابوں کو نظر انداز کیا گیا، تاریخ، ادب اور تنقید کو بھی نصاب میں جگہ نہیں دی گئی، بلاغت اور نحو وصرف میں وہ کتابیں باقی رکھی گئیں، جو دو سو سال پہلے نصاب میں شامل کی گئی تھیں، جبکہ ان موضوعات میں نئی اور سہل اسلوب میں لکھی ہوئی کتابیں جدید عربی زبان وادب اور عالم عربی میں عام ہو چکی ہیں، اس کی وجہ سے عالم عربی اور اس کے حالات سے ہمارے مدارس کے فارغین کا تعلق قائم نہ ہو سکا۔

دار العلوم ندوۃ العلماء نے اس ضرورت کو شروع سے محسوس کیا اور عربی زبان کی تعلیم زندہ اور عصری زبان کی حیثیت سے دینے کے لئے ایک نیا نصاب تیار کیا جس میں پہلے زبان سکھانے کا اہتمام کیا گیا، اس کے بعد عربی ادب کی کلیدی کتابوں کو جو مختلف عصور سے متعلق ہیں شامل کیا گیا، عربی بول چال کی مشق کا شروع سے اہتمام کیا گیا، اور عربی میں تعلیم کا بھی نظم کیا گیا، اس کے ساتھ عربی صحافت سے واقفیت اور صحافتی مشق کا بھی اہتمام کیا گیا، جدید ادب کی کتابیں اور جدید اہل قلم سے واقفیت کے لئے تاریخ ادب اور نقد کے موضوعات بھی نصاب میں

شامل کیے گئے۔

حضرات! عالم عربی میں نشأۃ ثانیہ کے بعد کا ادب، قدیم ادب سے کلی طور پر مختلف ہے، اس کا اسلوب اور اس کے موضوعات قدیم اسلوب اور موضوعات سے مختلف ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مصر و شام کے ادباء یورپ کی علمی برتری کے دور میں یورپ کے ادب سے متاثر ہوئے، چاہے معالعہ کے ذریعہ ہو، یا براہ راست یورپ میں تعلیم حاصل کرنے کے ذریعہ، مغربی ادبی مدارس سے ان سب نے استفادہ کیا اور نئے رجحانات، افکار اور تصورات کو اپنی ادبی کاوشوں میں داخل کیا، شروع میں ترجمہ کے ذریعہ اور بعد میں اس نہج کو اختیار کر کے، اس میں قصہ اور مقالہ جو ادب عربی میں نئی قسم کہلاتے ہیں، مغربی فکر سے سب سے زیادہ متاثر ہو گئے، ڈاکٹر طہ حسین، عقاد، ہیکل، مازنی، تیمور، توفیق الحکیم اور نجیب محفوظ نے ادب عربی کو نیا رخ دیا، اس ادب نے عالم عربی کی ثقافت پر گہرا اثر ڈالا، اس وقت عالم عربی میں مغربی ثقافت کا جو غلبہ ہے اس کی تشکیل میں اس ادب کا بڑا حصہ ہے، ان ادباء نے ادب کو زندگی اور فکر سے جوڑنے کی کوشش کی، ادب سے چاہے وہ نظم ہو یا نثر، ناواقف ہیں اور اس کی وجہ سے وہ عالم عربی کے واقعات اور رجحانات کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، عالم عربی کو سمجھنے کے لئے جدید ادب کا مطالعہ اشد ضروری ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ قصہ جو پہلے صرف تفریح کا ذریعہ تھا اور اس میں صرف ایسے موضوعات اختیار کیے جاتے جن کا تعلق عیاری، مکر و فریب، مال کے حصول کی کوشش یا امراء کے تنعم کے واقعات سے ہوتا یا ساحروں اور شاطروں کے قصوں پر مشتمل ہوتے، اب زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہو گیا ہے، اور وہ حقیقت اور موجودہ زندگی کی تصویر کے ساتھ مستقبل کی طرف رہنمائی کا کام کرتا ہے، نجیب محفوظ جن کو نوبل پرائز دیا گیا ان کے قصوں پر یہ بات صادق آتی ہے، اسی طرح ڈاکٹر طہ حسین کی کتابیں خاص طور پر "**مستقبل الثقافة فی مصر**" کے

مطالعہ سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

عربی ادب کے اس رجحان اور اس کے مضر اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' (ص: ۱۴۷) میں عالم عربی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یورپ سے تعلیم پا کر آنے والے عرب فضلاء کی حالت یہ تھی کہ مغربی روح ان کے اندر پوری طرح سرایت کر چکی تھی، وہ اسی کے دماغ سے سوچتے تھے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اسی کے پھیپھڑوں سے سانس لیتے تھے، وہ اپنے مستشرق اساتذہ کی صدائے بازگشت بن کر وہی خیالات ونظریات پورے یقین ووثوق اور پورے جوش اور سرگرمی کے ساتھ اپنے ملک میں پھیلانے کی کوشش کرتے، دنیا کے کسی گوشے میں اگر کوئی مستشرق کوئی نظریہ یا خیال پیش کرتا تو مصر میں نہ صرف اس کی حمایت کرنے والا بلکہ پورے خلوص اور پورے زور قلم اور انشا پردازی کے ساتھ اس کا شارح وداعی کوئی نہ کوئی ادیب اور مفکر اسی وقت مہیا ہو جاتا۔

مثلاً قرآن مجید کا انسانی تعبیر کا نتیجہ ہونا، دین وسیاست کی تفریق، اسلام کی نظام حکومت سے یکسر بے تعلقی اور اس کا محض اعتقادی، اخلاقی اور عبادتی نظام ہونا، سیکولرزم کی دعوت، عربی زبان وادب کے اولین مآخذ (شعر جاہلی) کی صحت وثبوت سے انکار، حدیث کی قیمت، حجیت اور سنت کی صحت کا انکار یا تشکیک، عورتوں کی آزادی اور مردوں کے ساتھ مساوات کلی اور بے پردگی کی تلقین وتحریک، فقہ اسلامی کو رومن لا سے ماخوذ اور اس کی اسپرٹ سے متاثر قرار دینا، قدیم تہذیبوں کے احیاء کا نعرہ، عہد فرعونی کی تقدیس، اس کی تہذیب، ادب اور کارناموں پر فخر، مقامی عامی زبان میں تصنیف وتالیف اور لاطینی حروف کو اختیار کرنے کی دعوت، مغربی قانون کی بنیاد واصول پر قانون سازی اور عربی قومیت اور مادی سوشلزم اور بعض وقت مارکسی کمیونزم کی دعوت، ان سب چیزوں میں مغربی فکر بلکہ مغربی طرز ادا اور تعبیر تک کے گھنے

سائے آپ کو اہل عرب کے دماغوں اور ان کی تحریروں پر اپنے بازو پھیلائے ہوئے نظر آئیں گے، گے اور اس پر اس طرح چھا گئے جس طرح بڑے درخت نوخیز پودوں کو اپنے سایہ میں لے لیتے ہیں، مغربی فکر کا عکس ان پر اس طرح پڑتا نظر آتا ہے جس طرح کسی صاف شفاف آئینہ میں آفتاب کا عکس"۔

"اس مغربی رجحان اور فکر کو مقبول بنانے کی کوشش میں مصر کے بعض چوٹی کے اہل قلم اور صاحب طرز انشاء پرداز شریک تھے، اور اس میدان میں متعدد ایسی شخصیتیں نمایاں ہوئیں جن کی زبان اور زور بیان کا سارا عرب لوہا مانے ہوئے تھا، لیکن دوسری طرف نہ صرف مصر بلکہ پورے مشرق عربی میں عملی، طبعی، میکانیکی اور ریاضیات کے میدان میں مجتہد قسم کے افراد مطلق پیدا نہ ہو سکے، جن کی ان علوم میں برتری اور بالادستی اور ان کی تحقیقات اور علمی کارناموں کی قدر و قیمت کا اعتراف مغرب کو کرنا پڑتا اور دنیا کے بین الاقوامی حلقہ میں ان کو کوئی مقام حاصل ہوتا"۔

حضرات! عالم عربی کے حالات کو سمجھنے کے لئے اور وہاں دعوتی کام کرنے کے لئے ادب حدیث کا مطالعہ اشد ضروری ہے، عصر حدیث میں عربی زبان وادب میں مسیحی عنصر غالب نظر آتا ہے اور یورپ میں رہنے والے عرب ادباء جنہیں مجری ادباء کہا جاتا ہے، خاص طور پر لبنان کے مارونی ادباء نے عربی ادب میں اپنی گہری چھاپ ڈالی ہے، انہوں نے قدیم عہد کے ادب کے بارے میں اپنے مخصوص خیالات کا اظہار کیا ہے جس سے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غلط تصورات قائم ہوئے ہیں، لغت، تاریخ، ادب، تنقید، قصہ، ناول اور ڈرامہ جو ذہن سازی کے اہم ذرائع ہیں، ان سب پر انہوں نے ایک کتب خانہ تیار کر دیا ہے، جس سے مسلمان ادباء بھی متاثر ہوتے ہیں، بعض موضوعات پر انہی کی کتابیں مرجع اور مصدر سمجھی جاتی ہیں، جرجی زیدان نے تاریخ اسلام پر اتنا مواد جمع کر دیا ہے جس پر کسی مسلم کاتب نے اضافہ نہیں کیا، اسی طرح اسلامی شخصیات پر قصہ کی شکل میں اس نے ایک بڑا ذخیرہ جمع کر دیا ہے، عربی صحافت پر

عیسائی اور عیسائی فکر سے متاثر ادباء کا شروع سے قبضہ رہا ہے، اکثر بڑے اخبارات یا مجلات عیسائیوں کے قبضہ میں ہیں۔

اگر ہمارے نصاب کا مقصد صرف قدیم درسی کتابوں کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے تو یہ نصاب کافی ہے، اور اگر عالم عرب میں دعوتی کام کرنا بھی مقصد ہے اور وہاں کے غلط رجحانات کا سامنا کرنا ہے اور عربوں سے روابط قائم کرنا ہے، یا نئے لٹریچر کو چاہے وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی سمجھنا ہے تو اس نصاب اور نظام میں تبدیلی ضروری ہے۔

اس وقت عالم عربی جن حالات سے گزر رہا ہے اس کو سمجھنے کے لئے اور اس میں مؤثر رہنمائی کا کردار ادا کرنے کے لئے جدید ادب کا مطالعہ اور جدید زبان و ادب کو سمجھنے اور اس میں اظہار خیال کرنے کی شدید ضرورت ہے، اس لیے عربی زبان و ادب کے نصاب میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

دینی مدارس میں عربی زبان ذریعہ تعلیم ضرورت وتدابیر

ڈاکٹر محمد سمیع اختر ☆

یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ قوموں کے عروج وزوال میں جہاں دیگر بہت سارے عوامل کارفرما ہوتے ہیں وہیں ان کی زبان کی ترقی یا تنزلی کا بھی اہم رول ہوتا ہے۔ اس دنیا میں وہی قومیں عام طور پر ترقی وکامیابی کی اعلیٰ منزلوں کو چھوتی ہیں اور امامت وسیادت کے منصب پر فائز رہتی ہیں جو فتوحات ملکی کے ساتھ ساتھ اپنی زبان کی حفاظت کرتی ہیں اور اپنی تہذیب وتمدن کی روایت کو سینے سے لگائے رکھتی ہیں۔ زبان کی بدولت ہی انسان اپنے افکار وخیالات کو دوسروں تک منتقل کرسکتا ہے اور دوسروں کے تجربات واحساسات سے مستفید ہوسکتا ہے۔ زبان ہمیشہ سے ماضی اور حال کے درمیان رشتے کو مضبوط کرنے کا اہم ذریعہ رہی ہے۔ اسی زبان کی بدولت آج ہم اپنے اسلاف کے گراں قدر علمی ومذہبی کارناموں سے واقف ہوسکے ہیں۔ دوسری تلخ تاریخی حقیقت یہ بھی ہے کہ عام طور پر قوموں کے انحطاط کے ساتھ ہی ان کی زبانوں کا وجود اور ان کی تہذیب وتمدن کے باقیات بھی رفتہ رفتہ ناپید ہوجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک زمانے میں دنیا کی ترقی یافتہ شمار کی جانے والی قوموں کا آج کوئی نام لیوا بھی باقی نہیں رہ گیا۔ عربی زبان کے علاوہ قدیم سامی زبان سے نکلنے والی بابلی، آشوری، عبرانی، آرامی، کنعانی، سریانی اور یونانی وغیرہ متعدد زبانیں اس دنیا سے ختم ہوچکی ہیں، یہاں تک کہ یورپ تک یونانی علوم وفنون کا ذخیرہ بھی عربی تراجم کی شکل میں پہنچا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ علم دوست عباسی

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

خلفاء نے اپنے دور حکومت میں دنیا کی بیشتر زبانوں بالخصوص یونانی، سنسکرت اور فارسی زبانوں میں موجود علمی ذخائر کو بڑے پیمانے پر عربی زبان میں منتقل کرنے کا اہتمام کیا تھا۔

بہرکیف آج عربی زبان ہی دنیا کی واحد قدیم ترین علمی، تہذیبی اور ادبی زبان ہے جو اپنے آغاز سے لے کر آج تک نشیب وفراز اور ترقی وادبار کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے بھی اپنی اصل حالت پر پوری تروتازگی اور تزک واحتشام کے ساتھ باقی ہے؛ کیونکہ عربی زبان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص معاملہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اس زبان کا رشتہ قرآن کریم اور دین اسلام کے ساتھ جوڑ کر گردش زمانہ کے ہاتھوں نہ صرف اسے خرد برد ہونے سے بچالیا بلکہ قیامت تک کے لئے اس زبان کے حق میں بقاء دوام کا پروانہ لکھ دیا۔ اسی طرح مسلمانوں نے بھی اپنے دور اقتدار میں عربی زبان کو ایک زندہ علمی وتحقیقی زبان کی حیثیت عطا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج عربی زبان نہ صرف یہ کہ ایک مذہبی زبان ہے بلکہ صدیوں پرانی ہماری تہذیب وتمدن کا آئینہ دار اور ہمارے بیش بہا علمی، سائنسی اور تحقیقی کارناموں کی امین بھی ہے۔ عربی زبان کو کم وبیش آٹھ صدیوں تک پوری دنیا کی واحد علمی، تحقیقی وسائنسی زبان ہونے کا شرف حاصل ہے، مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں اس زبان کا دائرہ وسیع کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، مختلف زبانوں کے الفاظ ومصطلحات کو وقت وحالات کی ضرورت کے پیش نظر اس میں داخل کیا۔ یہ درست ہے کہ عثمانی دور کے بعد نپولین کے حملے تک عربی زبان نے عرب ممالک میں بھی گمنامی کی زندگی بسر کی لیکن بہت جلد ہی عربوں کو اپنی محرومی، غلامی اور ناکامی کا احساس ہوا اور انہوں نے سامراجی قوتوں سے گلوخلاصی کے بعد سب سے پہلے عربی زبان کو زندہ کرنے اور اس کے علمی وادبی وقار کو بحال کرنے کی طرف بنیادی توجہ دی، اور مختلف عرب ممالک میں جدید سائنسی واجتماعی علوم کے مختلف میدانوں میں ہونے والی تحقیق وایجادات کو سامنے رکھتے ہوئے لغوی اکیڈمیاں قائم کی گئیں جنہوں نے انگریزی، فرانسیسی، جرمنی وغیرہ

زبانوں کے ضروری الفاظ و مصطلحات کو عربی بان میں منتقل کیا۔ چنانچہ آج عربی زبان کو ایک بار پھر دنیا کی ترقی یافتہ علمی تہذیبی، ادبی و تحقیقی اور ساتھ ہی سیاسی، وتجارتی زبان کا مقام ومرتبہ حاصل ہو چکا ہے۔ اور آج بائیس عرب ممالک کی سرکاری زبان عربی ہے۔ دوسری بات یہ کہ عربی زبان کا رشتہ دین اسلام اور قرآن کریم سے جڑنے کی بدولت پوری دنیا کے مسلمانوں نے اس کو سیکھنے اور اس کی حفاظت کرنے کی کوشش کی۔ مسلمان دنیا کے جس خطے میں بھی گئے انہوں نے دینی وثقافتی ضرورتوں کے تحت اس زبان کو پڑھنے پڑھانے کا اہتمام کیا یہاں تک کہ سوویت یونین میں تقریبا ایک صدی تک ہر طرح کی مذہبی سرگرمیوں پر سخت پابندی کے باوجود مسلمانوں نے اپنے گھروں کے تہہ خانوں میں چھپ کر قرآن کو پڑھنے اور دینی تعلیمات سے واقفیت کے لئے عربی زبان کو سیکھنے کا اہتمام کیا۔ اسی طرح ساتویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے ہندوستان میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی یہاں عربی زبان کی تعلیم وتدریس اور اس زبان میں تصنیف وتالیف کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ ہنوز جاری ہے گو کہ عربی زبان کو ہندوستان میں کبھی بھی بادشاہوں یا حکومتوں کی سرپرستی حاصل نہیں رہی۔

عربی زبان وادب کی حفاظت اور اسلامی علوم وفنون کی خدمت کے میدان میں ہندوستان کے مدارس عربیہ کا اہم رول رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان میں مدارس عربیہ کو ہر دور میں اسلام کے قلعہ کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ آج ہندوستان میں مسلمانوں کے ملی وتہذیبی تشخص کا متبادل ہمارے علماء کرام کی بے لوث قربانیوں اور ان کی انتھک کوششوں کا ثمرہ ہے جو کسی دنیوی مفاد یا جاہ ومنصب کے حصول سے بے نیاز خالصتاً رضائے الٰہی کی خاطر ان مدارس میں عربی زبان وادب اور کتاب وسنت کی تعلیم دیتے آرہے ہیں۔ دور جدید میں فارسی زبان وادب کے مایہ ناز محقق ممتاز مصنف مرحوم پروفیسر نذیر احمد مدارس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہ دینی ادارے غیر منظم صورت میں بھی مہتم بالشان خدمت انجام دے رہے ہیں، انہیں کی وجہ سے آج ملک کے عرض وطول میں دین کا چراغ روشن ہے، یہ ہی دین کے سب سے بڑے محافظ و پاسبان ہیں۔ عربی زبان وادب سے متعلق سارا عملہ بھی ان میں دینی مدارس کا تربیت یافتہ ہے، یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں عربی زبان کے اساتذہ، سفارت خانوں کے عربی مترجمین، ریڈیو اور نشر واشاعت کے دوسرے اداروں کے اراکین کی تربیت میں بھی انہیں مدارس کا ہاتھ ہے'' (مجلۃ علوم اسلامیہ، ج: ۱۴، ص: ۱۰۲، شعبہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۸۸)۔

ہمارے دینی مدارس میں عربی زبان وادب کی تعلیم وتدریس کا سلسلہ صدیوں سے جاری تو ضرور ہے لیکن اس کی طرف ایک زندہ، متحرک، علمی وعملی زبان کے بجائے ایک کلاسیکی اور ذیلی زبان کی حیثیت سے توجہ دی گئی، اس زبان کو کبھی باقاعدہ مقصد کے طور پر نہیں بلکہ ہمیشہ کتاب وسنت کو سمجھنے اور اسلامی علوم وفنون میں درک حاصل کرنے کی خاطر ایک واسطہ یا ذریعہ کے طور پر پڑھایا گیا، اس زبان کی مذہبی تقدیس کو تو باقی رکھا گیا مگر اس کی دنیوی اہمیت اور اس کی سیاسی واقتصادی افادیت کو نظر انداز کیا گیا۔ عربی زبان میں معاشی ضرورتوں کے پیش نظر مہارت پیدا کرنے کو ہمیشہ معیوب سمجھا گیا۔ تمام ہی مکاتب فکر کے مدارس میں عربی زبان کو نصاب کے لازمی جزء کا درجہ تو دیا گیا لیکن عربی زبان کی تدریس کے نام پر نحو وصرف اور بلاغت کی بعض کتابوں اور قدیم عرب شعراء ونثر نگاروں کے بعض منتخبات کی تدریس کو کافی تصور کیا گیا۔ مدارس عربیہ نے سارا زور تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم کلام، منطق وفلسفہ جیسے علوم کی تحقیق وتالیف میں صرف کیا، جس کے نتیجے میں آج ان موضوعات پر ہندوستانی علماء کی ایسی گراں قدر تالیفات موجود ہیں جن کی علمی قدر ومنزلت کا اعتراف عرب علماء ومحققین نے بھی کیا ہے۔ اور ہندوستانی علماء کی عربی زبان میں علمی کاوشیں آج بھی ہمارے لئے سرمایۂ افتخار ہیں۔ عربی تفاسیر میں علامہ نظام الدین کی ''غرائب القرآن''، ''رغائب الفرقان''، علامہ علاء الدین گجراتی کی تفسیر

تصیر الرحمن فی تفسیر القرآن"، علامہ فیضی کی تفسیر "سواطع الالهام"، مولانا شبیر عثمانی کی "الروح فی القرآن"، علامہ تاج الدین کی "جواهر القرآن" وغیرہ اہم ہیں تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ہندوستانی علماء کی عربی تفاسیر، پروفیسر محمد سالم قدوائی، شعبہ اسلامیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۸۲ء)۔

اسی طرح علوم القرآن پر مولوی عبدالکریم کی "سبل الرسوخ فی علم الناسخ المنسوخ"، شیخ محمد شافعی کی "نثر المرجان فی رسم نظم القرآن"، محمد علی کی "الرسالة الواضحة فی تخریج الآیات"، علامہ حمید الدین فراہی کی "مفردات القرآن"، الامعان فی اقسام القرآن" اور "نظم القرآن"، علامہ محمد انور شاہ کشمیری کی "مشکلات القرآن"، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی "الإفادات العزيزيه" اور سید سلیمان ندوی کی 'ارض القرآن' وغیرہ مشہور ہیں (ہندوستان میں اسلامی علوم وادبیات، ص: ۸-۹، مرتب: عماد الحسن آزاد اروقی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء)۔

اسی طرح عربی زبان میں ہندوستانی محدثین کی تالیفات بھی اہم ہیں جن میں علامہ رضی الدین حسن بن محمد صغانی کی "مشارق الانوار النبویۃ فی صحاح الاخبار المصطفویۃ"، عبدالاول جونپوری کی "فیض الباری فی شرح صحیح البخاری"، علاء الدین بن حسام الدین متقی الہندی کی "کنز العمال فی سنن الأقوال والافعال"، علامہ طاہر پٹنی کی "مجمع البحرین"۔ فقہ میں علامہ سراج الدین کی "زبدة الحكام فی اختلاف ائمة الاسلام" اور "الغرة المنيفة فی ترجيح مذهب ابی حنيفة"، مفتی ابوالفتح رکن الدین بن حسام کی "الفتاوی الحادیۃ" وغیرہ مشہور ہیں (اللغۃ العربیۃ فی الہند عبر العصور ص: ۸-۱۰، خورشید اشرف اقبال الندوی، الہیئۃ المصریۃ العامۃ، قاہرہ، ۲۰۰۸)۔

علم منطق میں ملا محب اللہ بہاری کی "سلم العلوم"، مولانا فضل امام خیرآبادی کی

''المرقاۃ''، ملا محمد جونپوری کی ''شمس بازغہ'' وغیرہ اہم ہیں، عربی لغت کے میدان میں ہند
علماء کا لوہا تو عرب محققین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ علامہ حسن بن محمد صغانی کی کتاب ''ال
الزاخر'' کو آج بھی عربی لغت کے میدان میں ایک اہم ماخذ ومصدر کی حیثیت حاصل
علامہ سیوطی نے تو ان کو عربی لغت کا امام اور امام ذہبی نے ان کی کتاب کو علم لغت کا مرجع ومنتہی
دیا ہے، علامہ سید مرتضی زبیدی بلگرامی کی تاج العروس فی شرح القاموس دس ضخیم جلدوں پر مش
ہے جو علامہ مجد الدین فیروز آبادی کی عربی قاموس ''القاموس المحیط'' کی شرح، اضافہ اور تصحیح

(ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ، ص: ۳۰-۳۵، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات ا
لکھنؤ، ۱۹۹۲ء)۔

اسی طرح دور جدید میں عربی زبان وادب اور تحقیق نصوص کے ماہر علامہ پروفیس
العزیز میمنی کی عربی زبان وتحقیق کے میدان میں گرانقدر خدمات سے بھلا کون ناواقف ہوگا
کی لغوی وتحقیقی صلاحیتوں کا اعتراف ڈاکٹر احمد امین، علامہ محب الدین خطیب، ڈاکٹر ناصر الد
اسد، ڈاکٹر شاکر فحام، ڈاکٹر محمود شاکر جیسے دور جدید کے نامور عرب ادباء ومحققین نے کیا
انہوں نے ''مجلة المجمع العلمي'' دمشق میں متعدد مقالات کے ذریعہ لسان العرب
عربی زبان کی مستند لغت میں موجود سیکڑوں غلطیوں کی طرف نشاندہی کی، چنانچہ لسان العرب
نظر ثانی کے لئے مصر میں جو کمیٹی تشکیل دی گئی اس میں عرب محققین کے ساتھ ان کا نام
سرفہرست تھا۔ اسلامی علوم وفنون کے علاوہ خالص عربی ادبیات یعنی شاعری ونثر نگاری
میدان میں ہندوستانی ادباء وشعراء کی کاوشوں پر نظر ڈالیں تو اس میدان میں ان کی کاوشیں ع
زبان وادب کے اعلی معیار پر پوری اترتی نظر نہیں آتیں، ان کے نثری وشعری مجموعوں کا مط
کریں تو اندازہ ہوگا کہ ان پر مذہب اور تقلید کا رنگ غالب ہے، زیادہ تر عربی اشعار د
رسالت میں عقیدت یا اخلاقی ودینی تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ عربی ادبیات کے میدان میں غلا

بلگرامی، مولانا فضل حق خیر آبادی، شاہ ولی اللہ دہلوی، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، علامہ الدین فراہی، مولانا انور شاہ کشمیری اور علی عباس چریا کوٹی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں

وستان میں اسلامی علوم وادبیات، ص: ۱۴۰)۔

عربی شعروشاعری کے ہندوستان میں نشوونما نہ پانے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ بی زبان کو ہندوستان کے مسلم امراء وسلاطین کی کبھی سرپرستی حاصل نہیں رہی اور نہ ہی اسے کبھی وستان کی سرکاری زبان کا درجہ ہی ملا۔ عربی نثر نگاری کے میدان میں بھی ہمارے قدماء کی نثر کتابوں کا تعلق تاریخ، تذکرہ یا اسلامی علوم سے ہے جن کے اسلوب پر علمی وتحقیقی پہلو غالب ہے۔ دور جدید میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے پہلی بار اسلامی موضوعات پر عربی زبان ن اپنی کاوشوں کو خالص ادبی اسلوب میں پیش کیا اور دنیائے عرب میں عربی زبان وادب کے یک صاحب طرز ادیب، صحافی اور انشا پرداز کی حیثیت سے اپنی جگہ بنائی۔ چنانچہ "ماذا خسر لعالم بانحطاط المسلمین"، "الصراع بین الفکرة الاسلامیه والغربیة" اور رجال الفکر والدعوة فی الاسلام" جیسی معرکۃ الآرا تصانیف کے ذریعہ عرب ادباء وانشا پردازوں کو بھی حیرت میں ڈال دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے دینی مدارس میں عربی زبان وادب کی تعلیم وتدریس کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے اور اساتذہ بڑی محنت ولگن کے ساتھ عربی نحو وصرف اور عربی نثر و اشعار کی تعلیم طلبہ کو دیتے آرہے ہیں، چنانچہ ان مدارس سے فارغ التحصیل طلبہ کی اکثریت کی عربی گرامر عام طور پر مضبوط ہوتی ہے اور وہ اسلامی علوم وفنون پر موجود عربی کتابوں کو آسانی سے سمجھ لیتے ہیں؛ لیکن عربی زبان کو صحیح لب ولہجے میں بولنا، اپنے افکار وخیالات کو ضبط تحریر میں لانا ان کے لئے مشکل ہوتا ہے؛ کیونکہ عربی نحو وصرف میں مہارت حاصل کر لینا ایک الگ چیز ہے لیکن عربی زبان میں تحریر وتقریر کی صلاحیت پیدا کرنا الگ بات ہے جس کے لئے مدارس میں عربی

زبان کے رائج نصاب اور نظام تعلیم دونوں ہی میدان میں بنیادی تبدیلیاں درکار ہیں۔ آج علما
ودانشوروں کا اس امر پر تقریباً اتفاق ہے کہ عربی زبان کو محض ایک مذہبی زبان کی حیثیت سے
دیکھتے ہوئے اسے ایک ترقی یافتہ، زندہ علمی، ادبی، سیاسی، معاشی اور عالمی زبان کے طور پر سیکھنے
کی ضرورت ہے، دینی مدارس میں زیر تعلیم طلبہ کے اندر عربی زبان میں تقریر، تعبیر اور تحریر کی
مطلوبہ صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے ضمن میں مدارس کے اندر اردو یا مقامی زبانوں کو ذریعہ
تعلیم بنانے کے بجائے عربی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ اس کی ضرورت اور افادیت سے تو
کسی کو انکار نہیں لیکن اسے عملی طور پر نافذ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

گزشتہ چند دہائیوں سے عربی ودینی مدارس میں رائج قدیم نصاب تعلیم میں وقت کی
ضرورت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق ضروری اصلاح وتبدیلی کے موضوع پر متعدد
ورکشاپ یا سمینار اور کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں جہاں ملت کے قائدین، تعلیم کے ماہرین اور علماء
کرام کے باہمی مشوروں سے نصاب میں تبدیلی کے مسئلے پر بہت حد تک اتفاق رائے کی صورت
بھی پیدا ہو چکی ہے اور بعض خاکے بھی ترتیب دیئے جا چکے ہیں لیکن ان خاکوں میں پوری طرح
رنگ بھرنے کا کام ابھی باقی ہے۔ اس طرح کی کوششوں کا اتنا نتیجہ تو ضرور نکلا ہے کہ بعض مدارس
نے انگریزی، عمرانیات اور سماجیات سے متعلق کچھ مضامین کو اپنے نصاب میں داخل کر لیا ہے۔
یہاں تک کہ بانی دار العلوم دیوبند حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ بھی جدید علوم کے مخالف نہیں تھے،
خود ان کے دور میں دار العلوم میں بعض سائنسی مضامین کی تدریس کا تجربہ بھی کیا گیا تھا۔ علامہ
نانوتویؒ نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو دین اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ یہاں
تک کہ ایک مرتبہ ان کو کسی علمی مجلس میں اسلام کی موثر ترجمانی کے لئے انگریزی زبان سے براہ
راست واقفیت حاصل کرنے کا احساس پیدا ہوا، چنانچہ انہوں نے سفر حج سے واپسی کے بعد
یورپ جا کر انگریزی زبان سیکھنے کا ارادہ بھی کر لیا تھا لیکن زندگی نے ساتھ نہیں دیا اور ان کا یہ

خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا۔ مولانا مناظر حسن گیلانی اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اگر یہ صورت ممکن ہو جاتی تو دارالعلوم دیوبند کی علمی تحریک کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا (ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ج: ۲، ص: ۴، ندوۃ المصنفین، دہلی)۔

بعض مدارس کے ذمہ داروں کو عربی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر نافذ کرنے کا احساس تو ہوا ہے مگر یہ کافی نہیں ہے؛ کیونکہ آج بھی بیشتر عربی مدارس میں عربی زبان کی تعلیم کا بنیادی مقصد اسلامی علوم وفنون میں مہارت حاصل کرنا ہے تاکہ طلبہ فراغت کے بعد تفسیر، حدیث، فقہ یا دعوت دین کے میدان میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرسکیں، عربی زبان کی تعلیم سے ان کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ وہ صاحب طرز ادیب، صحافی، انشا پرداز یا مترجم بن جائیں، یہی وجہ ہے کہ عالمیت وفضیلت کے درجات میں عام طور پر نحو وصرف کو چھوڑ کر تفسیر، حدیث، فقہ اور منطق وغیرہ کی کتابیں زیادہ ہوتی ہیں۔ میری ناقص معلومات کی حد تک ندوۃ العلماء کو چھوڑ کر شاید ہی کوئی ایسا مدرسہ ہے جہاں عربی زبان کو ایک زندہ، متحرک اور روزمرہ کی زندگی میں کام آنے والی زبان کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ کی اکثریت میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو کسی موضوع پر عربی زبان میں دس منٹ تقریر کرسکے یا ایک صفحہ میں اپنے خیالات کو قلمبند کرسکے۔ اور یہ صورتحال صرف مدارس ہی کی نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی بیشتر یونیورسٹیوں اور کالجوں سے عربی زبان میں ایم اے اور بسا اوقات ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے والے طلبہ کے اندر بھی عربی زبان میں تحریر وتقریر کی صلاحیت مفقود ہوتی ہے؛ کیونکہ عام طور پر ہندوستان کی مختلف ریاستوں کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں عربی زبان کی تدریس وہاں کے مقامی زبانوں میں ہوتی ہے، وہاں عربی زبان ذریعہ تعلیم نہیں ہے اور نہ ہی عربی زبان میں تقریر وتحریر کی باقاعدہ مشق کا کوئی نظم ہے۔ آج مدارس اور جامعات میں عربی ادب کے نام پر عام طور سے نحو وصرف کی بعض قدیم کتابوں، معلقات، حماسہ، مقامات اور نفحۃ الیمن وغیرہ کے منتخب

اشعار وابواب کی تدریس کو کافی سمجھا جاتا ہے جب کہ ان کتابوں کی تدریس سے عربی زبان وانشاء کو سیکھنے میں کوئی خاص مدد نہیں ملتی اور نہ طلبہ کو عربی زبان کے جدید الفاظ ومصطلحات سے واقفیت ہوتی ہے اور وہ اپنی محنت اور ذہانت کے باوجود عملی میدان میں ترقی وکامیابی حاصل کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ مدارس کے ذمہ داران دور جدید کے عملی تقاضوں اور اپنے گرد وپیش کے حالات سے یا تو بے خبر ہیں یا اگر باخبر ہیں تو پھر اپنے اندر عملی اقدام کی سکت محسوس نہیں کرتے۔ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سید حامد اسی صورتحال کو محسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قرآن تو ہر مسلمان کو کائنات پر غور کرنے، متحرک رہنے، آگے بڑھنے اور اپنے حالات کو بہتر بنانے کی دعوت دیتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ جو قوم خود اپنی حالت کو بدلنے کے لئے مضطرب نہ ہو یا ہاتھ پیر نہ مارے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی مدد نہیں کرتا''۔ یہ ہماری بدبختی نہیں تو اور کیا ہے کہ ہم نے تقلید کی ریت کو فرمودات باری تعالیٰ پر ترجیح دی، فضا کچھ ایسی بنی ہوئی ہے کہ ہمیں اپنی محرومیوں کا احساس ہی نہیں ہوتا، جو لوگ زندگی کی کال کوٹھری میں ایک عمر گزار دیتے ہیں روشنی ان کی آنکھوں کو ناگوار ہوتی ہے۔ یہ بات بار بار دہرائے جانے کے قابل ہے کہ ہندوستان میں خصوصاً آزادی کے بعد دینی مدارس نے دین کے تحفظ کے لئے بڑا کام کیا ہے لیکن اگر نصاب میں اصلاح راہ پا جاتی تو وہ اس سے بھی بڑا کام کرسکتے تھے'' (ملک وملت کی تعمیر و دینی مدارس، ص: ۱۲۲)۔

مولانا محمد سالم قاسمی دینی مدارس میں عربی زبان وادب کی زبوں حالی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس درس نظامی میں عربی زبان کی وہ لسانی حیثیت جو اظہار مافی الضمیر کا اولین اور ضروری وسیلہ ہوتی ہے وہ بالغ الفکر اہل علم وفکر کے استثنا کے ساتھ بیشتر معاہد ومدارس میں اس درجہ معرض خمول میں پڑ گئی ہے کہ اہل نظر اس کی ضرورت واہمیت کو بدلائل وجوہ ثابت کرکے پیش بھی کرتے ہیں تو اسے ماننے یا قابل قبول قرار دیئے جانے کے بجائے دور از کار، بے ضرورت

اور غیر مفید بلکہ مضر ہونے کی تاویلات کی صورت میں اس کا جواب ملتا ہے'' (عربی واسلامی مدارس کا نصاب ونظام تعلیم اور عصری تقاضے، ج:۲،ص:۱۰۴، خدابخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵)۔

ہندوستان میں عربی زبان وادب کی ابتر صورتحال پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بیسویں صدی عیسوی کے عظیم مفکر، مورخ، ادیب اور محقق علامہ شبلی نعمانیؒ فرماتے ہیں:

''آج عربی کی تعلیم صرف ان لوگوں میں محدود ہو کر رہ گئی ہے جو افلاس کی وجہ سے اور کسی قسم کی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے، عربی کی تعلیم ایسی بے کار شئ سمجھ لی گئی ہے کہ بغیر کسی ترغیب کے کوئی شخص اس کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا، امراء کا گروہ عربی ومذہبی تعلیم سے یکسر محروم رہ جاتا ہے'' (عربی واسلامی مدارس کا نصاب ونظام تعلیم، ج:۳،ص:۷۰)۔

بہر حال دینی مدارس میں عربی کو ذریعہ تعلیم بنانے سے قبل ہمیں اپنے قدیم طرز فکر کو تبدیل کرنا ہوگا اور دنیا میں رائج طرز تعلیم وتربیت کو اختیار کرنا ہوگا۔ آج وہی قومیں ترقی وخوشحالی کے راستے پر گامزن ہیں جنہوں نے حالات کے رخ کو پہچانتے ہوئے اپنے آپ کو بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دینے کے لئے تیار کیا۔ اسلام تعلیم وتربیت کے میدان میں ہونے والی مفید ترقیات وایجادات کو اپنانے کی راہ میں قطعی حائل نہیں ہے، مگر افسوس کہ آج بھی بعض ایسے افراد ہیں جو مدارس میں عربی زبان کو جدید تقاضوں کے مطابق ایک زندہ، متحرک اور عالمی زبان کی حیثیت سے پڑھائے جانے کے حق میں نہیں ہیں، اور ان کو اندیشہ ہے کہ اس صورت میں دینی مدارس کے قیام کا مقصد فوت ہوجائے گا اور طلبہ دعوت دین اور اصلاح معاشرہ کا فریضہ انجام دینے کے بجائے دنیوی اغراض کے حصول میں کھوجائیں گے جب کہ دنیا میں ایک باوقار مسلم کی حیثیت سے زندگی گزارنا بھی اسلام کے مقاصد میں شامل ہے۔ ایک صاحب علم دانشور کا ماننا ہے:

''اس سے زیادہ قابل افسوس ان لوگوں کا انداز فکر ہے جنہوں نے نصاب تعلیم کا صرف یہی مقصد قرار دے رکھا ہے کہ کچھ عربی لکھنا اور بولنا سکھا کر اور کچھ عربی زبان وادب میں

مہارت پیدا کر کے ان طالبان علوم نبوت کو عربی ممالک میں قابل ملازمت یا دیگر یونیورسٹیوں میں قابل داخلہ بنا دیا جائے ،یا عربی مدارس کی سند کو دنیا کی دیگر یونیورسٹیاں تسلیم کر لیں ،لیکن نتیجہ عربی ریڈیو اسٹیشنوں اور سفارشات خانوں میں ملازمت کے سوا اور کیا رہا'' (ملک وملت کی تعمیر اور دینی مدارس ،ص: ۱۸۳ ،مولانا ابوالحسن اعظمی)۔

لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اب ایسی محدود سوچ رکھنے والے افراد بہت کم رہ گئے ہیں اور مدارس کے ذمہ داروں کے نقطۂ نظر میں بنیادی تبدیلی آئی ہے، آج ایک دونہیں بلکہ سیکڑوں کی تعداد میں مدارس کا جامعہ ملیہ اسلامیہ، ہمدرد یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ،لکھنؤ یونیورسٹی جیسے سرکاری اداروں سے الحاق ہو چکا ہے،اوران مدارس نے الحاق کی شرائط کے مطابق اپنے نصاب تعلیم کو تو کسی حد تک تبدیل کر لیا ہے مگر نظام تعلیم کے میدان میں تبدیلی لانا ابھی باقی ہے۔عربی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کرنے میں شاید ندوۃ العلماء کے علاوہ کسی اور مدرسے نے کوئی خاص توجہ نہیں دی ہے۔ندوۃ العلماء نے آغاز سے ہی اپنے طلبہ کے اندر عربی زبان میں تحریری وتقریری صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کی کوشش کی۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ ۱۹۰۱ء میں جب وہ ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے تو انہوں نے وہاں مصر سے شائع ہونے والے بعض عربی اخبارات ورسائل کا مطالعہ کیا۔اور پھر انہوں نے اپنے زمانہ طالب علمی کے دور ہی میں عربی زبان میں اس قدر مہارت حاصل کر لی تھی کہ وہ کسی بھی موضوع پر برجستہ عربی زبان میں تقریر کرنے پر قادر تھے،اور پھر جب ۱۹۲۵ء میں علامہ سید سلیمان ندوی وہاں کے معتمد تعلیم بنے تو انہوں نے عربی ادب وانشاء کی تعلیم وتدریس کے لئے بعض عرب اساتذہ کی خدمات بھی حاصل کیں، اور انہوں نے اپنے دور میں ہندوستان سے پہلا عربی اخبار ''الضیاء'' نکالنے کا اہتمام کیا (تذکرہ سلیمان: غلام محمد، ص: ۴۴)۔

چنانچہ ندوۃ العلماء سے گزشتہ ساٹھ سالوں سے ایک علمی، ادبی اور تحقیقی میگزین مجلۃ

"البعث الاسلامی" اور پندرہ روزہ اخبار "الرائد" پابندی سے شائع ہورہا ہے۔ ندوۃ العلماء کی اس تحریک سے دیگر عربی مدارس اور خاص طور پر جامعہ سلفیہ بنارس سے "صورۃ الامۃ" اور دیوبند سے "الداعی" شائع ہورہا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اپنے دور نظامت میں ندوہ کے اندر عربی ادب وانشا پردازی کو ایک نئی بلندی تک پہنچادیا۔ مولانا علی میاں لکھتے ہیں:

"ندوۃ العلماء نے عربی زبان وادب کی تعلیم کی طرف بھی ایک زندہ اور جدید زبان کی حیثیت سے توجہ منعطف کی؛ کیونکہ عربی زبان میں قرآن وسنت کے فہم کی کلید اور اس کے رازہائے سربستہ کی امین ہے۔ دارالعلوم نے کبھی عربی زبان کو کبھی ایک قدیم اور مردہ زبان (جس کے بولنے اور لکھنے والے اس دنیا میں ناپید ہوں) نہیں سمجھا جب کہ ہندوستان نے اس زبان کے ساتھ یہی سلوک کر رکھا تھا" (ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ، ص: ۱۳۰)۔

چنانچہ عربی زبان وادب سے متعلق اپنے اس انقلابی نقطۂ نظر کی بدولت آج ندوۃ العلماء کو نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند بھی عربی ادبیات اور عربی خطابت، صحافت اور انشا پردازی کے میدان میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ اور آج عربی زبان میں اپنی اسی مہارت کی بدولت وہاں کے فارغین مختلف ملکی وبین الاقوامی اداروں میں عربی زبان کے اساتذہ کی حیثیت سے علمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

بہرحال گزشتہ چند دہائیوں میں امت مسلمہ کی سوچ میں تبدیلی تو ضرور آئی ہے اور مدارس کے نصاب ونظام تعلیم میں وقت کی ضرورت کے مطابق ضروری اصلاح کے لئے ذہن سازی کی حد تک کام بھی ہوا ہے تاہم دینی مدارس میں عربی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر نافذ کرنے کی مہم آسان نہیں ہے بلکہ ایک صبر آزما مشن ہے۔ اس کی ضرورت، افادیت اور اہمیت سے کسی کو انکار نہیں لیکن بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ مدارس کے اندر عربی میڈیم کو کس طرح نافذ کیا جائے جب کہ یہاں زیر تعلیم طلبہ کی اکثریت اردو زبان بھی بہتر انداز سے بولنے اور لکھنے پر قادر نہیں ہے، مدارس

میں عربی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی صورت میں اساتذہ، نصاب اور نظام تعلیم کی جہت سے مختلف قسم کی مسائل پیش آسکتے ہیں جن کو بعض عملی تدابیر کے ذریعہ حل کیا جاسکتا ہے۔

اساتذہ کی ٹریننگ (اکیڈمک اسٹاف کالج کا قیام):

مدارس میں عربی زبان وادب کی تعلیم وتدریس کی خدمت انجام دینے والے اساتذہ کی اکثریت تدریس کے جدید طریقوں سے یا تو پوری واقفیت نہیں رکھتے یا اگر واقف ہیں تو جدید تکنیک کو نافذ کرنے کے لئے مدارس میں ضروری وسائل کا فقدان ہے۔ دوسری بات یہ کہ مدارس میں تدریسی خدمات انجام دینے والے اساتذہ کی اکثریت انہیں مدارس اسلامیہ سے فارغ التحصیل ہے جہاں عربی زبان کو ایک کلاسیکل لنگویج کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے، اور عربی زبان کی تعلیم کا اس سے زیادہ اور کوئی مقصد نہیں ہوتا کہ طلبہ کے اندر کتاب وسنت اور اسلامی شریعت کے بنیادی مصادر کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے۔ اس صورتحال کے لئے مدارس کے اساتذہ سے زیادہ ارباب مدارس ذمہ دار ہیں کہ انہوں نے انفارمیشن ٹکنالوجی کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی غیر زبانوں کی تدریس کے میدان میں ہونے والی جدید ترقیات سے اپنے اساتذہ کو بخوبی واقفیت بہم پہنچانے کا کوئی باقاعدہ سسٹم تیار نہیں کیا۔ آج کسی دینی مدرسے میں عربی اساتذہ کی باقاعدہ ٹریننگ کا کوئی نظم نہیں ہے۔ بعض عربی مدارس میں رابطۂ عالم اسلامی کی جانب سے مدینہ یونیورسٹی سے فارغ بعض ہندوستانی اساتذہ کو مبعوث کردیا جاتا ہے لیکن ان اساتذہ سے بھی عربی میڈیم میں تدریس کا مسئلہ حل نہیں ہوگا؛ کیونکہ مدینہ یونیورسٹی کی عالم عرب میں کم وبیش وہی حیثیت ہے جو ہمارے یہاں دینی مدارس کی ہے جس کا بنیادی مقصد دعاۃ ومبلغین تیار کر کے دنیا کے مختلف حصوں میں ان کو دعوتی کاموں کے لئے مبعوث کرنا ہے۔ پھر ہمارے مدارس سے فارغ طلبہ کو یہاں زیادہ تر کلیۃ الدعوۃ، کلیۃ الشریعۃ، کلیۃ الحدیث وغیرہ ہی میں داخلہ ملتا ہے، لہٰذا وہ یہاں بھی عربی زبان کی تدریس کے جدید طریقوں سے واقف نہیں ہوپاتے۔ آج کے دور میں

عربی عبارت کو پڑھ لینا اور سمجھ لینا ہی کافی نہیں بلکہ طلبہ کے اندر عربی زبان کو صحیح مخارج کے ساتھ بولنے کی صلاحیت بھی ناگزیر ہے اور اس کے لئے اساتذہ کا عربی زبان میں ماہر ہونا اور تدریس کے جدید طریقوں سے واقف ہونا بہت ضروری ہے۔ اور عربی اساتذہ کی مطلوبہ ٹریننگ اسی صورت میں مکمل ہوسکتی ہے جب ہم یو جی سی کے طرز پر اساتذہ کی تربیت کے لئے ریاستی یا کم از کم ملکی سطح پر کوئی ایک اکیڈمک اسٹاف کالج کے طرز پر اپنا کوئی ٹریننگ کالج قائم کریں جہاں ہر طرح کی جدید سہولیات میسر ہوں۔

آج سے تقریباً تیس سال قبل ملک کے ماہرین تعلیم نے جدید سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جانے والے نئے اساتذہ کو تعلیم وتدریس کے میدان میں ہونے والی جدید ترقیات اور علم کے مختلف میدانوں میں ہونے والی ایجادات سے واقف کرانے کے لئے ملک کے عرض وطول میں مختلف یونیورسٹیوں کے اندر بیسیوں اکیڈمک اسٹاف کالج قائم کردیئے جہاں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بحال ہونے والے اساتذہ کے لئے تین سے چار ہفتوں پر مشتمل مختلف قسم کے تربیتی (Orientation) اور ریفریشر کورسیز چلائے جاتے ہیں۔ اسی طرز کا کوئی ادارہ مدارس کے عربی اساتذہ کی ٹریننگ کے لئے بھی ضروری ہے، اس کے بغیر ہم مدارس میں عربی میڈیم نافذ کر کے متوقع نتائج حاصل نہیں کرسکتے۔ یہ درست ہے کہ اس طرح کے کسی ٹریننگ کالج کا قیام مدارس کے ذمہ داروں کے لئے کوئی آسان کام نہیں ہے؛ لیکن اگر صحیح پلاننگ اور منصوبہ بند طریقے سے کام کیا جائے تو یہ کام ناممکن بھی نہیں ہے۔ پہلا مرحلہ تو اس طرح کے کسی بڑے تربیتی ادارے کو قائم کرنے کی ضرورت پر اتفاق رائے ہونا ضروری ہے۔

یو جی سی کے تحت چلائے جانے والے بعض اکیڈمک اسٹاف کالجز میں عربی اساتذہ کے لئے بھی ریفریشر کورسیز ہوتے ہیں جہاں عربی زبان کے ماہر اساتذہ کو عربی ادبیات کی موثر تدریس کے جدید طریقوں پر توسیعی لیکچر کے لئے مدعو کیا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف دینی مدارس کے عربی اساتذہ کو ہی تربیت کی ضرورت ہے بلکہ آج بھی ہندوستان کے مختلف صوبوں

کے سرکاری کالجز اور یونیورسٹی کے عربی شعبوں میں بھی عربی کے بجائے مقامی زبانوں ہی میں عربی کی تعلیم ہوتی ہے یہاں تک کہ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں تو ریسرچ کا مقالہ تک ہندی زبان میں لکھنے کی اجازت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکاری کالجز سے فارغ طلبہ کے اندر بھی عربی زبان میں بولنے اور لکھنے کی صلاحیت مفقود ہے۔ چنانچہ سرکاری یونیورسٹیوں میں بھی عربی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی کوشش کی جارہی ہیں۔

پہلے مرحلے میں ندوۃ العلماء لکھنؤ، دارالعلم دیوبند یا جامعہ سلفیہ بنارس جیسے بڑے مدارس میں اساتذہ کے لئے تربیتی سینٹر کھولے جاسکتے ہیں جہاں اس مدرسے کی شاخوں کے ساتھ دیگر مدارس کے اساتذہ کو بھی مختصر تربیتی کورسیز کے لئے مدعو کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح کے تربیتی مراکز یا اکیڈمک اسٹاف کالج کے قیام کے ضمن میں مالی وسائل کی فراہمی کے لئے قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو (NCPUL)، مرکزی وقف کمیٹی، اقلیتی کمیشن، مولانا آزاد فاؤنڈیشن، وزارت برائے اقلیتی فلاح و بہبود اور مرکزی وزارت برائے انسانی وسائل سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ رنگ ناتھ کمیشن اور سچر کمیٹی کی سفارشات کے بعد مرکزی حکومت اس طرح کے اداروں کو خود قائم کرنا چاہتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر سنجیدگی کے ساتھ مخلصانہ کوشش کی جائے تو مالی وسائل کی فراہمی آج کے دور میں کوئی بڑی رکاوٹ نہیں ہے۔

اس طرح کے تربیتی اداروں میں عربی زبان کے ماہر اساتذہ کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کے لئے مختلف اوقات میں ان کو توسیعی خطبات کے کے لئے مدعو کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ثقافتی تبادلے (Cultural Exchange) پروگرام کے تحت بعض عرب ممالک کے اساتذہ کی خدمات کو بھی کچھ دنوں کے لئے حاصل کیا جاسکتا ہے جو ہمارے اساتذہ کو عربی زبان کی تدریس کے جدید طریقوں سے واقف کرائیں۔

جب تک مدارس کی سطح پر ان کا اپنا کوئی نظم نہ ہو مدارس کے ذمہ داران براہ راست یو جی سی کے تحت چلنے والے اکیڈمک اسٹاف کالجز کے ڈائریکٹر یا اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے

براہ راست ربط قائم کر کے عربی کے ریفریشر کورسیز میں اپنے اساتذہ کی شرکت کی اجازت حاصل کر سکتے ہیں۔

اگر یہ صورت بھی ممکن نہ ہوتو مدارس کے ذمہ دار لمبی تعطیل کے دوران کیمپس کے اندر میں ایک دو ہفتے پر مشتمل عربی اساتذہ کی تربیت کے لئے خصوصی ورکشاپ کا نظم کر سکتے ہیں جہاں ماہرین تعلیم اور عربی زبان کے ادباء اور ماہر اساتذہ کو مدعو کر کے ان سے عربی ذریعہ تعلیم کو موثر طریقے سے نافذ کرنے سے متعلق مختلف عملی پہلوؤں پر لکچر دلوا سکتے ہیں۔اس طرح کے کورسیز سے اساتذہ کی تدریسی صلاحیتوں میں یقیناً اضافہ ہوگا اور وہ طلبہ کے اندر عربی زبان وادب کا ذوق پیدا کرنے میں کامیاب ہوسکیں گے۔

اگر ممکن ہوتو مدارس کے اساتذہ کو عربی زبان سے متعلق تدریسی کورس کرنے کے لئے سوڈان کے خرطوم یونیورسٹی، سعودی عرب کے جامعہ ملک سعود، جامعہ احمد بن سعود اور جامعہ ام القریٰ کے معہد اللغۃ العربیۃ میں عربی زبان کی تدریس سے متعلق ماہانہ، سہ ماہی، ششماہی ٹریننگ کورسیز میں بھیجنے کی کوشش کی جائے؛ کیونکہ ان اداروں میں عربی زبان کو جدید تکنیک کے مطابق موثر انداز میں پڑھانے کے آسان اور مفید طریقے بتائے جاتے ہیں۔

نظام تعلیم سے متعلق بعض تدابیر

-اسی طرح آج کل عربی زبان کو جدید تکنیک کے مطابق پڑھانے کے موضوع پر عرب ممالک سے مختلف کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کا مطالعہ عربی زبان کے اساتذہ کے لئے مفید ہوگا، ان کتابوں کی مدد سے اساتذہ بہتر انداز میں تدریسی خدمات انجام دے سکتے ہیں؛ کیونکہ ان کتابوں میں تدریس کے نظریاتی طریقوں کے بجائے عملی طریقوں پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔عربی نحو وصرف کے اصولوں کی الگ سے تعلیم دینے کے بجائے دوران درس ان اصولوں کی طرف نشاندہی پر زور دیا گیا ہے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

’’تعلیم اب ایک مکمل فن کی صورت اختیار کر چکا ہے، دنیا میں ہزاروں لاکھوں ادارے اس موضوع اور اس کے طریقہ کار پر کام کر رہے ہیں لیکن ہمارے مدارس نے طریقہ تدریس میں کوئی اضافہ یا اصلاح کرنے کی کبھی نہیں سوچی، مثلاً عربی زبان کی تعلیم وتدریس کے اب بہت سارے نئے طریقے ایجاد ہو چکے ہیں، اب گرامر کی مدد سے زبان پڑھانا غیر ضروری اور غیر مفید سمجھا جاتا ہے بلکہ نصوص کے ذریعہ گرامر کو سمجھایا جاتا ہے، جس طرح ہم نے قواعد پر نظر رکھے بغیر اپنی مادری زبان سیکھ لی اور اسے بولتے وقت تذکیر وتانیث یا واحد، جمع یا غائب، حاضر، متکلم کے قواعد کا غیر شعوری طور پر ہمیں احساس رہتا ہے اور ہم کوئی غلطی نہیں کرتے اسی طرح عربی زبان کو بھی سیکھا جاسکتا ہے‘‘ (عربی واسلامی مدارس کا نصاب ونظام تعلیم، ج:۲، ص:۶۴)۔

-تفسیر، حدیث، فقہ اور منطق وغیرہ سے متعلق تمام مضامین کی تعلیم کے لئے عربی میڈیم کو لازم کرنے کے بجائے صرف عربی ادب کے لئے ہی عربی زبان میں تدریس کو ضروری قرار دیا جائے کیونکہ تمام اسلامی علوم کو عربی زبان میں پڑھانے کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔

-فضیلت کے آخری درجات میں تمام طلبہ کے لئے ہر مضمون کو لازم قرار نہ دیتے ہوئے اختصاص کے اصول کے تحت طلبہ کی صلاحیت اور ان کی دلچسپی کے مطابق ان کو اسلامی علوم یا عربی ادبیات میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا جائے۔عربی ادبیات میں طلبہ کی صلاحیت اور ان کی دلچسپی کو پرکھنے کے لئے ایک داخلہ Test رکھا جائے اور اس میں کامیاب ہونے والے طلبہ کو ہی عربی ادبیات میں اختصاص تدریس کے لئے داخلہ دیا جائے۔اور پھر اتنی ہی تعداد میں طلبہ کو داخلہ دیا جائے جن کی ہمہ جہت تعلیم وتدریس کے لئے ہمارے پاس اساتذہ موجود ہوں۔

-عربی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی صورت میں عربی ادب کے استاد کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ عربی متون کو صحیح مخارج، اصول تجوید، نطق ولہجے کی پوری رعایت کے ساتھ طلبہ کے

سامنے متعدد بار بلند آواز سے پڑھے اور پھر باری باری طلبہ سے بھی اس لب و لہجے میں پڑھوانے کی مشق کرائے؛ کیونکہ تدریس کے جدید طریقوں کے مطابق کسی بھی زبان کو سن کر اور پھر اسی طرز پر بول کر آسانی سے سیکھا جاسکتا ہے۔عربی زبان میں الفاظ کے صحیح مخارج کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ تلفظ کے اختلاف سے یہاں معانی ومفہوم یکسر تبدیل ہو جاتے ہیں، اگر ہم درست لہجے میں عربی الفاظ کو ادا نہ کریں تو ایک عرب ہماری گفتگو کو سمجھنے سے قاصر رہے گا۔اسی طرح استاد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دوران تدریس اپنے چہرے کے تاثرات اور بوقت ضرورت ہاتھوں کے اشارات کا بھی استعمال کرے؛ کیونکہ تدریس کی جدید تکنیک میں باڈی لنگویج کی بڑی اہمیت ہے، الفاظ کے ذریعہ جو کمی رہ جاتی ہے اشارات سے اس کی تلافی ہو جاتی ہے۔

-عربی ادب کے استاد کے لئے یہ بھی مناسب ہے کہ وہ اپنے مطالعہ کو وسیع کرے تاکہ وہ دوران تدریس متون کی وضاحت کے لئے درسیات تک میں محدود نہ رہے بلکہ وہ کتاب سے ہٹ کر مترادفات اور مختلف اسالیب بیان کو اختیار کرے، اس صورت میں طلبہ درس میں پوری دلچسپی لیں گے، استاد کی باتوں کو غور سے سنیں گے، ان کے دلوں میں استاد کی قدر ومنزلت بڑھے گی اور ان کو اس بات کا احساس ہوگا کہ آج دوران درس ان کو کچھ نیا سیکھنے کو ملا اور ان کی معلومات میں اضافہ ہوا۔اس طرح وہ طلبہ کے اندر علم کا شوق پیدا کرنے اور اس موضوع سے متعلق دیگر کتابوں کا مطالعہ کرنے کی طرف رغبت دلانے میں کامیاب ہو سکے گا۔استاد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ طلبہ کو عربی اخبارات ورسائل کا پابندی سے مطالبہ کرنے پر آمادہ کرے۔

-عربی میڈیم کو موثر بنانے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کلاس کا ماحول خوشگوار ہو۔ طلبہ کے دلوں میں اپنے اساتذہ کے لئے احترام اور اساتذہ کے دلوں میں طلبہ کے لئے پدرانہ شفقت ومحبت ہو۔وہ تعلیم وتدریس کے ساتھ اپنے شاگردوں کی جائز ضرورتوں کا خیال رکھیں، اگر ممکن ہو تو ان کے ذاتی مسائل میں بھی دلچسپی لیں۔عہد اکبری میں مشہور مدرس حکیم علی گیلانی

کے متعلق نقل ہے کہ وہ ہمیشہ طلبہ کو درس دیتے اور ان کے بغیر کھانا نہ کھاتے (ہندوستانی مسلمان: ابوالحسن علی ندوی، ص: ۱۴۴)۔ استاذ الملک مولانا محمد افضل جونپوری کو اپنے عزیز شاگرد ملا محمد جونپوری سے ایسا تعلق خاطر تھا کہ جب ان کا انتقال ہوا تو اس کی تاب نہ لاسکے، اور چالیس روز تک کسی نے استاد کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا اور اس کے بعد وہ اپنے شاگرد سے جا ملے (ہندوستانی مسلمان: ابوالحسن علی ندوی، ص: ۱۴۴)۔ اور دوسری طرف طلبہ بھی اپنے استاذ سے ایسی ہی عقیدت رکھتے تھے، ایک مرتبہ شمس العلماء ملا نظام الدین فرنگی محلی کے انتقال کی خبر مشہور ہوگئی، یہ خبر سن کر ان کے ایک شاگرد سید ظریف عظیم آبادی کی روتے روتے آنکھیں جاتی رہیں، اور دوسرے شاگرد سید کمال عظیم آبادی کا یہ خبر سنتے ہی انتقال ہوگیا جب کہ یہ اطلاع غلط تھی (نفس مصدر: ابوالحسن علی ندوی، ص: ۱۴۳)۔ ظاہر ہے اس طرح کے خوشگوار ماحول ہی میں طلبہ بے جھجک اپنے استاذ اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ عربی بولنے کی مشق کرسکتے ہیں۔

- عربی ادبیات کے نصاب میں شامل عربی زبان کے بعض مشہور اخلاقی واصلاحی ڈراموں کو استاد اپنی نگرانی میں چھٹی کے دنوں میں اسٹیج کرانے کی کوشش کرائے جس کے کرداروں کا انتخاب طلبہ کے درمیان سے ہی کیا جائے اور پھر ان کو ان کے ڈائیلاگ یاد کرائے جائیں، کرداروں کا انتخاب، مکالمات کے اندر حسب ضرورت تصرفات کے پورے اختیارات طلبہ کے سپرد کردیئے جائیں، اس سے طلبہ کے اندر خود اعتمادی آئے گی، ان کی جھجک اور شرم ختم ہوگی اور ان کو روزمرہ کی زندگی میں بول چال کے بہت سارے الفاظ یاد ہوجائیں گے۔

- کلاس میں طلبہ کے اندر دلچسپی اور حرکت وزندگی باقی رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ استاد بلیک بورڈ کا استعمال ضرور کرے، درس میں آنے والے مشکل الفاظ کو بلیک بورڈ پر لکھ کر ان کی وضاحت کرے، اس درس پر مبنی مختلف سوالات کو جلی حروف میں لکھ دے اور طلبہ کو ان کا عربی میں جواب دینے کے لئے کہے، اور جہاں تک ممکن ہوسکے استاد کلاس میں کھڑے ہوکر پڑھانے

کی کوشش کرے۔

- آج علم وفن، سائنس وٹکنالوجی، تجارت ومعیشت، طب وجراحت، سیاست وحکومت، نشر واشاعت، تبلیغ ودعوت غرضیکہ زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جو کمپیوٹر سے اچھوتا ہو، زندگی کے ہر چھوٹے بڑے میدان میں اس کی گراں قدر افادیت واہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔آج کے دور میں وہ شخص ناخواندہ کہا جاتا ہے جو کمپیوٹر اور اس سے بڑی تکنیک انٹرنیٹ وغیرہ کے استعمال سے ناواقف ہے۔ایسا نہیں ہے کہ آج انٹرنیٹ پر صرف مخرب اخلاق اور فحش فلمیں ہی موجود ہیں بلکہ عربی زبان وادب سے جڑی ہوئی مفید معلومات کا ایک سمندر موجود ہے، عربی زبان کو بہتر طور پر بولنے اور لکھنے سے متعلق ہزاروں پروگرام موجود ہیں، اسی طرح انٹرنیٹ پر عرب ممالک سے شائع ہونے والے اخبارات ورسائل، شعراء کے دواوین، قصہ، ناول، اور ڈرامہ وغیرہ کا بڑا ذخیرہ ہے جن میں سے اکثر کو طلبہ مفت میں Downlode کرسکتے ہیں۔ہم مدرسے کے کسی ایک کمرے کو کمپیوٹر روم بناسکتے ہیں جہاں کچھ کمپیوٹر رکھ دئے جائیں اور ان کو انٹرنیٹ سے جوڑ دیا جائے اور اساتذہ میں سے کسی ایک کو اس کی ذمہ داری دے دی جائے، اس کے لئے بھی بہت زیادہ سرمائے کی ضرورت نہیں ہوگی، کیونکہ کمپیوٹرس کی قیمتیں دن بدن کم ہوتی جارہی ہیں، ہم اس کے لئے پرانے کمپیوٹر بھی لے سکتے ہیں جو بہت کم قیمتوں پر دستیاب ہوسکتے ہیں۔اس طرح کے سینٹر قائم کرنے کے لئے مدارس کے ذمہ داران ادارہ برائے فروغ اردو زبان سے بھی رجوع کرسکتے ہیں جس کے پروگرام میں اقلیتوں کے لئے کمپیوٹر سیکھنے کے تربیتی سینٹر قائم کرنا شامل ہے، اس کے لئے وہ کمپیوٹر کے ساتھ ایک Instructor بھی مہیا کراتے ہیں۔بعض مدارس میں ان کے کمپیوٹر سینٹر قائم ہیں۔

-عربی میڈیم کو موثر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ طلبہ کو ابتدائی درجات میں زیادہ سے زیادہ قرآنی سورتوں اور احادیث کو زبانی یاد کرایا جائے، اور ان کے الفاظ ومعانی میں موجود

زبان و بیان اور فصاحت و بلاغت کے نکات کی نشاندہی بھی کردی جائے اسی طرح تدریجاً اگلی کلاسوں میں منتخب شعراء کے اشعار اور عربی نثر کے شہ پاروں کو بھی زبانی یاد کرانے کی مشق کرائی جائے، اس طرح طلبہ کے پاس عربی الفاظ اور اسالیب بیان کا بڑا ذخیرہ جمع ہو جائے گا اور وہ آسانی سے اپنی تقریر و تحریر میں ان کا استعمال کر سکتے ہیں۔ دور جدید میں ملک و بیرون ملک کے عربی زبان و ادب کے ادباء و محققین کی سوانح حیات کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے قدیم ادباء کی پوری پوری کتاب کو حفظ کر لیا تھا، معلقات، جمہرۃ اشعار العرب، کامل کی المبرد وغیرہ تو ہر ادیب و محقق یاد کر لیتا تھا، پروفیسر عبدالعزیز میمنی کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے عربی لغت اور ادب کی بعض کتابوں کو حفظ کر لیا تھا اور آخری ایام تک ان کو عربی زبان کے تقریباً ایک لاکھ اشعار یاد تھے۔

-اگر وسائل اجازت دیں تو اساتذہ کی نگرانی میں عربی زبان میں ماہانہ یا سہ ماہی کوئی عربی رسالہ یا میگزین نکالنے کی کوشش کی جائے جس میں مختلف موضوعات پر ضروری اصلاح کے بعد طلبہ کی تخلیقات کو شائع کیا جائے۔ ضروری نہیں کہ آغاز سے ہی یہ رسالہ قومی یا بین الاقوامی معیار کے مطابق ہو، وسائل کے مطابق پہلے اسے ریاستی سطح پر اور پھر ملکی پیمانے پر آگے بڑھایا جائے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے اخبار ''الرائد'' کے ماڈل کو سامنے رکھا جائے۔ اس طرح کے رسائل و اخبارات میں مدارس کے طلبہ کے مقالات شائع ہونے کی صورت میں ان کی ہمت افزائی ہوگی اور عربی زبان میں لکھنے کی مشق بھی ہوگی۔

-کسی زبان کو صحیح لب و لہجہ میں بولنے کی ٹریننگ دینے میں آج کل لنگویج لیب کی بھی بڑی اہمیت ہے، لنگویج لیب کی سہولیات اس وقت جواہر لعل نہرو یونیورسٹی (دہلی)، انگلش اینڈ فارن لنگویجز یونیورسٹی (حیدرآباد) اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے عربی شعبوں میں موجود ہیں۔ مدارس اپنے طویل مدتی پروگرام میں اس طرح کا لیب قائم کرنے کا منصوبہ رکھ سکتے ہیں۔ اس

طرح کے لیب قائم کرنے کے لئے بھی اقلیتی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنے والے مختلف سرکاری اور غیر سرکاری مالی اداروں سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

-آج کل ہم بڑی چھتریوں یا انٹرنیٹ کی مدد سے مختلف عرب ممالک سے نشر ہونے والے عربی پروگرام اور عربی نیوز چینلس کو آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ عربی ٹی وی چینلوں پر سیریل کی شکل میں دور جدید کے بعض مشہور ادباء کے عربی و تاریخی ڈرامے بھی نشر کئے جاتے ہیں۔ ان پروگراموں کو ریکارڈ کر کے سی ڈی کی مدد سے بھی طلبہ کو یہ عربی ڈرامے دکھائے جاسکتے ہیں۔ اس طرح کے عربی نیوز چینل اور عربی ڈراموں کے ذریعہ طلبہ کو بول چال کی عربی زبان اور عربی لہجے کو سیکھنے میں کافی مدد ملے گی۔ ضروری ہے کہ طلبہ اس طرح کے ٹی وی پروگرام کسی عربی استاد کی نگرانی میں دیکھیں تا کہ استاد بعض جدید الفاظ و مصطلحات کی بروقت ان کے سامنے وضاحت بھی کر دے۔ اس طرح بعض ٹی وی چینلوں پر عربی زبان کو سکھانے کے لئے صحیح تلفظ اور مخارج کی بھی تعلیم دی جاتی ہے، اس طرح کے پروگرام عربی زبان کی تدریس میں اختصاص رکھنے والے ماہر اساتذہ کی سرپرستی میں تیار کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح مصر، سعودی عرب، سوڈان، لبنان جیسے مختلف ممالک کے ریڈیو اسٹیشن سے بھی مختلف اوقات میں عربی زبان سکھانے کے پروگرام اور خبریں نشر کی جاتی ہیں۔

-عرب ممالک کی مختلف یونیورسٹیوں کے لنگویج کے شعبے نے غیر عربوں کو عربی زبان سکھانے کے لئے آڈیو اور ویڈیو کیسٹس کی شکل میں عربی دروس تیار کئے ہیں، ان کیسٹس میں ریکارڈ ہونے والے اسباق کو کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا ہے، عربی زبان سکھانے کے لئے ہم اس طرح کے کیسٹس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ طلبہ کے درمیان کتاب کو تقسیم کر کے ٹیپ ریکارڈ کو آن کر دیا جائے اور طلبہ اس کتاب کی مدد سے کیسٹس کی آواز اور لہجے کو Catch کرنے کی کوشش کریں؛ کیونکہ عربی زبان کو سیکھنے کا بنیادی اصول سننا اور بولنا ہے۔ کئی بار سبق کو سنانے کے بعد ٹیپ کو بند کر کے طلبہ

سے کہا جائے کہ وہ اسی لب و لہجے میں اسی سبق کو دہرائیں اور ان کی آواز کو ریکارڈ کر کے ان کو سنایا جائے اور پھر استاد ان کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی اصلاح کر دے۔

-عربی ادب و انشاء کی کلاس میں جہاں استاد عربی زبان میں تشریح کرے وہیں طلبہ کو بھی دوران درس عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں بولنے کی اجازت نہ ہو۔ درس ختم ہونے کے بعد استاد طلبہ سے عربی زبان ہی میں سوالات کرے جن کا جواب بھی عربی زبان میں دینا لازمی ہو، اور کبھی ان کو کچھ ایسے سوالات دے دیئے جائیں جن کا جواب طلبہ دوسرے دن لکھ کر لائیں۔ استاد اپنے طلبہ کو کلاس کے باہر بھی دوستوں سے عربی زبان میں گفتگو کرنے کی رغبت دلائے کیونکہ عربی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا بنیادی مقصد ہی عربی زبان میں تقریر و تحریر کی صلاحیت کو پروان چڑھانا ہے۔

عربی ادبیات کے نصاب سے متعلق تدابیر

بیشتر مدارس میں رائج عربی زبان و ادب سے متعلق نصاب میں اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ طلبہ کے اندر کتاب و سنت کو سمجھنے اور فقہی مسائل کے استنباط کی شکلیں آسان ہو جائیں، یہی وجہ ہے کہ مروجہ عربی نصاب میں عربی نحو و صرف کی مشق پر خاص زور دیا جاتا ہے اور عربی ادبیات کے نام پر معلقات، حماسہ، مقامات، کلیلہ دمنہ اور بعض مدارس میں مختارات و منثورات سے بعض منتخب اشعار و ابواب کے تدریس کو کافی سمجھا جاتا ہے، جب کہ وقت اور حالات کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عربی ادبیات کے نصاب پر نظر ثانی کر کے اس میں ضروری تبدیلی لانا ضروری ہے۔ مدارس میں عربی زبان کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے نافذ کرنے کی صورت میں ہماری یہ ترجیح ہونی چاہئے کہ عربی ادبیات کے نصاب میں انشا، تجوید، شعر و نثر کی ایسی کتابوں کو شامل کیا جائے جو زبان و بیان کے اعتبار سے سہل اور افکار و معانی کے اعتبار سے اخلاقی قدروں پر پوری اترتی ہوں۔ نثری و شعری مجموعوں کے انتخاب میں ادبی معیار کے ساتھ ساتھ طلبہ کے

ذہنی استعداد اور ان کے ذوق اور دلچسپی کا بھی خیال رکھا جائے۔عربی ادبیات کا ایک متوازن نصاب تیار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان اور عرب ممالک کی مختلف یونیورسٹیوں میں ثانوی، بی اے اور ایم اے کے درجات میں پڑھائی جانے والی کتابوں کو بھی سامنے رکھا جائے، بہتر ہوگا کہ مدارس میں عربی ادبیات کا نصاب تیار کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دے دی جائے جس میں مختلف مدارس میں عربی ادب کے اساتذہ کے ساتھ بعض یونیورسٹیوں کے عربی اساتذہ کو بھی رکھا جائے اور پھر باہم مشورے سے کوئی نصاب تیار کیا جائے۔کتابوں کا بوجھ کم کرتے ہوئے ادب وانشا سے متعلق کتابوں کو زیادہ رکھا جائے جس سے عربی زبان کو بولنے اور لکھنے کی زیادہ سے زیادہ مشق ہو سکے۔کتابوں کے انتخاب میں انگریزی وفرانسیسی جیسی ترقی یافتہ زبانوں کے معیار کو سامنے رکھا جائے۔عربی نحو وصرف کی تعلیم کے لئے قدیم کوفی اور بصری نحویوں کی ضخیم کتابوں کے بجائے نحوی وصرفی اصولوں کو آسان طریقے سے سکھانے کے لئے لکھی گئی جدید کتابوں کو نصاب میں جگہ دیں۔سابق وائس چانسلر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی اور ماہر تعلیم جناب سید حامد صاحب نے مدارس کے نصاب میں تبدیلی کے متعلق کہا تھا:

"ماضی سے واقفیت اس لئے حاصل کی جاتی ہے کہ ہم حال کو بہتر سے بہتر بنا سکیں اور پھر ایک تابندہ مستقبل کی تعمیر کر سکیں، اس لئے نہیں کہ ماضی کے اسیر ہو جائیں۔دینی مدارس کی تعلیم اگر عصری تقاضوں سے اسی طرح بیگانہ، ماضی، حافظہ اور تقلید کے مثلثی حصار میں اسی طرح اسیر رہی تو وہ فرسودہ ہوں گے اور ذہین طالب علموں کے لئے اس میں کوئی کشش باقی نہیں رہے گی۔وہی بچے اب دینی مدارس میں داخل ہوتے ہیں جو مالی یا ذہنی اعتبار سے عام انگریزی اسکولوں میں داخل نہیں ہو سکتے، یہ صورتحال تشویشناک ہے" (ملک وملت کی تعمیر اور دینی مدارس، ص: ۱۲۴)۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ قدیم اور جدید عربی ادب میں کوئی خاص فرق نہیں ہے لیکن ایسا کہنا بہت زیادہ درست نہیں ہوگا؛ کیونکہ عربی زبان نے اپنی طویل تاریخ کے ہر دور میں مختلف زبانوں کے الفاظ اور مصطلحات سے اپنے دامن کو وسیع کیا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری

ہے۔آج عرب کے مختلف ممالک میں ایسی بڑی بڑی لغوی اکیڈمیاں قائم ہیں جو سائنسی وادبی علوم وفنون کے میدان میں انگریزی، فرانسیسی، جرمنی جیسی ترقی یافتہ زبانوں سے الفاظ ومصطلحات کو مستعار لیتے ہوئے عربی زبان میں داخل کررہی ہیں؛ چنانچہ آج بازار میں میڈیکل، انجینئرنگ، سیاسیات، معاشیات اور دیگر سائنسی علوم کے لیے عربی زبان میں مستقل ضخیم لغات دستیاب ہیں۔

مراجع ومصادر:

۱- عربی واسلامی مدارس کا نصاب ونظام تعلیم اور عصری تقاضے۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵
۲- مقالات شبلی، علامہ شبلی نعمانی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۳۲
۳- مجلۃ علوم اسلامیہ، ج: ۱۴، ص: ۸۹، شعبہ اسلامیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۹۸
۴- ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، مولانا ابوالحسنات ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۷۱
۵- دینی مدارس اور ان کے مسائل (مقالات سمینار) ادارہ علمیہ، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، ۱۹۹۰
۶- ہندوستان میں عربی ادب اور علوم اسلامیہ کی تدریس وتحقیق، پروفیسر عبدالعلیم، سرفراز پریس، لکھنؤ، ۱۹۵۶
۷- تذکرہ سلیمان، غلام محمد، دارالمصنفین، اعظم گڑھ
۸- ''معارف'' سلیمان نمبر، ۱۹۵۵، دارالمصنفین، اعظم گڑھ
۹- ملک وملت کی تعمیر اور دینی مدارس، ادارہ علمیہ، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، ۱۹۹۵

۱۰- ہندوستان میں اسلامی علوم وادبیات، مرتب: عماد الحسن آزاد فاروقی، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۱۹۸۸

۱۱- ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۹۳

۱۲- ہندوستانی مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، مولانا مناظر حسن گیلانی، ندوۃ المصنفین، دہلی

۱۳- اللغة العربية فی الهند عبر العصور، خورشيد اشرف اقبال الندوی، الهيئة المصرية العلمية، القاهرة، مصر، ۲۰۰۸ء

۱۴- لغة العرب وكيف ننهض بها، محمد عطية الابراشی، دارالكتاب العربی، مصر، ۱۹۷۴

۱۵- مجلة العربية للناطقين بغيرها، العدد الرابع، ۲۰۰۷، معهد اللغة العربية، جامعة أفريقية العالمية، الخرطوم، السودان

۱۶- رسائل تكنالوجيا التعليم مبادئها وتطبيقاتها فی التعليم والتدريس، محمد زياد حمدان، دارالتربية الحديثة، الاردن، ۱۹۸۶

۱۷- وسائل الاتصال والتكنولوجيا فی التعليم، حسين احمد الطوبجی، مطبعة المعارف، القدس، ۱۹۷۹

۱۸- الوسائل التعليمية والمنهج، احمدی خير وجابر عبد الحميد، دارالنهضة العربية، القاهرة، ۱۹۹۱

۱۹- التقنيات التربوية فی تدريس اللغة العربية لغير الناطقين، علی القاسمی ومحمد علی السيد المغرب، ۱۹۹۱

٢٠- نظريات التعليم وتطبيقاتها التربوية، جودت عبد الهادى، دارالثقافة للنشر، عمان، الاردن، ٢٠٠٠

٢١- المدخل الى التقنيات الحديثة فى الاتصال والتعليم، مصطفى عيسى، جامعة الملك سعود الرياض، ١٩٩٨

٢٢- الاتجاهات المعاصرة فى تدريس اللغة العربية واللغات الحية الاخرى لغير الناطقين بها، ابراهيم حمادة، دارالفكر العربى، القاهرة، مصر، ١٩٧٨

٢٣- اقراص الفيديو - وصفها وكيفية استخدامها فى المجال التعليمى، عبد الرحيم صالح عبد الله، جامعة الكويت، الكويت، ١٩٨٢

٢٤- تقنيات التعليم والاتصال، عبد العزيز محمد العقيلى، مكتبة دارالقلم، الرياض، ١٩٩٣

☆☆☆

دینی مدارس میں عربی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر رائج کرنے کی ضرورت اور اس کی تدبیریں

مولانا محمد وثیق ندوی ☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على أفصح العرب سيد المرسلين خاتم النبيين محمد بن عبد الله الأمين وعلى آله وصحبه أجمعين وبعد!

مدارس عربیہ اسلام اور اس کی بنیادی عربی زبان کے تحفظ کے قلعے اور مسلمانوں کی دینی درستگی کے لئے سرچشمۂ حیات ہیں، ان کا وجود ایمان واسلام، اسلامی عقائد واحکام اور اسلامی تہذیب وتمدن کی بقاوتحفظ کا ضامن ہے، مدارس عربیہ نے امت کو ہر دور میں شرور وفتن، گمراہی وضلالت اور الحاد ودہریت سے محفوظ رکھا اور جب بھی امت اور اس کے دین وشریعت، عقائد ومسلمات، دینی تشخص اور اسلامی شناخت کے خلاف کوئی آندھی چلی تو یہ مدارس سینہ سپر ہوگئے اور امت کو ہر قسم کی تحریف اور زیغ وضلال سے بچایا۔ دراصل یہ مدارس وہ سانچے ہیں جن میں ایسے افراد ڈھل کر تیار ہوتے ہیں جو مسلمانوں کی ذہنی وفکری تربیت کرکے ان کے اصلی مزاج اور حقیقی خدوخال کو باقی وبرقرار رکھتے ہیں۔

یہ مدارس عربیہ مسلمانوں کی نہایت قیمتی متاع اور بیش بہا سرمایہ ہیں، جن سے وہ فقیری میں بھی امیر ہیں، ہم اس بیش بہا قیمتی متاع پر جس قدر فخر کریں بجا ہے، موجودہ دور میں قوم کی

☆ استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

واقعی خدمت اور ملک کو اچھے اور بہتر شہری مہیا کرنے کے لئے بھی مدارس کا وجود نا گزیر ہے۔

موجودہ دور میں شریعت اسلامی، دینی تشخص اور اسلامی شناخت کی حفاظت کے ساتھ ساتھ عربی زبان کی حفاظت بھی اولین فریضہ بن گئی ہے، کیونکہ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی سے عربی زبان کو ختم کرنے کی بڑے منصوبہ بند طریقہ سے مہم جاری ہے، اور قرآن جو مسلمانوں کا اصل سرچشمۂ قوت وحیات اور مشعل راہ ہے، اس میں تحریف اور اسے آوٹ آف ڈیٹ کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ صلیبی جنگوں کے دوران جب یورپ نے یہ سمجھ لیا کہ مسلمانوں کو میدانِ جنگ میں شکست دینا آسان نہیں اور ان میں قوت ایمانی، قربانی اور جاں نثاری کا جو جذبہ ہے اس کی اصل بنیاد قرآن ہے اور یہ عربی زبان میں ہے تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ عربی زبان ہی کو ختم کر دیا جائے اور جب مسلمان عربی زبان سے نابلد ہو جائیں گے تو قرآن سے ان کا رشتہ ٹوٹ جائے گا اور جب قرآن سے ان کا تعلق ختم ہو جائے گا تو مسلمان خود بخود کمزور ہو جائیں گے اور ان کو زیر کرنا آسان ہو جائے گا۔

برطانیہ کے سابق وزیر اعظم گلا دسٹون نے برطانوی پارلیمنٹ میں قرآن ہاتھ میں لے کر کہا تھا کہ ''جب تک مسلمانوں کے پاس یہ قرآن موجود ہے یورپ مشرق پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا''۔

الجزائر کے فرانسیسی وائسرائے نے الجزائر پر فرانسیسی سامراج کے سو سال پورے ہونے پر کہا تھا کہ ''جب تک یہ قرآن پڑھتے رہیں گے اور عربی زبان بولتے رہیں گے ہم ان پر قبضہ نہیں کر سکتے، لہٰذا اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ان کے درمیان سے قرآن کے وجود کو مٹا دیں اور عربی زبان کو ختم کر دیں'' (قادة الغرب يقولون: دمروا الاسلام، مؤلفہ: جلال العالم، ص: ۳۸، عمان دار الارقم، ۱۹۸۱ء، اور الشباب المسلم والحضارة الغربية، مؤلفہ: حسن حسن سلیمان، ص: ۵۰، دار الشروق جدہ، ۱۹۸۵ء)۔

یہیں سے عربی زبان جو نزول قرآن کریم کے عہد میں اسی عہد کے الفاظ واسلوب کی

زبان تھی اس کے اندر خاص طور پر اس کی شاعری میں جو اس وقت عربی کی بڑی اساس تھی تشکیک کا دور شروع ہوا۔ مارگولیوتھ Margoliouth پہلا مستشرق ہے جس نے شعر جاہلی میں شک پیدا کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جب قدیم اصل عربی زبان میں شک پیدا ہو جائے گا تو اس سے قرآن وحدیث کی زبان بھی مشکوک ہو جائے گی اور یہ نا قابل اعتبار سمجھی جائے گی اور مسلمان اس کو چھوڑ دیں گے جو ان کی حقیقی قوت کا سرچشمہ ہے، مغرب کی اس یقین کے بعد کہ عربی زبان اور مسلمانوں کا اپنے دین اسلام سے رشتہ توڑنے کا بہترین ذریعہ عربی زبان کو ختم کر دینا یا کم سے کم بے اعتبار بنا دینا ہے، اور جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کا تعلق قرآن سے ختم ہو جائے گا، عربی زبان کے خلاف یلغار شروع ہو گئی۔ اس یلغار میں مغربی مستشرقین کے ساتھ ساتھ عالم عربی کے جدید تعلیم یافتہ نوجوان بھی شریک ہو گئے جن کی ذہن سازی اور تربیت مغربی تعلیمی اداروں میں ہوئی تھی۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"یورپ سے تعلیم پا کر آنے والوں کی حالت یہ تھی کہ مغربی روح ان کے اندر پوری طرح سرایت کر چکی تھی، وہ اسی کے دماغ سے سوچتے تھے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس کے پھیپھڑوں سے سانس لیتے تھے، وہ اپنے مستشرق اساتذہ کی صدائے بازگشت بن کر وہی خیالات ونظریات پورے یقین ووثوق اور پورے جوش اور سرگرمی کے ساتھ اپنے ملک میں پھیلانے کی کوشش کرتے، دنیا کے کسی گوشہ میں اگر کوئی مستشرق کوئی نظریہ یا خیال پیش کرتا تو مصر میں نہ صرف اس کی حمایت کرنے والا بلکہ پورے خلوص اور پورے زور قلم اور انشاء پردازی کے ساتھ اس کا شارح وداعی کوئی نہ کوئی ادیب اور مفکر اسی وقت مہیا ہو جاتا" (مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص: ۱۴۷)۔

ان میں سرفہرست مصر کے ادباء (جن میں عیسائی اہل قلم پیش پیش رہے) تھے، مثال کے طور پر سلامہ موسی، ڈاکٹر طہٰ حسین، لویس عوض، رفاعہ بک طہطاوی، قاسم امین، محمد حسین ہیکل،

یعقوب صروف، فرح انطون، شبلی مسلم، غالی شکری، عبد العزیز فہمی، عیسی اسکندر معلوف اور محمد عثمان جلال وغیرہ نے عربی علوم و معارف اور اسلامی احکام کو عامی مصری زبان اور لاطینی رسم الخط میں لکھنے کی تحریک چلائی۔

۱۹۲۶ء میں ولیم ولکوکس انجینئر نے عربی زبان کو چھوڑ کر عامی زبان استعمال کرنے کی دعوت دی اور انجیل کے چار حصوں کو عامی زبان میں منتقل کیا جس کا نام ''اللغة المصرية'' رکھا، قاسم امین نے ترکی زبان کے طرز پر اعراب کو ختم کرنے اور احمد سید لطفی نے عامی زبان استعمال کرنے کی دعوت دی۔ انستاس کرملی نے انگریزی زبان کے طرز پر لفظ کے آخری حرکات کو حروف میں لکھنے کی تجویز رکھی، مثلاً: ''ضرب:کو'' ضارابا'' ''سعدٌ'' کو'' ساعدون''، ''سعداً'' کو'' ساعدان''، اور سعدٍ'' کو'' ساعدین''، ''محمدٌ'' کو'' موحاممادون'' وغیرہ، جبران خلیل جبران اور ادباء مہجر نے عربی زبان کو چھوڑ کر مغربی زبان اختیار کرنے کی تحریک چلائی۔ سب سے زیادہ نقصان سلامہ موسی، لویس عوض اور ڈاکٹر طہ حسین نے پہونچایا، لویس عوض اور طہ حسین نے عربی زبان کے ساتھ عربی تمدن کو بھی چھوڑنے کی پُر زور وکالت کی بلکہ عملی طور پر اس کے لئے مہم چلائی۔ طہ حسین نے اپنی کتاب ''مستقبل الثقافة في مصر'' میں صاف طور پر اس کی دعوت دی ہے کہ ''ہمیں اہل یورپ کے طریقہ پر چلنا چاہئے اور ان کی سیرت و کردار اختیار کرنا چاہئے تاکہ ہم ان کے برابر ہو سکیں، اور تہذیب کے خیر و شر، تلخ و شیریں، پسندیدہ و ناپسندیدہ ہر چیز میں ان کے رفیق کار اور شریک حال ہو سکیں'' (ص:۴۱)۔

''ہم ایک یورپین کو باور کرادیں کہ اشیاء کو ہم اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس نظر سے ایک یورپین دیکھتا ہے، ان کی وہی قدر و قیمت ہماری نظر میں ہے جو اس کی نظر میں ہے، ان کے متعلق وہی رائے قائم کرتے ہیں جو ایک مغربی قائم کرتا ہے'' (ص:۴۴)۔

طہ حسین نے ''في الشعر الجاهلي (في الأدب الجاهلي) میں ڈیکارٹ کے

فلسفۂ شک کو بنیاد بنا کر شعر جاہلی کو کنڈم کرنے کی کوشش کی، مغرب نے طہٰ حسین کو بہت سراہا بلکہ سر پر بٹھایا اور اپنا سامراجی مقصد پورا کیا۔

اسلام پسندوں نے اس تحریک کا جم کر مقابلہ کیا، اور مخالفین کو دندان شکن جواب دیا، ان میں سرفہرست مصطفی صادق الرافعی، محمود محمد شاکر، انور جندی، محبّ الدین الخطیب، حافظ ابراہیم اور ڈاکٹر ناصر الدین اسد اور اخوانی ہیں۔

عربی زبان کی اسی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مغرب مختلف طریقوں سے اس کے خلاف اور قرآن کریم کے خلاف مہم چلاتا رہتا ہے، گزشتہ سال جرمن مستشرق رودی باریٹ کی ایک کتاب شائع ہوئی جس میں اس نے قرآن کریم، محمد ﷺ اور پیغام محمدی کو نشانہ بنایا اور قرآنی آیات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے، اس کتاب کا عربی میں ترجمہ ڈاکٹر رضوان السید نے "محمد و القرآن، دعوة النبی العربی و رسالته" کے نام سے کیا ہے، اسی طرح متشدد عیسائی وائلڈرز گیرات (ہالینڈ) نے "فتنہ" نامی فلم بنائی جس میں قرآن کریم کو جنگ اور تشدد کی کتاب کے طور پر پیش کیا۔ جو عربی زبان سے نابلد ہیں وہ قرآن کی تعلیمات کو صرف ترجمہ کی بنیاد پر صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے، اس کے لئے عربی زبان جاننا ضروری ہے، اس لئے مدارس عربیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ عربی زبان کی حفاظت اور اس کی تعلیم کے پختہ انتظامات کریں، اور عربی زبان میں ایسے ماہرین پیدا کریں جنہیں قرآن و حدیث میں رسوخ اور مہارت حاصل ہو تا کہ امت اسلامیہ بلکہ پوری انسانیت کی رہبری کا فریضہ انجام دیں، اس لئے کہ یہ امت اسلامیہ امت دعوت و ہدایت ہے۔

کسی بھی زبان کو سیکھنے اور اس میں مہارت پیدا کرنے میں نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم دونوں کا بنیادی کردار ہوتا ہے، اس لئے ماہرین تعلیم و تربیت اس بات کو ضروری قرار دیتے ہیں کہ نصاب تعلیم میں تبدیلی کے پہلو بہ پہلو طریقہ تعلیم میں بھی تبدیلی ہو اور عربی زبان ہی کو ذریعہ

تعلیم کے طور پر اختیار کیا جائے، جس طرح انگلش میڈیم اسکولوں میں انگریزی زبان ہی کو طریقہ تعلیم کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے، جس سے پڑھنے والوں میں ابتداء ہی سے انگریزی زبان میں لکھنے اور بولنے کی صلاحیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مدارس عربیہ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں منارہ نور یا بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی ہیں، جن کا فیضان صرف مسلمانوں ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ ان کی خیر و برکت سے پورا ملک متمتع ہو رہا ہے، اور مدارس کا جو بنیادی مقصد ہے وہ اس میں کامیاب بھی ہیں، لیکن عربی زبان جو مقدس قرآن کریم کی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح پر بولی، سمجھی اور برتی جانے والی زبان ہے، اس میں مطلوبہ ماہرین پیدا نہیں ہو رہے ہیں، اب جبکہ حالات بدل گئے ہیں، اور عربی زبان کو سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت ختم کرنے کی کوششیں جاری ہیں، فضلائے مدارس میں عربی زبان میں رسوخ، مہارت اور قدرت پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اور چونکہ ملت اسلامیہ کا بنیادی سرمایہ اور شریعت اسلامیہ کے امہات مصادر عربی زبان میں ہیں اس لئے ان سے براہ راست استفادہ کے لئے بھی عربی زبان میں مہارت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح موجودہ دور میں عالم عربی میں عربی زبان میں نئی نئی علمی اور تاریخی تحقیقات، ادبی تخلیقات اور اسلامی تمدن اور مغربی تمدن کے متعلق معلومات شائع ہو رہی ہیں، ان سے واقفیت اور علماء عرب کے خیالات و افکار سے براہ راست واقفیت کے لئے بھی عربی زبان میں مہارت کی ضرورت ہے۔

مدارس عربیہ میں مروجہ نصاب کی مدت تکمیل تقریباً اٹھارہ سال ہے، جو چار مرحلوں پر مشتمل ہے، ابتدائیہ، ثانویہ، عالیہ اور اختصاص، لیکن ادھر دیکھا یہ جا رہا ہے کہ اس مدت کی تکمیل کے بعد بھی فارغین میں عربی زبان میں وہ صلاحیت پیدا نہیں ہوتی جو ہونی چاہئے، جبکہ انگلش میڈیم اسکول میں پڑھنے والا ابتداء ہی سے انگریزی زبان میں بولتا اور سمجھتا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟

ماہرین تعلیم کی نظر میں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہاں نصاب تعلیم کے ساتھ طریقہ تعلیم بھی انگریزی زبان ہے جس کی وجہ سے طالب علم کو ابتداء ہی سے سب کچھ انگریزی زبان ہی میں کرنا ہوتا ہے، اور اسی کے ساتھ استاد کا کام کم اور طالب علم کا کام زیادہ ہوتا ہے، بلکہ نئے نظام تعلیم میں استاد صرف رہنمائی کرتا ہے، استاد درجہ میں آتا ہے، کوئی موضوع دے دیتا ہے اور طلبہ سے اس پر برجستہ تحریراً یا تقریراً اظہار خیال کو کہتا ہے، اس طرح طالب علم مجبور ہوتا ہے کہ وہ محنت کرے ورنہ ناکام ہو جائے گا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم انگلش میڈیم اسکول کی تقلید کریں، بلکہ یہ نبوی اصول "خذ ماصفا ودع ماکدر" کے تحت ہے۔

- لیکن یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ مدارس عربیہ کا جو دینی نصاب ہے وہ اتنی مقدار میں ہے کہ اس کے ساتھ ہر طرح کے علوم زیادہ مقدار میں شامل نہیں کئے جاسکتے، لیکن ان میں سے جو واقعی ضروری ہیں ان کا انتخاب اور ان کی ضروری مقدار میں ان کو داخل کیا جاسکتا ہے، اس اضافہ کے لئے عربی مدارس میں فکر کی جارہی ہے اور گزشتہ صدی میں ندوۃ العلماء نے اس کی طرف توجہ اور کوشش شروع کردی تھی جس کے اچھے نتائج سامنے آئے۔

ملک کے اندر قائم نظام تعلیم دو علیحدہ علیحدہ شعبوں میں منقسم رہتے ہوئے چل رہا ہے، ایک خالص دینی دوسرا خالص دنیاوی، اس کی وجہ سے امت کے تعلیم یافتہ دو الگ الگ راستوں پر چل رہے ہیں اور ایک دوسرے سے بعد رکھتے ہیں، بہر حال دونوں مختلف الجہت طبقوں کے درمیان تعاون اور قربت کی بھی ضرورت ہے، یہ ضرورت صرف مدارس عربیہ ہی کے ذریعہ پوری نہیں ہوسکتی ہے، اس کے لئے غیر دینی نظام کو اسلامی تقاضوں کا لحاظ کرکے دین و دنیا کو باہم یکجا کرنا ہوگا اور دینی مضامین کو اپنے نظام تعلیم میں جگہ دینی ہوگی اور چونکہ وہ تعداد کے لحاظ سے بہت بڑی تعداد میں ہیں اور ان کا اثر پڑ رہا ہے اس لئے ان کی اس کی طرف توجہ زیادہ مفید اور زیادہ وسیع اثر پیدا کرے گی جس کی اس امت کو ضرورت ہے، اس کے لئے عصری مدارس اور عصری

تعلیمی درسگاہوں کو ضروری حد تک اس کی طرف توجہ کرنی ہوگی اور اپنا طریقہ فکر بدلنا ہوگا، محض مدارس دینیہ میں عیب نکالنا اور عصری دانشگاہوں کی کمزوریوں کو نظر انداز کرنا صحیح نہیں قرار دیا جاسکتا، اسلامی تعلیمات سے وابستہ رکھنے کے مضامین کو اپنے نظام تعلیم میں شامل کرنا ہوگا، تاکہ ان سے تعلیم حاصل کرنے والے اسلام کے عقیدہ وخیال سے وابستہ رہیں، اور مغربی فکر وخیال میں گم ہوکر ''درکان نمک نمک شد'' نہ ہوجائیں، یہی مدارس عربیہ اپنے نصاب میں سماجی اور بشری ضرورتوں سے واقف کرانے والے مضامین بھی شامل کریں، نیز ذرائع کی حد تک تعلیم کے نظم وانتظام کے جدید تجربوں سے حاصل طریقوں سے بھی فائدہ اٹھائیں کہ "**الحکمة ضالة المؤمن فأین وجدها فهو أحق بها**"۔

دینی اور عصری تعلیم کے جامع اور ماہرین کہتے ہیں کہ یہ اس طرح ہو کہ دینی مدارس میں پڑھائے جانے والے مذہبی علوم میں وسعت وپختگی میں کمی نہ آئے، تاکہ دینی اور اخلاقی ضرورتوں کے لئے امت کو برابر اچھے رہبر ملتے رہیں، اور نصاب میں تغیر کی دعوت کے تعلق سے دونوں باتوں کی طرف توجہ کی ضرورت ہے، بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دینی مدارس کو اپنے نصاب تعلیم میں جدت لانے کی دعوت کی ضرورت اتنی نہیں جتنی کہ جدید تعلیمی نظام میں اسلامی تعلیمات کو داخل کرنے کی ضرورت ہے۔ اور ایسا نہ کرنے پر ملت اسلامیہ کو اپنے تشخص اور ثقافت ومذہبی قدروں سے دستبردار ہونا پڑے گا، لہٰذا اصلاح نصاب کی ضرورت سیکولر اداروں کے لئے زیادہ ہے، کیونکہ ان کی تعداد زیادہ ہے اور وہ امت کی نئی نسل کے اکثر افراد کی ذہنی واخلاقی تشکیل کا کام انجام دیتے ہیں اور نئی نسل کے اکثر افراد ان ہی کی تعلیم وتفہیم کے ذریعہ اپنی زندگی کا مطمح نظر بناتے ہیں، ان اداروں کے ذمہ داروں کو اس کی طرف خصوصی توجہ کرنی چاہئے تاکہ مسلمانوں کی نئی نسل کا مذہبی تشخص ختم نہ ہو اور وہ اپنے مذہب سے بالکل ناواقف نہ رہیں۔

رہا مسئلہ مدارس عربیہ میں عربی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر رائج کرنے کی ضرورت کا

تو اس کے لئے ضروری ہے کہ عربی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کیا جائے، تاکہ طلبہ میں عربی زبان میں مہارت، پختگی اور رسوخ پیدا ہو اور وہ براہ راست مصادر شریعت سے استفادہ کر سکیں اور موجودہ دور میں عالم عربی میں عربی زبان میں جو نئی تحقیقات اور معلومات آ رہی ہیں ان سے مستفید ہو سکیں۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل باتیں ملحوظ رکھی جائیں تو بہتر ہوگا۔

۱-عربی زبان کو طریقہ تعلیم کے طور پر اختیار کیا جائے۔

۲-اس کے لئے تجربہ کار اساتذہ اور اچھے طلبہ فراہم کئے جائیں اور زمانہ اور عصری تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے مفید نصاب تیار کیا جائے، اس لئے کہ ماہرین تعلیم و تربیت کا کہنا ہے کہ کوئی بھی تعلیمی نظام اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب اس میں یہ تینوں چیزیں موجود ہوتی ہیں، اگر ان باتوں کا لحاظ رکھا جائے تو امید کر سکتے ہیں کہ تعلیم کا مطلوبہ مقصد حاصل ہو۔

۳-مروجہ نصاب میں بوجھ کو کم کیا جائے، جو مضامین وقت کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں ان کو کم کر دیا جائے اور وہ مضامین شامل کئے جائیں جو دینی اصول و مبادی اور اسلامی قدروں سے متصادم نہ ہوں اور زمانہ کی ضرورت اور تقاضہ کو پورا کرتے ہوں۔

۴-بسہولت اگر ممکن ہو سکے تو قرآن مجید اور حدیث نبوی کے متن اور نصوص کو براہ راست پڑھایا جائے، اور طلبہ کو عربی مصادر اور مراجع کے مطالعہ کا شوق دلایا جائے بلکہ ان پر زور ڈالا جائے کہ وہ عربی مصادر اور مآخذ ہی کی طرف رجوع کریں، اور ان میں علمی مسابقت اور مطالعہ کا شوق پیدا کرنے کے ترغیبی یا تربیتی ذرائع کا اہتمام کیا جائے۔

۵-طلبہ پر لازم کیا جائے کہ وہ خود سبق کی تیاری کریں اور درجہ میں بھرپور تیاری کے ساتھ آئیں، استاد سنے اور رہنمائی کرے، اس طریقہ سے طلبہ میں خود اعتمادی اور تفکیر کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

۶-سبق ہونے کے بعد استاد طلبہ سے کہے کہ وہ پڑھے ہوئے سبق کی عربی میں تلخیص

پیش کریں یا نوٹ لکھ کر دکھائیں۔ اس سے مافی الضمیر کی ادائیگی کا سلیقہ پیدا ہوگا۔

۷-عربی انشاء اور تمرین کے سلسلہ میں تقلیدی اور روایتی انداز ترک کر کے عصری انداز اختیار کیا جائے جو کسی بھی زبان کو سیکھنے کے لئے ضروری ہے، عربی انشاء میں مہارت اور قدرت رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ جس زبان کو سیکھنا چاہتے ہیں براہ راست اسی میں لکھایا جائے اور ترجمہ کا انداز نہ ہو، اور عناوین متنوع اور روزمرہ کی زندگی سے متعلق ہوں۔ عربی کے ممتاز ادیب اور نقاد عباس محمود العقاد نے اپنی سوانح حیات ''انا'' میں لکھا ہے کہ ''میں نے عربی انشاء اس طرح سیکھی کہ ہمارے استاذ درجہ میں داخل ہوتے ہی کوئی موضوع دے دیتے اور برجستہ اس پر لکھنے کا مطالبہ کرتے، اس سے ذہن پر زور پڑتا اور مطلوبہ موضوع کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے مضمون لکھنا پڑتا، اس کے نتیجہ میں مختلف اور متنوع موضوعات پر لکھنے اور تفکیر کی صلاحیت پیدا ہوئی''۔ اس طریقہ سے طالب علم کے اندر متنوع موضوعات پر برجستہ لکھنے اور تفکیر کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

۸-عربی زبان کو سیکھنے کے لئے عربی اخبارات، جرائد اور مجلات کا مطالعہ لازمی کیا جائے، اس لئے کہ عربی اخبارات ورسائل میں انسانی زندگی کے متنوع مسائل، نئے حالات وواقعات اور نئی ایجادات اور آلات سے متعلق الفاظ مل جاتے ہیں، جو لغت میں نہیں ملتے اور ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ رائج زبان سے واقفیت ہوتی ہے، اس لئے کہ اگر کوئی شخص رائج زبان نہیں جانتا تو اس کی بات قابل اعتناء نہیں سمجھی جاتی۔

۹-طلبہ میں عربی زبان میں لکھنے اور بولنے کے لئے ہفتہ، یا پندرہ دن یا مہینہ میں کسی علمی اور ثقافتی موضوع پر ورکشاپ کرایا جائے اس میں طلبہ متعینہ موضوع پر کسی استاد کی نگرانی میں تیاری کریں اور پھر نقاش ہو، اس سے گفتگو اور بات کہنے کا سلیقہ آئے گا۔

۱۰-طلبہ پر لازم کیا جائے کہ وہ آپس میں گفتگو عربی زبان ہی میں کریں۔

۱۱- عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ وہ طلبہ جو سال بھر تساہلی برتتے ہیں اور محنت نہیں کرتے، امتحان قریب آتے ہی وہ بھی محنت کرنے لگتے ہیں اور امتحان میں فیل ہوجانے کا خوف ستانے لگتا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اگر امتحان کے نظام کو اور منظم اور سخت کردیا جائے تو اچھے نتائج برآمد ہونے کی امید کی جاسکتی ہے۔ یہودیوں کے یہاں نظام تعلیم میں اس بات کا سخت التزام کیا جاتا ہے کہ یہودی طلبہ کے لئے امتحان میں پاس ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر مضمون میں 95% نمبر لائیں، بصورت دیگر انہیں آگے کی تعلیم سے روک دیا جاتا ہے، اس کی وجہ سے وہ سخت محنت کرتے ہیں اور سارا وقت مطالعہ اور تعلیم میں صرف کرتے ہیں اور غیر یہودی طلبہ کو کم مارکس لانے کے باوجود آگے بڑھا دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ بغیر علمی صلاحیت کے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور فارغ ہونے کے بعد بالکل تہی دست ہوتے ہیں اور پھر زندگی میں حاشیہ پر چلے جاتے ہیں، یہ بات محتاج بیان نہیں کہ آج دنیا میں ذہانت اور علم میں سب سے ممتاز یہودی ہی ہیں۔ اور موجودہ دور میں مسلمانوں کو جس یلغار کا سامنا ہے وہ علم کے ہی راستہ سے کی جارہی ہے۔

۱۲- اگر اساتذہ کی علمی استعداد اور ان کے اختصاص اور رجحانات کا لحاظ کرتے ہوئے اسباق ان کے ذمہ کئے جائیں تو زیادہ مفید ہوگا، اسی طرح ابتدائی تعلیم کی پختگی اور عمدگی کی طرف بھی توجہ کی ضرورت ہے۔

۱۳- مرحلہ وار عربی زبان کا مطالعہ کرایا جائے۔ اس سلسلہ میں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ زبان ہی ادب تک پہونچاتی ہے اور علم تک بھی، کردار وثقافت تک بھی، اخلاق ودین تک بھی، اس لئے زبان کی تعلیم ونصاب میں اس کا اہتمام کرنا ضروری ہوتا ہے، کہ وہ صحیح سمت لئے جائے اور پسندیدہ کردار تک پہونچائے، زبان کی کتابوں کی تصنیف میں اور زبان کے نصاب کے لئے کتابوں کے انتخاب میں اس پہلو کی طرف توجہ دینا نہ صرف زبان کے موضوع کی

بات ہے بلکہ اخلاق ونفاست، دین وکردار سب کی بات ہے۔اس سلسلہ میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا عربی سلسلہ القراءۃ الراشدہ، قصص النبیین، قصص من التاریخ الاسلامی، مختارات من ادب العرب، اذاہبت ریح الایمان، علی طنطاوی کی تحریریں، منفلوطی کی تحریریں، مصطفیٰ صادق الرافعی کی تحریریں، جودۃ السحار اور عطیہ الابراشی کے عربی قصے، ڈاکٹر عبد الرحمٰن رافت پاشا کی تحریریں، کامل کیلانی کا سلسلہ ''القصص العربیۃ'' علامہ سید سلیمان ندوی کی ''لغات جدیدۃ'' مولانا عبدالسلام قدوائی کی تصنیف ''عربی کے دس سبق'' حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی کتاب ''منثورات'' اور مولانا وحید الزماں کیرانوی کی ''نفحۃ الادب'' سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

اور اسلام کو درپیش خطرات کے مقابلہ کے لئے ہمیں ایسے جامع افراد کی ضرورت ہے جو دنیا کے مختلف حصوں میں تعلیم وتربیت اور دعوت وتحریک کا کام انجام دے سکیں اور میدان میں نکل کر مقابلہ کی صلاحیت کے ساتھ اسلام کی خدمت انجام دے سکیں اور ایسا اس وقت ممکن ہے جب کہ ایک ایسا تعلیمی، تربیتی اور ثقافتی نظام مرتب کیا جائے جو قدیم وجدید کا جامع ہو، جس میں سمٹنے کے بجائے پھیلنے کی صلاحیت ہو، جس کے فارغین دعوتی جذبہ، علمی صلاحیت، عصری واقفیت اور خود اعتمادی کے ساتھ مسجد، مدرسہ ہی نہیں، بلکہ زندگی کے ہر گوشہ میں دعوت اسلام کا کام انجام دیں، اس کے لئے ہمیں اپنے تعلیمی اور تربیتی نظام کی ازسرنو تنظیم کرنی ہوگی۔

☆☆☆

چھٹا باب

مدارس میں ریسرچ و تحقیق

دینی مدارس کے شعبہائے اختصاص میں ریسرچ و تحقیق

مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی ☆

نبوی نظامِ تعلیم میں اختصاص کی اہمیت:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیمی وتربیتی نظام میں ''بنیادی اور عمومی مرحلہ'' کی تعلیم فرض کے درجہ میں ہے **طلب العلم فریضة علی کل مسلم** (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 220، باب فضل العلم والحث علی طلب العلم)۔ اسی طرح کسی خاص فن میں ''اختصاص وتخصص'' کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین** (التوبہ:122) خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو ''تفقہ فی الدین'' کی دعا دی ہے۔ **اللّٰهم فقهه فی الدین** (صحیح البخاری، حدیث نمبر 140 باب وضع الماء عند الخلاء)، یہی روایت مسند احمد بن حنبل میں اس اضافہ کے ساتھ نقل کی گئی ہے: **وعلمه التأویل** (حدیث نمبر 2274، مسند عبداللہ بن عباس)، جس سے تفسیر اور علوم قرآن میں تخصص کی اہمیت کی طرف اشارہ ملتا ہے، منصب امامت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو زیادہ موزوں قرار دیا جو علوم قرأت سے گہری واقفیت رکھتے ہوں، **یؤمکم أقرأکم**

(سنن ابی داؤد حدیث نمبر 495، باب من أحق بالامامة)۔

اور اسی روایت کو بعض لوگوں نے یوں بھی نقل کیا ہے **فلیؤمهم اعلمهم بالسنة**

☆ استاذ شعبہ حدیث وفقہ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد، مشیر شرعی: منصف سٹلائیٹ T.V

(مستخرج ابی عوانة، حدیث نمبر 1071، بیان ما یستحق به الرجل الامامة، نیز دیکھئے صحیح ابن خزیمہ، حدیث نمبر 1427، باب ذکر احق الناس بالامامة)، ان دونوں روایتوں سے حفظ، علوم قرأت اور سنن واحادیث میں اختصاص کی طرف اشارہ ملتا ہے، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اہل اختصاص کو خود اپنے علم کی روشنی میں رائے قائم کرنے کی بھی تلقین کی ہے، قال أنتم أعلم بأمور دنیاکم (صحیح مسلم، حدیث نمبر 4358، باب وجوب امتثال ما قاله شرعا دون ما ذکره).

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی درسگاہ ودانش گاہ سے تربیت یافتہ افراد ہر دو طرح کے تھے، بعض اصحاب فضل وہ تھے جو بنیادی یا عمومی مرحلہ کی تعلیم پر اکتفا کرتے تھے اور ایسے ہی لوگوں کی کثرت تھی، اور دوسرے وہ صحابہ بھی تھے جو کسی خاص فن کے متخصص شمار کیے جاتے تھے، عمرو بن سلمہؓ فرماتے ہیں کہ میری قوم میں قرآن سب سے زیادہ مجھے یاد تھا و کنت اقرأهم (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 495) باب فی من أحق بالامامة، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: صحابہ میں سب سے زیادہ علوم قرآن سے واقفیت مجھے تھی، والله لقد علم اصحاب النبی صلی اللہ علیه وسلم أنی من أعلمهم بكتاب الله وما انا بخيرهم (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4616، باب القراء من اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم، صحیح مسلم، حدیث نمبر 4502)۔ حضرت ابوہریرہؓ حفظ وروایت حدیث کے لیے، اور حضرت عائشہؓ روایت ودرایت حدیث نیز نقد متون کے لیے، اسی طرح خود حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ خواتین سے متعلق احکام شریعت کے لیے صحابہ میں شہرت اور امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ فہم وتدبر اور سیاست شرعیہ کے لیے تمام صحابہ میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے، سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اصول ومقاصد شرع میں گہرائی وگیرائی رکھتے تھے، اور احکام شریعت کی تطبیق میں پیش پیش رہتے تھے، كان وقافا عند كتاب الله (صحیح البخاری،

حدیث نمبر: 4276) حضرت علی بن ابی طالبؓ امور قضاء کے متخصص شمار کیے جاتے تھے، **وکان أقضاهم علي۔**

اور حضرت زید بن ثابتؓ صحابہ میں علم فرائض ومیراث کے لیے شہرت رکھتے تھے، عہد صحابہ اور اس کے بعد بھی یہ اختصاصی ذوق باقی رہا، بلکہ پروان چڑھتا گیا، محدثین صحابہ مستقل شمار کیے گئے، اور فقہاء اصحاب کی الگ فہرست تیار ہوئی، قراء ومفسرین ان کے علاوہ تھے، اسی طرح سیاست وامور حکومت، نیز جہاد وجنگی امور سے متعلق بھی ماہر افراد ہوا کرتے تھے، جن کی تفصیل طبقات صحابہ اور رجال وسیر کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر میدان ومجال کے لیے ماہر فن اور امتیازی صلاحیت کے حامل افراد تیار کیے تھے اور امت کو یہ درس دیا تھا کہ علوم وفنون کی مختلف شاخوں میں باصلاحیت اور متخصص افراد کار تیار کیے جائیں۔

دینی مدارس میں شعبہائے اختصاص کا قیام

ہندوستان میں مروج دینی مدارس کا نظام کم وبیش ڈیڑھ سو سالہ قدیم ہے، مجموعی طور پر ان مدارس میں دو نصاب نظام تعلیم جاری ہیں؛ نصاب تعلیم کا ایک طرز تصور وہ ہے جو ''درس نظامی'' پر مبنی ہے، دار العلوم دیوبند اور اس سے وابستہ مدرسے اسی طریقہ کار کے متبع ہیں اور دوسرا نظام وہ ہے جو ''ندوۃ العلماء'' کا پیش کردہ ہے، دار العلوم ندوۃ العلماء، اس سے ملحق ادارے، نیز جماعت اسلامی وجماعت اہل حدیث سے وابستہ دینی تعلیمی ادارے بھی۔ جزوی ترمیم کے ساتھ۔ اسی نصاب کے تابع ہیں۔

ان دونوں نظام تعلیم میں طلبہ کی بڑھتی ہوئی ''تعداد'' اور زوال پزیر ''استعداد'' کو پیش نظر رکھتے ہوئے علوم اسلامی کی مختلف شاخوں میں تکمیل واختصاص کے شعبے قائم کیے گئے ہیں، چنانچہ دار العلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کے بعد غالبا سب سے پہلے ''شعبہ تدریب افتاء'' کا قیام عمل میں لایا گیا، اسی طرح تکمیل تفسیر اور تکمیل ادب کے شعبے بھی قائم کیے گئے اور اب ماضی

قریب میں تخصص فی الحدیث کی بھی ابتداء کی گئی ہے، یہاں خاص طور پر شعبہ تخصص فی الحدیث میں علمی موضوعات پر مقالے تحریر کروائے جاتے ہیں، اسی طرح تخریج ودراسہ کا کام بھی طلباء سے لیا جاتا ہے۔

دار العلوم دیو بند ہی کے طرز پر جامعہ مظاہر العلوم سہارنپور میں شعبہائے تخصص کام کررہے ہیں، اور یہاں کا شعبہ حدیث خاص طور پر قابل ذکر ہے اور اپنا خاص مقام رکھتا ہے۔

ظاہر ہے اس مرحلہ تکمیل واختصاص کی تعلیم ہر طالب علم پر ضروری نہیں ہے؛ بلکہ طالب علم کسی فن یا موضوع سے خاص رغبت ودلچسپی کی بنیاد پر ان شعبوں میں داخلہ لیتا ہے اور علمی تشنگی کو دور کرتا ہے، اور یہ بات کسی طرح مناسب بھی نہیں ہوگی کہ طالب علم کی صلاحیت واستعداد کو نظر انداز کرتے ہوئے انہیں شعبہائے اختصاص میں داخلہ دے دیا جائے۔

اسی طرح دار العلوم ندوۃ العلماء کے نصاب تعلیم میں جو کہ مجموعی طور پر ۱۷ر سال پر مشتمل ہے۔ فضیلت کے دو سال تخصص کے طور پر رکھے گئے ہیں، جس میں تفسیر، حدیث، فقہ، دعوۃ اور ادب میں سے کسی بھی مضمون میں تخصص کیا جاسکتا ہے، ملحوظ رہے کہ فضیلت کے اس مرحلہ کو ''دراسات علیاء'' سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، فضیلت کے بعد یک سالہ اور بھی تین کورس المعهد العالی للإفتاء والقضاء، المعهد العالی للدعوة والفكر الاسلامی اور كلية الدعوة والإعلام کے نام سے متعارف کرائے گئے ہیں اور ان سب کی حیثیت شعبہائے اختصاص کی ہے، اور طلباء کو لازمی طور پر کسی موضوع پر مقالہ پیش کرنا ہوتا ہے، یا کسی مخطوطہ تحقیق وتعلیق کا کام کرنا ہوتا ہے۔

تصنیف وتالیف کی تربیت، باصلاحیت افراد کار کی تیاری نیز علوم اسلامی کے مختلف شعبوں میں متخصصین فراہم کرنے کے لیے'' ہندوستان میں ایک اہم اور نمایاں نام المعهد العالی الاسلامی حیدرآباد کا ہے، جس کا نصاب تعلیم حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اپنے تدریسی

تجربہ وعلمی بصیرت، نیز مختلف شعبوں کے متخصص اہل علم کے مشورہ سے تیار کیا ہے، اسی طرح اس کی تدوین میں عالم اسلام کی ممتاز جامعات کے نصاب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ معہد کے شعبہائے اختصاص: حدیث، فقہ، دعوۃ، انگریزی زبان، نیز اقتصاد اسلامی پر مشتمل ہیں، دوسالہ نصاب تعلیم ہے، سال اول میں اختصاصی مضامین پڑھائے جاتے ہیں، اور سال دوم میں ان طلبہ سے ان کے اختصاص کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی موضوع پر مقالہ تحریر کروایا جاتا ہے، یا کسی مخطوطہ کی تحقیق ان کے ذمہ کی جاتی ہے۔

فقہ وقضاء میں اختصاص کے لیے پورے ملک میں ایک باوقار نام المعہد العالی للقضاء والافتاء پٹنہ بہار کا بھی ہے، جس کا نصاب تعلیم مجتہدانہ بصیرت کے حامل فقیہ اور اسلامی نظام قضاء کے شہسوار حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے ترتیب دیا تھا، جو کہ اب بھی جزوی ترمیم کے ساتھ باقی ہے، یہاں بھی دوسالہ کورس ہے، سالِ دوم میں طلبہ لازمی طور پر سندی مقالہ پیش کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ کچھ نئے ادارے ملک کے مختلف حصوں میں کام کررہے ہیں، اور یہ سب مجموعی طور پر اپنی کیفیت ونوعیت کے اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔

شعبہائے اختصاص میں علمی وتحقیقی کام

دینی مدارس کے تعلیمی مراحل پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ”تخصصات“ کا یہ مرحلہ، عالم عربی کی جامعات، یا خود ملک کی عصری جامعات کے مرحلہ ماجستیر (ایم، اے) کے مساوی ہے، نامور عالم دین اور ولولہ انگیز خطیب مولانا سید سلمان حسینی ندوی نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ”اسی دور میں اور خاص طور پر ۸۲،۱۹۸۱ء میں مقالات فضیلت کے معیار کو عالم عربی کے معیار ماجستیر (ایم، اے) کے مقالات کے مساوی

کرنے کی کوشش کی گئی'' (ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو، ۱۸۶)۔

بلاشبہ ''تخصصات'' کا مقصد طالب علم میں کسی فن کے تئیں علمی تبحر، تصنیف وتالیف کی لیاقت، بحث وتحقیق کی صلاحیت، رائے قائم کرنے کی اہلیت اور خود اس فن کے مصادر ومراجع سے گہری واقفیت پیدا کرنا ہوتا ہے، اسی طرح قدیم علمی ورثہ کو نئے رنگ وآہنگ میں پیش کرنے کا سلیقہ اور جدید علمی انکشافات کو پیش کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا ہوتا ہے، اگر تخصصات کے ان مقالوں میں یہ کیفیت نہیں پائی جاتی ہے، تو انہیں علمی وتحقیقی رسائل کا نام نہیں دیا جاسکتا ہے، تصنیف وتالیف کے دائرے میں ان کا شمار تو کیا جاسکتا ہے؛ مگر بحث وتحقیق کے زمرہ میں نہیں۔

ہندوستان میں شعبہائے اختصاص کے تحت جو علمی وتحقیقی کام ہورہا ہے وہ یقیناً قابل قدر ہے، اور اس کی حوصلہ افزائی بھی کی جانی چاہیے کیوں کہ یہ اس تحریک کا آغاز ہے اور ایک نئی طرح کی ابتداء ہے۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مقالوں میں معیار اور ''منہج'' دونوں پر خوب توجہ دی جائے، اور بحث وتحقیق کے جو عصری اور عالمی اصول ہیں ان پر عمل کیا جائے۔

راقم الحروف نے اس مقالہ کی ترتیب کے دوران، ہندوستان کے مختلف اداروں کے شعبہائے تخصص کے تحت ترتیب شدہ مقالات کا جائزہ لیا ہے اور جن اہم علمی ومنہجی غلطیوں پر نگاہ پڑی ہے وہ ذیل میں ذکر کی جارہی ہیں:

(۱) عربی بلکہ خود اردو مقالوں میں بھی زبان وبیان کی غلطیوں کا پایا جانا۔

(۲) احادیث کی تخریج اور مسائل فقہیہ کی توثیق میں اصل مصادر کے بجائے ثانوی مصادر سے استفادہ، اور بسا اوقات غیر متعلق کتابوں پر اعتماد۔

(۳) موضوعیت کا فقدان۔

(۴) علمی وتحقیقی رنگ کا فقدان۔

(۵) خطۃ البحث کے بغیر ہی مقالے تحریر کرنے کا رجحان۔

(۶) محدثین وفقہاء کی بعض خاص مصطلحات کو سمجھے بغیر ہی ان کی تعبیر وتشریح کرنا۔

(۷) عربی عبارتوں کے ترجمہ میں حد درجہ تساہل اور فحش غلطیوں کا ارتکاب۔

(۸) احادیث سے استدلال میں ان کی صحت وضعف کو نظر انداز کیا جانا۔

(۹) غیر علمی وتحقیقی موضوعات کو بحث وتحقیق کا موضوع بنانا۔

(۱۰) موضوع سے متعلق تمام جہتوں کا مقالہ میں شامل نہیں کیا جانا۔

اگر ان باتوں کو بغور دیکھا جائے اور ان کوتاہیوں کا جائزہ لیا جائے، تو بنیادی طور پر ان کے چار اسباب نظر آتے ہیں:

(۱) ہمارے ان اداروں میں عام طور پر مناہج البحث والتحقیق کے موضوع کو نہیں پڑھایا جاتا ہے، جس کی وجہ کر طلبہ سے اس طرح کی غلطیوں کا ارتکاب فطری ہے، راقم الحروف کی سفارش پر المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد میں سال دوم کے طلبہ کے لیے لازمی مضمون کی حیثیت سے، ایک سال قبل اس مادہ کا اضافہ کیا گیا ہے، اور اس کی تدریس بھی مجھ ہی سے وابستہ کی گئی ہے، تجربہ یہ ہے کہ طلباء بڑے ذوق وشوق کے ساتھ اس مضمون کو پڑھتے بھی ہیں اور اس سے مقالہ نویسی میں فائدہ بھی محسوس کرتے ہیں۔

(۲) ایسے علمی نگراں اور مشرفین کی کمی یا فقدان: جو ان مقررہ مضامین کے متخصص ہوں۔ اور اگر کہیں مشرفین موجود بھی ہوتے ہیں تو وہ محض رسمی اشراف انجام دیتے ہیں، مکمل علمی اشراف کا فقدان ہوتا ہے، جب کہ ''علمی رسائل'' دراصل مشترکہ طور پر باحث اور مشرف کے علمی وتحقیقی ذوق کا مظہر اور مشترک محنت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

(۳) ہمارے تعلیمی نظام میں تخصصات سے پہلے عام طور پر علمی موضوعات پر لکھنے کی

مشق نہیں کرائی جاتی ہے، تخصصات میں آکر ہی طالب علم پہلی مرتبہ ان موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے، جس کا راست اثر اس مقالہ کی علمی حیثیت و کیفیت پر پڑتا ہے۔

(۴) اسی طرح بسا اوقات نااہل طلباء کو تخصصات میں داخلہ دینے کی وجہ سے بھی ان مسائل و مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

تجاویز و اقتراحات:

(۱) منہج البحث والتحقیق کو بحیثیت مضمون خصوصی شعبہائے اختصاص میں داخل کیا جائے۔

(۲) متخصص مشرفین کے تحت مقالے لکھوائے جائیں۔

(۳) مشرف کی تدریسی مصروفیات اور علمی انہماک کو ملحوظ رکھتے ہوئے اتنے ہی طلبہ کا اشراف سپرد کیا جائے جن کی واقعی نگرانی ممکن ہو۔

(۴) مشرفین کے لیے "بدل اشراف" مقرر کیا جائے؛ تاکہ دلجمعی اور توجہ کے ساتھ یہ ذمہ داری انجام دی جاسکے۔

(۵) باصلاحیت طلبہ ہی سے مقالے تحریر کروائے جائیں اور جو طلبہ لکھنے پڑھنے میں کمزور ہوں ان سے تخصص کے مقالوں کے بجائے بحث تکمیلی لکھوا کر ڈپلوما وغیرہ کی سند دے دی جائے۔

(۶) موضوعات کے انتخاب سے پہلے مختلف جامعات سے رابطہ کیا جائے، تاکہ کام کا تکرار اور محنت کا ضیاع نہ ہو۔

(۷) مقالوں کا علمی مناقشہ بھی ہونا چاہیے اور اس میں جو مقالے علمی و تحقیقی معیار پر اترتے ہوں، ان کی طباعت کا نظم خود ادارہ کرے، تاکہ طلبہ و باحثین کی حوصلہ افزائی ہو۔

(۸) مخطوطات کی تحقیق کا کام نہایت نازک ہے، اس کے لیے نوتربیت یافتہ طلبہ کے بجائے باصلاحیت اور علمی تجربہ رکھنے والے افراد ہی سے کام لیا جائے۔

هذا وصلى الله على نبينا محمد وبارك وسلم

☆☆☆

ساتواں باب

مدارس کی اسناد اور مقابلہ جاتی امتحانات

یونیورسٹی میں مدارس کی اسناد کا معادلہ

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی☆

ایک زمانہ تھا جب مدارس کے فضلاء اعلیٰ تعلیم کے لیے یونیورسٹیوں کا رخ کرتے تھے تو ان کو از سر نو ہائی اسکول سے لیکر اعلیٰ درجات کی تعلیم اور امتحان کے مراحل سے گزرنا پڑتا تھا، تعلیم کے یہ دونوں دھارے مشرقی اور عصری دو سمتوں میں بہتے اور طلباء کو دونوں دھاروں سے استفادہ کرنے کے لیے وقت اور مصارف خرچ کرنا پڑتا اور مشکلات سے گزرنا پڑتا تھا، مگر وقت کے گزرنے کے ساتھ یونیورسٹیوں نے اپنے ضابطہ تعلیم میں نرمی کی اور عصری تعلیم کا دروازہ روایتی دینی درسگاہوں کے فارغین کے لیے کھولا، اور آج یہ وقت آیا ہے کہ یونیورسٹیوں میں بالخصوص مسلمانوں سے تعلق رکھنے والی یونیورسٹیوں میں ایک معقول تعداد مدارس کے فضلا کی پائی جاتی ہے، بعض یونیورسٹی میں عربی، دینیات اور اسلامیات کے شعبے مدارس کے فضلا سے بھرے ہوئے ہیں بلکہ ان شعبوں کی سربراہی جو اساتذہ کر رہے ہیں ان میں بہت سے فضلاء مدارس ہیں یونیورسٹیوں کی اس پالیسی کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم کے ساتھ سرکاری ملازمتوں کے دروازے بھی مدارس کے فضلا کے لیے کھلے ہیں، غالباً اسی وجہ سے مدارس سے یونیورسٹی کی طرف رخ کرنے والے فضلاء کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے، مدارس کی بڑی تعداد یونیورسٹیوں کو اپنی تعلیمی اسناد کے معادلہ کی درخواست دے رہی ہے اور یونیورسٹیاں اپنی تعلیمی پالیسی، گنجائش اور سہولت کے لحاظ سے ان کو منظوری بھی عطا کر رہی ہیں، ان میں کشمیر یونیورسٹی، کالی کٹ یونیورسٹی،

☆ سابق ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

ہمدرد یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ یونیورسٹیوں میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے زیادہ سے زیادہ مدارس کو منظوری دی ہے اور مدارس کے زیادہ سے زیادہ فضلاء کو تعلیمی، تدریسی اور ملازمت کی مراعات فراہم کی ہیں۔ اب تک تقریباً پچاس مدارس کی اسناد کو یونیورسٹی نے منظوری دی ہے اور اتنی ہی تعداد میں معادلہ کی درخواستیں مدارس کی طرف سے یونیورسٹی کو موصول ہوئی ہیں جو زیر غور ہیں۔ تدریسی اور غیر تدریسی ملازمین میں ایک بڑی تعداد مدارس کے فضلاء کی موجود ہے۔ اب سے کوئی ۳۵ سال پہلے یعنی ۱۹۷۷ء میں جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو درخواست دی کہ اس کی عالمیت اور فضیلت کی ڈگری کو یونیورسٹی کے مختلف کورسوں میں داخلہ کے لیے منظوری عطا کی جائے، درخواست کے ساتھ مدرسہ کا نصاب تعلیم اور ضروری معلومات بھی ارسال کی گئی تھیں۔ یونیورسٹی نے اس درخواست کو اپنی اعلی تعلیمی باڈی اکیڈمک کونسل کے سامنے پیش کیا، اکیڈمک کونسل نے جامعۃ الفلاح کے نصاب ونظام تعلیم معیار تعلیم اور طریقہ امتحانات وغیرہ کو سامنے رکھ کر حسب ذیل فیصلہ صادر کیا۔

''جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ کے امتحان عالمیت کو پری یونیورسٹی (انٹر میڈیٹ) کے مساوی تسلیم کرتے ہوئے بی اے آنرس فرسٹ سمسٹر میں داخلہ دیا جائے۔ سوائے انگلش مضمون خاص کے۔ اس ڈگری کے حامل امیدواروں کو بی یو ایم ایس کے داخلہ امتحان میں بھی بیٹھنے کی اجازت دی جائے''۔

غالباً مدارس کے ذمہ داروں کی طرف سے یہ پہلی درخواست تھی جو اے ایم یو کو موصول ہوئی اور یونیورسٹی نے کشادگی اور ہمدردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو منظوری عطا کی، اس کے بعد یونیورسٹی میں مدارس کی اسناد کے معادلہ کا دروازہ کھل گیا۔ دوسری درخواست اعظم گڑھ ہی سے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی موصول ہوئی اور یونیورسٹی نے اس مدرسہ کی فضیلت کی سند کو پری یونیورسٹی (انٹر) کے مساوی تسلیم کرتے ہوئے بی اے میں داخلہ کا مجاز قرار دیا۔ چونکہ یہ مدرسہ

عالمیت کی سند نہیں دیتا تھا اس لیے اس کی فضیلت کی سند کو بی اے میں داخلہ کے لیے منظور کیا گیا۔

دارالعلوم دیوبند، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، دارالعلوم ندوۃ العلماء جیسے مرکزی اداروں نے معادلہ کی درخواست نہیں دی، لیکن ۸۱-۸۲ء میں جب مدارس کی اسناد پر معادلہ کے لئے غور ہوا تو اس وقت کے وائس چانسلر جناب سید حامد نے ان مدارس کی فضیلت کی سند کو بھی ایم اے عربی اور ایم ٹی ایچ، دپری طب کے لیے منظوری دی اور یہ کہا کہ یہ معروف مدارس ہیں ان کی دینی خدمات اور تعلیمی معیار سے لوگ واقف ہیں لہٰذا ان کو درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے بشرطیکہ وہ فضلاء انگلش کا امتحان ساتھ ہی پاس کریں۔ سید صاحب نے مدارس کی اسناد کو منظور کرنے کے لیے فراخدلانہ پالیسی اپنائی، ان کا کہنا تھا کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے یونیورسٹی میں فضلائے مدارس کے لئے دروازہ کھولنا نہ صرف ان فضلاء کے لیے مفید ہوگا بلکہ یونیورسٹی کا عمومی ماحول بھی بہتر ہوگا کیونکہ یہ حضرات ریاضت اور محنت کے عادی ہوتے ہیں اور اچھی تربیت وسیرت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے وائس چانسلر موصوف نے ایک معادلہ کمیٹی بھی تشکیل دی۔

اسی تعلیمی پالیسی کے تحت راقم نے ۱۹۸۴ء میں یونیورسٹی کے شعبہ سنی دینیات سے ایم ٹی ایچ کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا، پھر پی ایچ ڈی میں داخلہ ملا اور پھر اسی شعبہ میں ملازمت دی گئی۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مدارس نے اپنی اسناد یونیورسٹی کو معادلہ اور منظوری کے لیے ارسال کرنی شروع کردیں۔ ان کی درخواستیں معادلہ کمیٹی کے سپرد کردی جاتیں جو ان کے نصاب تعلیم، میعاد تعلیم اور طریقہ امتحان وغیرہ پر غور کر کے اپنی سفارش وائس چانسلر صاحب کو پیش کرتی۔

۶ر فروری ۱۹۸۵ء میں معادلہ کمیٹی کی باضابطہ میٹنگ منعقد ہوئی جس کی صدارت خود وائس چانسلر صاحب نے فرمائی۔ معادلہ کمیٹی کی اس میٹنگ میں یونیورسٹی کے علوم شرقیہ کے شعبوں کے صدور کے علاوہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو سے مولانا محمد رابع ندوی، اعظم گڑھ سے مولانا ابو

الحسن فاروقی، مولانا مظفر احسن اصلاحی، اور مولانا عبد الحسیب اصلاحی نے شرکت فرمائی۔ یہ حضرات مدعوئے خصوصی کے طور پر بلائے گئے تھے۔

اس کمیٹی نے مدارس کے نظام ونصاب، میعاد اور طریقہ امتحان وغیرہ کو سامنے رکھ کر ان کورسوں کا تعین کیا جن میں ان مدارس کے فضلاء کو داخلہ دیا جا سکتا تھا۔ نیز ان کی اسناد کا درجہ بھی متعین کیا گیا، کمیٹی نے حسب ذیل سفارشات پیش کیں۔

۱-مدرسۃ الاصلاح کی سند فضیلت کو پری یونیورسٹی کے مساوی تسلیم کر کے بی اے میں داخلہ کی جو اجازت دی گئی تھی، اسے منسوخ کیا جاتا ہے، اب یہ سند بی اے کے مساوی تسلیم کی جائے گی اور ایم اے میں داخلہ دیا جائے گا۔

۲-فضیلت کی جملہ اسناد کو بی اے کے مساوی تسلیم کر کے ان کے حاملین کو ایم اے عربی اور ایم ٹی ایچ، میں داخلہ دیا جائے گا۔

۳-فضیلت کی سند کے حاملین کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ ایم اے یا ایم ٹی ایچ کے ساتھ سینئر سکنڈری سطح کا صرف انگلش کا امتحان پاس کریں۔

۴-معادلہ کے لیے مدارس سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور کرنے کے لیے وائس چانسلر صاحب کو اختیار دیا گیا کہ وہ ممتاز علماء کرام، شعبہ عربی وشعبہ دینیات اور پروفیسر محمد تقی امینی پر مشتمل ذیلی کمیٹی بنا دیں جو ان مدارس کی اسناد اور تعلیمی نظام کو دیکھ کر ان کورسوں کی نشاندہی کریں جن میں ان کو داخلہ دیا جا سکتا ہے۔

واضح رہے کہ یونیورسٹی کے اندر دو درجن سے زائد مساجد میں امام اور مؤذن کی تقرری کے لیے مدارس کی فضیلت کی اسناد کو منظوری پہلے سے حاصل تھی، نئے ضابطہ سے یہ خطرہ ہوا کہ اب یہ اسناد امامت کی ملازمت کے لیے غیر مقبول ہو جائے گی، اس لیے وائس چانسلر صاحب نے وضاحت کی کہ اس ضابطہ کا امامت وغیرہ کی ملازمت پر اثر نہیں ہوگا۔

یونیورسٹی اکیڈمک کونسل نے مدارس کے نصاب وامتحان وغیرہ کا جائزہ لیکر یونیورسٹی کے مختلف کورسوں میں داخلہ کے لیے جو ذیلی کمیٹی بنائی، اس کی میٹنگ ۱۴/اکتوبر ۱۹۸۸ء کو ہوئی اور حسب ذیل سفارشات کی گئیں۔

مختلف مدارس کی درخواستوں پر یونیورسٹی کے مختلف کورسوں میں داخلہ دینے کے لیے غور وخوض کیا گیا، اور طے کیا گیا کہ مدارس کی عالمیت کی سند کو سینئر سکنڈری کے مساوی تسلیم کر کے بی اے میں داخلہ دیا جائے بشرطیکہ عالمیت کا کورس کم از کم بارہ سالوں پر مشتمل ہو۔

مدارس کی فضیلت کی سند کو بی اے کے مساوی تسلیم کر کے ایم اے عربی اور ایم ٹی ایچ میں داخلہ دیا جائے بشرطیکہ داخلہ لینے والے طلبا کے ساتھ ہی صرف انگلش کا امتحان سینئر سکنڈری سطح کا پاس کر لیں۔ عالمیت کا انٹر کے مساوی ہونا اور فضیلت کا بی اے کے مساوی ہونا متفقہ اصول بن گیا۔ جن مدارس کی فضیلت کی سند کو ایم اے اور ایم ٹی ایچ کے لیے منظوری دی گئی وہ حسب ذیل ہیں:

۱- جامعہ سلفیہ بنارس

۲- دارالعلوم تاج المساجد بھوپال

۳- دارالعلوم دیوبند

۴- مدرسہ عالیہ کلکتہ

اس کے بعد مدارس کی درخواستیں موصول ہوتی رہیں اور ضابطہ کی کارروائی کے بعد ان کو منظوری دی جاتی رہی۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر قاضی مجاہد الاسلام علیہ الرحمہ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر تھے ایک مرتبہ علی گڑھ تشریف لائے اور راقم کو بلایا اور فرمایا کہ مدارس سے فارغ ہونے والے بعض طلبا بہت ذہین ہوتے ہیں اور بحث وتحقیق کا ذوق رکھتے ہیں۔ بعض تصنیف وتالیف

بھی کرتے ہیں، ان کی صلاحیت کے پیش نظر یونیورسٹی میں ان کو پی ایچ ڈی میں داخلہ ملنا چاہئے۔ راقم نے عرض کیا کہ یونیورسٹی کے ضابطہ کے مطابق ایک ہی سند ادنی اور اعلیٰ دونوں کورس کے لیے منظور نہیں کی جاسکتی۔ فضیلت کی سند کو یونیورسٹی نے بی اے کے مساوی تسلیم کر کے ایم اے میں داخلہ کا مجاز قرار دیا ہے۔ لہٰذا پی ایچ ڈی میں فضیلت کی سند پر داخلہ دینا خلاف ضابطہ ہوگا۔ راقم نے مزید عرض کیا کہ ایک شکل ہوسکتی ہے کہ جو طلباء فضیلت کے بعد تخصص کر کے آئیں ان کو مدارس فضیلت اور تخصص کی سند عطا کرے اور یونیورسٹی تخصص کی سند کو ایم اے کے مساوی تسلیم کر کے ایم فل میں داخلہ کے لیے منظور کرے۔ ایم فل، پی ایچ ڈی کی پہلی منزل ہوتی ہے، کہیں دونوں میں ایک ساتھ داخلہ ہوتا ہے اور کہیں پہلے ایم فل میں اور اس کی تکمیل کے بعد پی ایچ ڈی میں داخلہ دیا جاتا ہے۔ قاضی صاحب کو یہ تجویز پسند آئی مگر اہل مدارس کی طرف سے کوئی پہل نہ ہوئی اس لیے بات آگے نہ بڑھ سکی۔

۲۰۰۶ء میں شعبہ سنی دینیات میں مدارس اسلامیہ اور عصری تقاضے کے عنوان سے ایک قومی سمینار منعقد کیا گیا۔ جس میں مختلف مکاتب فکر کے اہل مدارس نے شرکت فرمائی۔ بالخصوص مولانا سعید الرحمان اعظمی (مہتمم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)، مولانا سید سلمان حسینی ندوی، مولانا عبد اللہ مغیثی اجرارہ، مولانا لقمان سلفی (جامعہ ابن تیمیہ، چمپارن، حال مقیم ریاض)، مولانا پروفیسر اجتبا ندوی، راقم اس سمینار کا داعی اور منتظم تھا۔

راقم نے اس کانفرنس میں جہاں اہل مدارس کو اپنے نصاب ونظام تعلیم پر نظر ثانی کرنے اور عصری چیلنج کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی وہاں یونیورسٹی انتظامیہ کو متوجہ کیا کہ وہ دینیات کی اسناد کو بی ایڈ، بی لیب اور دیگر پیشہ ورانہ کورسوں میں داخلہ کے لیے منظوری دے۔ کیونکہ آج کل مسلم اسکولوں میں دینیات پڑھانے کے لیے ٹرینڈ ٹیچر نہیں ملتے، اسی طرح لائبریریوں، عربی وفارسی کتابوں اور مخطوطات کی نگہداشت کے لیے، عربی وفارسی کے لیب نہیں ملتے۔ دینیات کے فضلاء

اس کمی کو دور کر سکتے ہیں مگر ان کو بی ایڈ اور بی لب کرنے کی اجازت نہیں۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ ۲۰۰۸ء میں راقم کی تجویز منظوری سے ہم کنار ہوئی اور اب دینیات کی ڈگری کے حامل طلبا کو نہ صرف بی ایڈ اور بی لیب میں داخلہ لینے کی اجازت ہے بلکہ وہ ایم بی اے بھی کر سکتے ہیں۔

یونیورسٹی نے مذکورہ مطالبات کو سامنے رکھ کر جامع اور مربوط لائحہ عمل بنانے پر غور کیا ۲۵ر اپریل ۲۰۰۶ء میں وائس چانسلر صاحب جناب نسیم احمد صاحب نے راقم کو بلایا اور مدارس کی فائل حوالہ کر کے اپنی سفارشات ارسال کرنے کا حکم دیا۔

راقم نے ۲۶ر اپریل ۲۰۰۶ء کو ایک بارہ نکاتی رپورٹ وائس چانسلر صاحب کے سپرد کی۔ مگر چونکہ نسیم صاحب یونیورسٹی کے حالات سے بددل ہو کر قبل از وقت واپس چلے گئے اس لئے ان تجاویز پر جزوی عمل ہوا کلی عمل نہیں ہوا۔

جناب نسیم صاحب کے زمانہ میں مدارس ایسے تھے جن کو رجسٹرار نے بغیر معادلہ کمیٹی کے سامنے پیش کیے ان کے معائنہ کے منظوری دلا دی تھی۔ وائس چانسلر صاحب نے صدر شعبہ سنی دینیات یعنی راقم اور صدر شعبہ شیعہ دینیات پروفیسر فرمان حسین اور شعبہ عربی کے پروفیسر صلاح الدین عمری اور پروفیسر کفیل احمد قاسمی کی کمیٹی بنائی کہ وہ ان مدارس کا معائنہ کر کے اپنی رپورٹ پیش کریں چنانچہ اس کمیٹی نے ۲۰۰۸ء میں ان مدارس کا دورہ کیا اور اپنی معائنہ رپورٹ پیش کی۔

اس رپورٹ کی روشنی میں وائس چانسلر صاحب نے جنوری ۲۰۱۰ء میں معادلہ کمیٹی کی ایک ذیلی کمیٹی ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی یعنی راقم الحروف کی سربراہی میں تشکیل دی۔ اس کمیٹی میں حسب ذیل افراد تھے:

۱- ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنس

۲- ڈین فیکلٹی آف آرٹس

۳-صدر شعبہ سنی دینیات

۴-صدر شعبہ شیعہ دینیات

۵-صدر شعبہ عربی

۶-صدر شعبہ فارسی

۷-صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز

اس کمیٹی نے جو تجاویز مرتب کیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱-انہی مدارس کی اسناد کو منظوری دی جائے جو عالم یا فاضل کی ڈگری دیتے ہیں۔

۲-صرف مرکزی مدارس کو منظوری دی جائے ان کی شاخوں کو نہیں۔

۳-مدارس کی درخواست برائے معادلہ متعلقہ شعبوں کو بھیجی جائے اور ان کے بورڈ آف اسٹڈیز کی سفارش کے بعد ہی منظوری دی جائے۔

۴-بورڈ آف اسٹڈیز کی منظوری کے بعد ماہرین کو روانہ کی جائے جو موقع پر پہونچ کر اپنی رپورٹ دیں۔

۵-مذکورہ ماہرین کمیٹی میں ایک شخص لازماً اس مضمون کا ہو جس کے لیے درخواست دی گئی ہے۔

۶-اگر مدرسہ لڑکیوں کی تعلیم کا ہے تو ایک خاتون استاذ کو بھی معائنہ کے لیے بھیجنا چاہیے۔

۷-معائنہ کمیٹی درخواست گزار مدرسہ کی وزٹ کے بعد اپنی رپورٹ رجسٹرار کو تفویض کرے۔

۸-معائنہ کمیٹی کی رپورٹ کو معادلہ کمیٹی فائنل منظوری دے۔

۹-وائس چانسلر اس رپورٹ کو اکیڈمک کاؤنسل کی طرف سے منظوری دے سکتے ہیں۔

۱۰-معائنہ کمیٹی کے اخراجات سفر درخواست گزار مدرسہ برداشت کرے۔

۱۱- ہر پانچ سال کے بعد معادلہ کمیٹی منظور شدہ مدارس کے تعلیمی احوال پر غور کر کے فیصلہ کرے۔

۱۲- جن مدارس میں انگلش نہیں پڑھائی جاتی ہے وہاں کے طلباء کے لئے انگلش کا برج کورس بنایا جائے۔

۱۳- مدارس کی فائلوں کو ہر وقت دیکھنے کے لئے رجسٹرار آفس میں ایک علیحدہ ٹیبل اور ذمہ دار ہونا چاہئے۔

۱۴- مستقبل میں مدارس کو منظوری دینے کے لئے کمیٹی نے ایسے سو نمائندہ مدارس کی فہرست مرتب کی اور وائس چانسلر کو پیش کی۔

یونیورسٹی وقتاً فوقتاً یہ کوشش کرتی رہتی ہے کہ وہ اپنا فیض مدارس کے احاطوں تک پہونچائے، اس کے لیے وہ مدارس کی اسناد پر غور کرنے کے ساتھ ان کے فضلاء کے لیے مفید کورسوں میں داخلہ کی سہولت فراہم کرنے کے طریقہ ڈھونڈتی ہے۔ اگر ذمہ داران مدارس کا کوئی نمائندہ اجلاس ہو اور یونیورسٹیوں، سربراہان کی بھی شرکت ہو تو مدارس کے فضلاء کے لیے بہتر اور مربوط تعلیمی لائحہ عمل مرتب کیا جاسکتا ہے۔

معادلہ کے بعض مسائل

مدارس میں نہ معیار امتحان میں یکسانیت ہے اور نہ نمبر دینے میں یکسانیت ہے۔ اس کے نتیجہ میں جن مدارس کا یونیورسٹی سے معادلہ ہوا ہے ان کے فارغین کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان کے بیشتر مدارس سالانہ امتحان کے نمبرات فی صد میں دیتے ہیں اور اس وقت دنیا بھر میں تعلیمی اداروں کا تسلیم شدہ معیار ہے یہاں اول نمبر ۶۰ فی صد ہے اور ۳۳ فی صد سے کم میں فیل ہے۔ مگر دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور آج بھی پچاس میں نمبر دیتے ہیں۔ جب یہاں کے فارغین یونیورسٹی میں آتے ہیں تو اپنی مارک شیٹ کو یونیورسٹی

کے معیار سے ہمکنار کرنے کے لیے نمبرات کو دوگنا کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے ان مدارس کے تھرڈ ڈویزن کے طلبا بھی دوسرے مدارس کے فرسٹ ڈویژن کے مساوی ہو جاتے ہیں۔ ماضی میں اس پر دیگر مدارس کے فضلاء نے اعتراض کیا تو یونیورسٹی نے شعبہ فزکس کے پروفیسر اسرار احمد مرحوم کی سربراہی میں ایک کمیٹی بنادی جو دارالعلوم دیوبند کے عطا کردہ نمبرات میں تناسب پیدا کرنے کا فارمولہ تیار کرے، کمیٹی کے اس فارمولہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ دارالعلوم کے فضلاء کے نمبر کم ہو گئے اور داخلہ میں ان کی تعداد کم ہو گئی۔

راقم الحروف، پروفیسر کفیل احمد قاسمی اور پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے دارالعلوم کے مہتمم مولانا مرغوب الرحمان صاحب کو صورت حال سے مطلع کیا اور سو میں نمبر دینے کی گزارش کی۔ بلکہ اس مقصد کے لیے راقم نے دارالعلوم دیوبند کا سفر کر کے مہتمم اور نائب دونوں بزرگوں کو صورت حال بتائی، ان حضرات نے اگلی مجلس شوریٰ میں اس مسئلہ کو حل کرنے کا وعدہ فرمایا۔ مگر آج تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوا۔

دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ بہت سے مدارس فیاضی سے نمبر دیتے ہیں اور بہت سے معتدل رویہ اختیار کرتے ہیں بلکہ بعض مدارس کا تعلیمی نظام اتنا ناقص ہے کہ کچھ نااہل لوگ وہاں کی ڈگریاں حاصل کر کے یونیورسٹی میں داخلہ لینے آجاتے ہیں اور ناقص کارکردگی کے باعث جب ناکام ہوتے ہیں تو سفارشات وغیرہ کی تلاش میں رہتے ہیں اور ماحول خراب کرتے ہیں۔ چنانچہ اب یونیورسٹی نے ماسٹر ڈگری کورس میں داخلہ امتحان رکھ دیا ہے جس سے مذکورہ مسائل پر کسی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ روایتی دینی مدارس میں سماجی علوم، جغرافیہ، ریاضی اور انگریزی وغیرہ نہیں پڑھائے جاتے اس لیے یہاں کے فضلاء یونیورسٹی کے وسیع تعلیمی نظام میں بہتر کارکردگی نہیں کر پاتے اور صرف عربی یا دینیات تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں اس لیے اب یہ فکر

عام ہو رہی ہے کہ مدارس کے فضلا کو ایم اے میں داخلہ دینے کے بجائے بی اے میں داخلہ دیا جائے جہاں وہ چھ مضامین پڑھ کر اپنے لیے ایم اے میں بہتر میدان کا انتخاب کر سکیں اور ان کی تعلیمی لیاقت بھی دوسرے طلباء کے مساوی ہو جائے۔ اور معلومات کا دائرہ بھی وسیع ہو جائے۔ چنانچہ گزشتہ دنوں علی گڑھ میں پروفیسر محسن عثمانی ندوی، ڈین فیکلٹی آف لنگویجز حیدر آباد، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس مسلم یونیورسٹی، پروفیسر کفیل احمد قاسمی سابق صدر شعبہ عربی اے ایم ایو اور راقم کی غیر رسمی نشست ہوئی اور ان سب کا متفقہ خیال تھا کہ مدارس کے فضلاء کے لیے وسیع تعلیمی امکانات کی فراہمی کے لحاظ سے اور ان کی ذہنی وسعت کے لحاظ سے یہی مناسب ہے کہ ان کو ایم اے کے بجائے بی اے میں داخلہ دیا جائے۔

جن مدارس میں انگریزی بالکل نہیں پڑھائی جاتی ان کے فارغین کے لیے راقم نے یونیورسٹی کے سامنے یہ تجویز رکھی ہے کہ ان کے لیے انگلش کا ایک برج کورس بنایا جائے جو چھ ماہ کی میعاد پر مشتمل ہو۔ اس کا امتحان میں علی گڑھ میں لینے کے ساتھ، یونیورسٹی نے فاصلاتی تعلیم کے مراکز مشہور دینی درسگاہوں میں یا ان کے آس پاس بنایا جائے اور وہاں اس امتحان کی سہولت فراہم کی جائے۔ صرف یونیورسٹی میں داخلہ لینا مدارس کے طلباء کے لیے مفید نہ ہوگا جب تک کہ ان کو وسیع اور مربوط تعلیم نہ دی جائے اور ان میں اتنی صلاحیت نہ پیدا کی جائے کہ وہ پیشہ ورانہ تعلیم کو حاصل کرنے کے اہل ہو جائیں۔ ایک اور اہم مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے زیر انتظام جو اسکول کھل رہے ہیں ان میں دینیات پڑھانے کا عام رجحان ہے مگر ان اسکولوں کو دینیات کے ٹرینڈ ٹیچرس نہیں ملتے۔ مدارس کے جو فضلاء دینیات کی تعلیم دیتے ہیں وہ بی ایڈ نہ ہونے کی وجہ سے نہ تو مؤثر تعلیم کو یقینی بنا پاتے ہیں اور نہ ان کو بہتر گریڈ ملتا ہے۔ اگر یونیورسٹی اردو میں بی ایڈ کا نصاب تیار کر کے مدارس کے فضلاء کو علی گڑھ میں یا فاصلاتی تعلیم کے لیے ان کے قریبی مراکز میں استفادہ کا موقع دے تو اسکولوں کی ضرورت بھی پوری ہو سکتی ہے اور مدارس کے

فضلاء کی ایک تعداد اسکولوں میں کھپ سکتی ہے، اور بہتر تدریسی کارکردگی کا مظاہرہ کرسکتی ہے۔

اسی طرح ایک اور اہم مسئلہ شعبہ قانون میں ایل ایل بی کے لیے پانچ سالہ انٹگریٹڈ کورس جاری ہے جس میں سینئر سکنڈری اسکولوں کے بعد داخلہ دیا جاتا ہے، اگر مدارس کے ان فارغین کو جو عالمیت کی سند کے حامل ہیں داخلہ دیا جائے تو نہ صرف ان طلباء کو نیا تعلیمی افق فراہم ہوگا بلکہ عدالتوں میں جج صاحبان اسلامی قوانین سے ناواقفیت کی بناپر جو خلاف شرع فیصلے صادر کرتے ہیں ان کو صحیح اسلامی موقف سے واقف کرانے کے لیے مدارس کا پس منظر رکھنے والے یہ ایل ایل بی کے سند یافتہ طلبا مؤثر رول ادا کرسکیں گے، راقم نے مسلم یونیورسٹی کے صدر شعبہ قانون کو اس طرف متوجہ کیا ہے ضرورت ہے کہ یونیورسٹی اس سلسلہ میں مثبت اقدام کرے۔

☆☆☆

مدارس کے فارغین اور مقابلہ جاتی امتحانات

مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی ☆

ہندوستان میں مدرسہ ایجوکیشن سسٹم بہت مقبول ہے۔ مسلم سماج کا ایک بڑا طبقہ مدارس سے منسلک ہے۔ ان کے بچے/بچیاں مدارس میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور مدارس میں تعلیم دلانا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک ہندوستان میں مدارس کا جال بچھا ہوا ہے۔ ان میں تعلیم حاصل کرنے والے اور فارغین کی تعداد بھی بہت ہے۔ جب ہم ملک ہندوستان کا جائزہ لیتے ہیں تو دو طرح کے مدارس سامنے آتے ہیں۔

(۱) مدارس نظامیہ، (۲) مدارس ملحقہ

۱- مدارس نظامیہ ایسے مدارس ہیں جن میں درس نظامی کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ حکومت سے امداد نہیں لیتے ہیں۔ یہ آزاد مدارس ہیں۔ ان کا نصاب تعلیم درس نظامی کے مطابق ہے۔ اس میں صرف دینی تعلیم کا انتظام ہے۔ ان میں سے کچھ مدارس میں دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ اکثر مدارس میں عصری مضامین کی تعلیم کے لئے انتظام نہیں ہے۔ ان مدارس کا نصاب تعلیم حکومت سے منظور نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی سرٹیفکٹ/ڈگری کو حکومت سے ملازمت اور عصری تعلیمی اداروں میں داخلہ کے لئے منظوری حاصل نہیں ہے۔ ویسے ان مدارس کے طلبہ اچھی صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں۔ ان مدارس کے اسناد کو حکومت کے ذریعہ منظور نہ ہونے کی وجہ سے ان مدارس سے طلبہ وفارغین کسی مقابلہ جاتی امتحان میں

☆ پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ

شریک ہونے کے اہل نہیں ہیں۔

۲- مدارس ملحقہ وہ مدارس ہیں جو کسی سرکاری بورڈ سے منظور وملحق ہیں۔ ان میں حکومت کے ذریعہ منظور نصاب تعلیم کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے۔ ان میں دینی تعلیم کے ساتھ عصری مضامین کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ جیسے بہار مدرسہ بورڈ، اڑیسہ مدرسہ بورڈ، بنگال مدرسہ بورڈ، الہ آباد بورڈ، بھوپال بورڈ وغیرہ۔ ان کی سند کو حکومت کے ذریعہ منظوری حاصل ہے۔ اس کی وجہ سے ان مدارس کے فارغین طلبہ/طالبات مقابلہ جاتی امتحانات میں شرکت کر سکتے ہیں۔ لیکن نہایت ہی افسوس کی بات ہے کہ ان میں تعلیم کا معیار بہت ہی کمزور ہے۔ جس کی وجہ سے بورڈ کے مدارس کے فارغین اپنی سند پر مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ نہیں لے پاتے ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں مدارس کے فارغین ہمارے سامنے ہیں۔ نظامیہ مدارس کے فارغین صاحب صلاحیت ہوتے ہیں۔ اگر ان کی تربیت کی جائے اور کوچنگ وغیرہ کے ذریعہ عصری مضامین کی تعلیم کو مضبوط کر دیا جائے تو مقابلہ جاتی امتحانات کو نکال لیں گے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ ان کی سند وڈگری ہی اس قابل نہیں کہ یہ کسی مقابلہ جاتی امتحان میں حصہ لے سکیں۔ جب کہ بورڈ سے ملحق مدارس کی سند اس قابل ہے کہ وہ مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لے سکیں لیکن یہ اس مقام پر پیچھے رہ جاتے ہیں کہ ان کے اندر پختہ صلاحیت نہیں ہوتی ہے کہ یہ مقابلہ جاتی امتحان کو نکال سکیں۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ نظامیہ مدارس کے فارغین کی سند پر اور بورڈ سے ملحق مدارس کے فارغین کی صلاحیت پر بحث وگفتگو کی ضرورت ہے۔

مدارس نظامیہ کی سند کو مساوات کا درجہ حاصل نہیں ہے۔ اس لئے ان مدارس کے فارغین مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لینے کے اہل نہیں ہیں۔ لیکن یہاں اس حقیقت کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے کہ مدارس نظامیہ کے اکثر فارغین کسی بورڈ سے امتحانات میں شریک ہوکر سرٹیفکٹ وسند حاصل کر چکے ہیں۔ یا پھر وہ کسی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر کے ڈگری حاصل

کر چکے ہیں۔اس طرح مدارس نظامیہ کے اکثر فارغین مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لینے کے اہل ہیں۔چونکہ بورڈ کی سند کو مساوات کا درجہ حاصل ہے۔بقیہ ایسے فارغین جنہوں نے بورڈ سے امتحانات پاس نہیں کیے ہیں، وہ بھی کسی بورڈ یا نیشنل اوپین اسکول ایجوکیشن سسٹم سے امتحانات دے کر سند حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے چند سال مزید درکار ہوں گے۔ اسناد کی Equivalency (مساوات) اور معادلہ پر اہل مدارس کو غور وخوض کی سخت ضرورت ہے۔

مدارس ملحقہ کے فارغین کی سرٹیفکٹ کو مساوات کا درجہ حاصل ہے۔اس لئے وہ کسی بھی مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لے سکتے ہیں۔البتہ اس کے لئے انہیں تعلیم میں پختگی کی ضرورت ہے،تو وقت مدارس نظامیہ کے فارغین کے لئے بھی ہے اور مدارس ملحقہ کے فارغین کے لئے بھی۔

مقابلہ جاتی امتحانات سخت ہوتے ہیں۔ان کے مضامین مدارس کے مضامین سے الگ اور وسیع ہوتے ہیں۔ مقابلہ جاتی امتحانات میں کامیاب ہونے کے لئے کالج ویونیورسٹی کے فارغین کو بھی ۱۸ گھنٹہ پڑھنا پڑتا ہے۔تب وہ اس طرح کے امتحانات میں کامیاب ہو پاتے ہیں۔چونکہ اس طرح کے امتحانات میں لاکھوں طلبہ شریک ہوتے ہیں اور ان میں کامیاب ہونا پڑتا ہے۔اس لئے مقابلہ جاتی امتحانات میں کامیابی کے لئے طلبہ کو سخت محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔اس سے یہ سمجھ لینا غلط ہے کہ مدارس کے فارغین اس امتحان کو نہیں نکال سکیں گے۔ مجھے تو مدارس کے فارغین کی محنت کا پورا اندازہ ہے،اس لئے توقع ہے کہ مدارس کے فارغین مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لیں گے تو زیادہ اچھا کر دکھائیں گے۔

مقابلہ جاتی امتحانات میں B.P.S.C (بہار پبلک سروس کمیشن) کا نصاب تعلیم میرے سامنے ہے۔ اس امتحان میں کامیابی کے بعد صوبہ بہار میں District Education Excise Inspector, S.D.O, D.S.P, Officer, Registrar وغیرہ درجہ کے آفیسر بنتے ہیں۔ B.P.S.C کے امتحانات دو مرحلہ میں ہوتے ہیں۔ایک P.T (پرائمری ٹسٹ) اور دوسرا

Mains (فائنل امتحان) کہلاتا ہے۔

P.T (پرائمری ٹسٹ) میں صرف ایک پرچہ ہوتا ہے۔ اس میں دو طرح کے مضامین ہوتے ہیں۔ ایک .G.K جنرل نالج (معلومات عامہ) جبکہ دوسرا G.S جنرل اسٹڈیز (مطالعہ عامہ) ہے۔ دونوں ملا کر ۱۵۰ سوالات ہوتے ہیں۔ یہ سوالات Objective (معروضی) ہوتے ہیں اور ۱۵۰ نمبرات کے ہوتے ہیں، یہ امتحان دو گھنٹہ کا ہوتا ہے۔ یہ امتحان سب کے لئے لازمی ہے۔ جو اس امتحان میں پاس ہوگا وہی Mains (فائنل) امتحان میں شریک ہونے کا اہل ہوگا۔ P.T میں تاریخ، جغرافیہ، جنرل نالج، حساب، سائنس وغیرہ مضامین کے سوالات پوچھے جاتے ہیں۔

Mains (فائنل امتحان) میں کل ۶ پرچے ہوتے ہیں۔ جو ۱۲۰۰ نمبرات پر مشتمل ہوتے ہیں۔

(الف) لازمی پرچہ (Compulsory Paper)، دو پرچے (2 papers)، G.S (جنرل اسٹڈیز) سے۔

(۱) G.S (جنرل اسٹڈیز) ۱...... ۲۰۰ نمبرات

(۲) G.S (جنرل اسٹڈیز) ۲...... ۲۰۰ نمبرات

ان میں تمام سبجیکٹ مثلاً تاریخ، جغرافیہ، حساب، سائنس، سوشل سائنس وغیرہ سے مشترکہ طور پر سوالات پوچھے جاتے ہیں۔

(ب) اختیاری پرچہ (Optional paper) دو پرچے لنگویج و لٹریچر سے

(۱) اختیاری ۱...... ۲۰۰ نمبرات

(۲) اختیاری ۲...... ۲۰۰ نمبرات

مدارس کے فارغین اردو، فارسی، عربی میں سے کوئی ایک زبان لے سکتے ہیں۔

(ج) اختیاری مضمون (Optional Paper) دو پرچے...... تاریخ، جغرافیہ، معاشیات، اقتصادیات وغیرہ میں سے کسی ایک سے۔

(۱) اختیاری ۱...... ۲۰۰ نمبرات

(۲) اختیاری ۲...... ۲۰۰ نمبرات

اس طرح کل ۶ پرچے ہوئے۔ اور ہر ایک ۲۰۰ نمبرات کے، اس طرح مجموعی نمبرات ۱۲۰۰ ہوئے۔ یہ ایک نمونہ ہے۔ اسی سے ملتا جلتا امتحان ہر صوبہ میں ہوتا ہے۔

مقابلہ جاتی امتحان U.P.S.C (Union Public Service Commission) کا خاکہ حسب ذیل ہے۔

یہ مقابلہ جاتی امتحان دو مرحلہ میں لیا جاتا ہے۔ پہلا P.T (پرائمری ٹسٹ) اور دوسرا Mains (فائنل امتحان)۔

P.T میں دو پرچے ہوتے ہیں۔ ایک پرچہ جنرل اسٹڈیز دو گھنٹہ اور ۲۰۰ نمبر کا، اس میں معروضی (Objective) سوالات اور Negative Marking ہوتا ہے۔ جنرل اسٹڈیز میں مشترکہ سوالات معاشیات، سماجیات، تاریخ، جغرافیہ، سائنس، حساب وغیرہ سے پوچھے جاتے ہیں۔ اس میں ہر سبجیکٹ کے سوالات ہوتے ہیں۔

دوسرا پرچہ Common Attitude کا ہے۔ یہ بھی دو گھنٹہ اور ۲۰۰ نمبر کا ہوتا ہے۔ اس میں Comprehensive Passage سے سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ یعنی کئی صفحات پر مشتمل ایک عبارت دے دی جاتی ہے اور اسی عبارت کی بنیاد پر نیچے سوالات دیئے جاتے ہیں جس کو پڑھ کر نیچے کے سوالات کے جوابات دینے ہوتے ہیں۔

P.T (پرائمری ٹسٹ) میں کامیاب ہونے کے بعد ہی کوئی امیدوار Mains (فائنل امتحان) میں شرکت کرسکتا ہے۔

Mains(فائنل امتحان):

اس میں مندرجہ ذیل سوالات پوچھے جاتے ہیں۔

(A) پرچہ ا...... دستور ہند کی ۸ ویں شیڈول میں سے کسی ایک ہندوستانی زبان سے متعلق سوالات ۳۰۰ نمبرات

(B) پرچہ ۲......انگریزی ۳۰۰ نمبرات

(C) پرچہ ۳......مضمون نگاری ۲۰۰ نمبرات

(D) پرچہ ۴، ۵......مطالعہ سماج، اس میں دو پرچے ہر ایک ۳۰۰+۳۰۰ نمبرات کے ہوتے ہیں۔

(E) اختیاری(Optional) ا، ۲

Optional 1: پرچہ ۶، ۷...... ہر ایک کے دو دو حصے ہوتے ہیں اور ہر ایک ۳۰۰+۳۰۰ نمبرات کے ہوتے ہیں۔

Optional 2: پرچہ ۸، ۹...... ہر ایک کے دو دو حصے اور ہر ایک ۳۰۰+۳۰۰ نمبرات کے ہوتے ہیں۔ یعنی Optional Paper کل ۱۲۰۰ نمبرات کے ہوتے ہیں۔ یہ History, Geography, Political Science وغیرہ کے سوالات پر مشتمل ہوتے ہیں۔

Mains امتحان میں پاس کرنے کے بعد Viva (تقریری) ہوتا ہے جس کے ۳۰۰ نمبراتے ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں مقابلہ جاتی امتحانات میں اردو زبان میں بھی پرچہ لکھنے کی اجازت ہے۔ مقابلہ جاتی امتحانات پاس کرنے کے لئے سخت محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی امتحان کو پاس کرنے کے لئے تجربہ کار استاذ سے مدد لینے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مقابلہ جاتی

امتحانات کو پاس کرنے کے لئے ہر بڑے شہر میں کوچنگ انسٹی ٹیوٹ کھلے ہوئے ہیں جن میں داخلہ لے کر طلبہ ماہر اساتذہ کی نگرانی میں امتحان کی تیاری کرتے ہیں۔ مقابلہ جاتی امتحان بی پی ایس سی یو پی ایس سی میں P.T کا پاس کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد ہی امیدوار Mains امتحان میں شریک ہوسکتا ہے۔ پھر Mains امتحان پاس کرنے کے بعد Viva ہوتا ہے۔ اس طرح دو تحریری امتحان اور Viva پاس کرنے کے بعد ہی امیدوار منتخب قرار دیا جاتا ہے۔

مدارس کے فارغین کو مقابلہ جاتی امتحانات کے لائق بنانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ لیکن یہ کام صرف کہنے سے پورا نہیں ہوگا، بلکہ اس اہم کام کے لئے ملی تنظیموں کو آگے آنا ہوگا۔ چونکہ مقابلہ جاتی امتحانات کے لئے تیاری ایک نہایت اہم مسئلہ ہے۔ اس کے لئے باضابطہ کوچنگ اور امیدوار کی تربیت کی ضرورت ہے۔ مدارس کے فارغین عام طور پر غریب فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے جب تک انہیں سہولت فراہم نہیں کرائی جائے گی، وہ مقابلہ جاتی امتحانات میں کامیاب ہونے کے لائق نہیں بن سکیں گے۔ اس لئے سہولت کے مسئلے پر بھی بحث ضروری ہے۔

امیدواروں کی تربیت کے سلسلہ میں تین اداروں کا تجربہ میرے سامنے ہے۔ امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ کی جانب سے افتاء اور قضا میں طلبہ کی تربیت کی جاتی ہے۔ مرکز المعارف کی جانب سے فارغین مدارس کی تربیت کا انتظام ہے۔ اس ادارہ میں انگریزی بول چال کے ساتھ دیگر زبانوں میں بھی تقریر وتحریر کے لئے طلبہ کی تربیت کی جاتی ہے۔ اسی طرح رحمانی ۳۰ نمونہ کے طور پر موجود ہے۔ اس ادارہ میں IIT کے لئے طلبہ کو تیار کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ریلوے کے لئے بھی کوچنگ کرائی جاتی ہے۔ ان اداروں میں داخلہ ٹسٹ لے کر طلبہ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ طلبہ کا انتخاب اور ان کے قیام وطعام کا انتظام کیا جاتا ہے۔ ان کی تعلیم کے لئے ماہر اساتذہ کی خدمت حاصل کی جاتی ہے۔ اس طرح طلبہ کی تعلیم وتربیت اور ان کی نگرانی پوری طرح کی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ سامنے ہے۔ یہ تینوں ادارے کامیابی کے ساتھ خدمت انجام دے

رہے ہیں۔ مدارس کے فارغین کو مقابلہ جاتی امتحانات میں کامیاب بنانے کے لئے اسی انداز پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کوئی تنظیم اس کے لئے تیار ہوتو تجربہ کے طور پر ملک کے ایک دوصوبہ میں مقابلہ جاتی امتحان کی تیاری کے لئے کوچنگ کا انتظام کرے اور مدارس کے فارغین کو مقابلہ جاتی امتحانات میں کامیابی کے لئے کوشش کی جائے۔ مجھے پوری امید ہے کہ مدارس کے فارغین دیگر شعبہ میں بھی اپنی کامیابی کا جوہر دکھا کر ملک وملت کی صحیح اور پرخلوص خدمت کریں گے اور مدارس کے نام ووقار کو بلند کریں گے۔

☆☆☆

آٹھواں باب

مدارس کے مسائل

دینی مدارس اور طلبہ کے طعام اور رہائش کا معیار

ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی ☆

دینی مدارس کا سلسلہ اصحاب صفہؓ سے جا کر ملتا ہے۔ دور نبوت سے لے کر آج تک ان مدارس نے نامساعد حالات کے باوجود اپنا وجود برقرار رکھا ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کے آنے سے پہلے ہزاروں مدارس موجود تھے، جو دینی و دنیوی ہر طرح کی تعلیم طلبہ کو دیتے تھے اور جن کے پاس اوقاف کی شکل میں مضبوط ذرائع آمدنی ہوا کرتے تھے۔ اس وقت مسلمانوں میں تعلیم کی کوئی ثنویت اور دوئی نہ تھی۔ اور اسی نظام تعلیم سے جہاں ان کو علماء دین، قاضی شرع اور محدث وفقیہ ملتے تھے وہیں اسی سے اعلی درجہ کے منتظم، وزراء اور سرکاری اہل کار ملتے تھے۔ 1857 کے بعد انگریز کی مشق ستم کا کل نشانہ مسلمانان ہند بن گئے اور ان کا پورا نظام تعلیم مختلف مرحلوں میں برباد کر کے رکھ دیا گیا۔

بہر حال انگریزی دور اور آزادی کے بعد مدارس نے اپنا وجود برقرار رکھا۔ اپنی خدمات جاری رکھیں جو آج بھی جاری ہیں۔ دینی مدارس کی خدمات اور ان کے نظام ونصاب تعلیم میں اصلاحات کے سلسلہ میں راقم متعدد مضامین لکھ چکا ہے جو ملک کے مؤقر رسائل وجرائد میں چھپ چکے ہیں۔ (۱۔ ملاحظہ ہو درج ذیل مضامین: (الف) مدارس اسلامیہ مطلوبہ نظام تعلیم کے خدوخال، دعوت، دہلی، جون ۲۰۰۷)، (ب) مدارس اسلامیہ- اصلاح وتبدیلی ناگزیر، افکار ملی اگست ۲۰۰۶، (ج) ماضی قریب کے برصغیر میں احیاء اسلام کی کوششوں کا جائزہ- تعلیم وتحقیق

☆ ڈائرکٹر فاؤنڈیشن فار اسلامک اسٹڈیز، نئی دہلی

کے تناظر میں، زندگی نو، جولائی ۲۰۰۶ء، (د) ہندوستان کے مدارس اسلامیہ میں تدریس فقہ: ایک جائزہ مطالعات جلد ۱۵، ۱۴، جنوری تا مارچ ۲۰۱۰) ان میں راقم نے زور دے کر یہ بات کہی ہے کہ مدارس اسلامیہ عربیہ مسلمانوں کے NGO کا وسیع سلسلہ ہیں۔ بہر حال یہاں مجھے مدارس کی خدمات یا ان کے نظام تعلیم پر روشنی ڈالنی نہیں ہے بلکہ مدارس کے طلبہ سے متعلق ایک مخصوص جہت پر گفتگو کرنی ہے وہ ہے۔ ''مدارس اسلامیہ کے طلبہ کے طعام اور رہائش کا معیار''۔

ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کی ایک بہت بڑی تعداد وہ ہے جو ام المدارس، از ہر ہند دارالعلوم دیوبند اور اس کے توئم مظاہر العلوم سہارنپور کی شاخیں اور فروعات ہیں، یا اگر رسمی طور پر ان کے تابع نہیں بھی ہیں تو اپنے نظام تعلیم ونصاب میں انہیں کی پیروی کرتے ہیں۔ تھوڑے سے فرق کے ساتھ بریلوی مکتب فکر کے دارالعلوم اشرفیہ اور اس کی شاخیں بھی اسی درس نظامی کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ دوسرے وہ مدارس ہیں جو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے تابع ہیں، ان کے بعد وہ مدارس آتے ہیں جو جامعہ سلفیہ بنارس دارالسلام عمرآباد، جامعۃ الفلاح بلریا گنج اور مدرسۃ الاصلاح اور جامعۃ الہدایہ جے پور جیسے مدارس ہیں یا ان کی شاخیں ہیں۔ نصاب تعلیم کے سلسلہ میں تو دارالعلوم ندوۃ العلماء، اور ملحقات ندوہ اور دوسری کٹیگری کے مدارس کے بارے میں بحث وگفتگو کی پوری گنجائش موجود ہے۔ لیکن طلبہ کے قیام وطعام کے سلسلہ میں انہوں نے نسبۃً بہتر معیار Maintain کیا ہوا ہے۔ اس لیے ہماری گفتگو کے دائرہ میں وہ کم ہی آئیں گے۔

دارالعلوم دیوبند کے تابع مدارس، دوسرے لفظوں میں درسِ نظامی کے پیروکار مدارس جو تعداد میں ہزاروں سے بھی متجاوز ہیں۔ بلاشبہ ان کی خدمات عظیم الشان ہیں اور اسلامیان ہند پر بالعموم انہیں کے اثرات زیادہ ہیں۔ وہ جس طرح اپنے نصابات اور طریقۂ تعلیم وتربیت کے باب میں صدیوں پرانے نصاب ونظام کو مقدس سمجھ کر اس سے چمٹے ہوئے ہیں اور اس میں ادنی بھی تبدیلی گوارا نہیں کرتے، اسی طرح طلبہ کے طرز رہائش رہن سہن اور کھانے پینے وغیرہ

کے لیے جدید سہولیات دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مثلاً بڑے بڑے مدارس میں طلبہ کو بجلی کے پنکھے فراہم نہیں کیے جاتے۔ کھانا لانے کے لیے طلبہ لائنوں میں لگتے ہیں۔ البتہ بعض مدارس میں کھانا طلبہ کے کمروں میں پہنچایا جاتا ہے اور بعض میں ڈائنگ ہال میں اجتماعی طور پر طلبہ کھانا کھاتے ہیں۔ لائن میں لگنے کے بجائے یہ دونوں طریقے ترجیحی طور پر اختیار کیے جانے چاہییں۔ جو کھانا ہوتا ہے، خاص کر غیر مستطیع طلبہ کے لیے، وہ غیر صحت مندانہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مہینوں بلکہ سالوں تک دال چاول یا بڑے کا گوشت دینا کوئی بہت اچھا کھانا نہیں ہے۔ کھانے میں تھوڑا بہت تنوع تو ہو اور اس کو وٹامن و پروٹین مناسب انداز میں فراہم کرنے والے اجزاء طعام اور اشیاء پر مشتمل ہونا چاہیے۔ رہائش کے لیے چارپائی نہیں فراہم کی جاتیں۔ اکثر مدارس میں ایک ایک کمرہ میں کئی کئی طالب علموں کو رکھ دیا جاتا ہے اور اس میں عمروں کے تفاوت کا بھی خیال نہیں رکھا جاتا اور بعض مدارس میں بڑے سے ہال میں 50، 60 لڑکوں کو ایک ساتھ رکھ دیا جاتا ہے۔ طلبہ بالعموم زمین پر سوتے ہیں اور نیچے ہی تپائی وغیرہ پر اپنی کتابیں رکھتے ہیں۔ ریک اور الماری جیسی سہولیات ان کو حاصل نہیں ہیں۔ دیوبند اور مظاہر علوم جیسے بڑے اداروں میں بھی طلبہ کا یہی برا حال ہے۔ البتہ دیوبند نے نئے ہاسٹلوں میں یہ سہولیات مہیا کرانے کا آغاز کر دیا ہے۔

اسی طرح صحت وغیرہ کو برقرار رکھنے کی کوئی سہولت طلبہ کو نہیں دی جاتی، طلبہ کی اپنی انجمن، اور لائبریری کا معیاری نظم نہیں ہوتا، دیوبند میں مسجد رشید جیسی عمارت کھربوں روپے خرچ کر کے بنادی گئی مگر طلبہ کے لیے اچھے ہاسٹل، کمروں میں چارپائیاں، تپائیاں اور میز و کرسی وغیرہ جیسی ضروری سہولیات طلبہ کو فراہم کرنے کی توفیق خداوندان دیوبند کو نہیں ہوسکی۔ بڑی بڑی اور شاندار عمارتیں مدارس میں خوب بنتی ہیں، مگر ان عمارتوں کے مکینوں یعنی طلبہ اور اساتذہ کے ویلفیر اور بہبود کا کسی کو خیال نہیں آتا۔ شاندار عمارتیں بنانے کے بجائے یہی فنڈ طلبہ کے اوپر خرچ

کیے جائیں تو ان کی تعلیم وتربیت کا بہتر نظم کیا جاسکتا ہے۔اس سلسلہ میں نئے نئے کھلنے والے مدارس کے مہتمم حضرات اوران کی ذریت کے تعیش کی داستانیں بھی گاہے بگاہے میڈیا میں آتی رہتی ہیں۔(اس کی تھوڑی سی تفصیل مولانا ندیم الواجدی کے مضمون مشمولہ حسن تدبیر، مدارس نمبر، ایڈیٹر اعجاز عرفی قاسمی فروری 2011 میں دیکھی جاسکتی ہے۔)

اس سلسلہ میں غالباً شمالی ہند اور جنوبی ہند کے ذوق ومزاج کا فرق بھی ہے۔کیونکہ شمال کے لوگ سیاست سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں مثبت اور تعمیری کاموں سے کم۔چنانچہ یہاں کے مدارس اور علماء پر بھی اس کی چھاپ ہے اسی لیے جمعیۃ علماء ہند کے دونوں دھڑے اپنے تابع مدارس کے طلبہ واساتذہ کو اپنے پروگراموں کا تختۂ مشق بناتے رہتے ہیں۔جنوب میں یہ وبا ذرا کم ہے۔اس لیے اس کے اثرات مدارس میں بھی نظر آتے ہیں۔اب سے کئی سال پہلے راقم نے شمال وجنوب کے بعض بڑے مدارس کا سفر کیا جن میں دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، (قدیم وجدید) دارالعلوم دیوبند وقف، جامعہ اشرفیہ مبارکپور، بریلی کا منظر اسلام، مرادآباد کا مدرسہ شاہی، جامعہ نعیمیہ تو شمالی ہند کے تھے۔اور جنوبی ہند کے مدارس میں جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل، دارالعلوم ماٹلی والا بھروچ، ترکیسر اور سورت اور حیدرآباد کے مدارس تھے۔اس سفر میں اس نے مشاہدہ کیا کہ جنوبی ہند کے ان مدارس میں بھی معمولی سے فرق کے ساتھ درس نظامی ہی پڑھا پڑھایا جاتا ہے۔مگر ان میں وسیع وعریض کیمپس، خوبصورت پارکنگ، لان، اور طلبہ کی رہائش کے اچھے انتظامات فراہم کیے گئے ہیں، اسی طرح طلبہ کے لیے لائبریریوں کا بھی اچھا نظم ہے۔اس سے اندازہ ہوا کہ اس سلسلہ میں جنوب وشمال کے ذوق کا بھی بہت کچھ فرق ہے۔

مدارس کے طلبہ پر لباس اور داڑھی وغیرہ جیسے مسائل کو لے کر سختی تو کی جاتی ہے مگر ڈسپلن کی کوئی پابندی نہیں کرائی جاتی۔مدارس میں عمومی طور پر لنگی کلچر کا رواج ہے، طلبہ کو اس بات کا پابند بنایا جانا ضروری ہے کہ لنگی کا استعمال وہ صرف سونے کے لیے کریں گے، دن کے اوقات

میں اس کا استعمال ممنوع اور کلاسوں میں لنگی پہن کر جانے پر تو پابندی ہونی چاہئے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ لنگی کا لباس سنت میں داخل ہے اور اس کو ممنوع قرار دینے سے سنت کی توہین ہوتی ہے مگر یہ بات درست نہیں کیونکہ لنگی خود پورا لباس نہیں ہے، اس کا ایک حصہ ہے اگر اسکو سنت مانا جاتا ہے تو اس کے ساتھ عہد نبوی میں ایک چادر جسم کے اوپر کے حصے پر ڈالی جاتی تھی لہذا اس کو بھی اختیار کرنا چاہیے۔

طلبہ کو دی جانے والی سہولیات کے سلسلہ میں اکثر اہل مدارس یہ عذر لنگ کرتے ہیں کہ ان کے پاس وسائل کم ہیں۔ لیکن محسوس یہ ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں کہیں نہ کہیں یہ بات موجود ہے کہ زیادہ آزادیاں اور سہولتیں دینے سے طلبہ کا دماغ خراب ہو جائے گا، وہ اساتذہ و ذمہ داران کا احترام نہ کریں گے ان کے مزاج میں آوارگی آ جائے گی وغیرہ۔ یہ عذر پیش کرتے ہوئے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جدید فن تعلیم و تربیت اور طریقہ تعلیم کی رو سے یہ سہولیات طلبہ کو دینا ضروری ہیں ورنہ ان کی شخصیت کا ارتقاء رک جائے گا اور Personality Development کے اصول کے مطابق وہ فطری طور پر آگے نہ بڑھ سکیں گے۔ پھر یہ بھی ہے کہ مستطیع طلبہ تو اپنے پیسہ کے بل بوتے پر اپنے لیے زندگی کی آسائشیں اور سہولیات خود سے فراہم کر لیتے ہیں مگر غیر مستطیع طلبہ تو بے چارے ''کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہے'' کی عملی تصویر بنے رہتے ہیں۔

یہ صورت حال صرف سنی مکاتب فکر کے مدرسوں کی ہی نہیں بلکہ شیعہ مدارس کا بھی یہی حال ہے۔ کئی سال پہلے لکھنؤ میں حضرات اہل تشیع کے دو بڑے مدارس ناظم المدارس اور سلطان المدارس کا مشاہدہ کیا۔ نظام ونصاب تعلیم سے قطع نظر طلبہ کے معیار رہائش اور قیام وطعام کے سلسلہ میں ان کے حالات بھی بہت زیادہ حوصلہ افزا نہیں پائے۔ حالانکہ فنڈز کی ان کے پاس بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مذہبی تعلیم پر عمومی مردنی چھائی ہوئی ہے۔

البتہ ایران کے سفر میں وہاں کے علمی وثقافتی شہر قم جانے کا موقع ملا اور ایک پورا دن قم

کے بڑے مدارس کو دیکھنے میں گزرا، جس میں امام خمینی اکیڈمی (مجتمع امام خمینی) جامعۃ المصطفی تہران کے ماتحت ہے کو خصوصی طور پر دیکھا۔ یہ مذہبی و دینی ادارہ ہے، مگر انتہائی اعلیٰ اور جدید ترین طرز پر بنایا گیا ہے، اس کا معیارِ طرزِ رہائش لائبریری، دارالاقامہ، اسپورٹس فیلڈ، مطبخ، کلاس روم اور رہائشی کمروں میں طلبہ کو دی جانے والی سہولیات ہمارے ہاں کی کسی بھی جدید ترین یونیورسٹی سے کم نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ حکومت ایران ان اداروں کا خاص خیال رکھتی ہے، ہم اپنے مدارس سے اتنے اعلیٰ معیار کی توقع نہیں کر سکتے مگر اس کا کم از کم درجہ کی تو ان سے امید رکھنے میں ہم حق بجانب ہوں گے۔

مدارس اسلامیہ میں نصاب درس اور طلبہ کی سہولتوں کے لحاظ سے کمی صرف ہندوستان کے مدارس کے ساتھ خاص نہیں بلکہ کم وبیش پاکستان کے مدارس کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے، یہ سنی سنائی نہیں بلکہ اپنے مشاہدہ کی بات ہے۔ چنانچہ حال ہی میں (مارچ ۲۰۱۱) پاکستان کا سفر ہوا، اسلام آباد میں ۵ دن قیام رہا، جہاں جامعہ فریدیہ (جو جامعہ حفصہ (لال مسجد) کی اصل ہے۔ اس کو تفصیل سے دیکھا۔ اسلام آباد کے سب سے خاص اور مہنگے علاقہ میں واقع اس مدرسہ میں طلبہ کا معیار اور طرز رہائش یوپی کے کسی دور افتادہ گاؤں کے مدرسہ سے ذرا بھی مختلف نہیں ہے۔ البتہ مدرسہ میں ایک خوبصورت لان ضرور بنایا گیا ہے۔

تاہم مزید معلومات کرنے سے پتہ چلا کہ پاکستان میں کم از کم تین ادارے ایسے ہیں جنہوں نے اس سمت میں دوسرے مدارس کی بہ نسبت اچھی ترقی کی ہے، اور یہ ہمارے مدارس کے لیے اچھا نمونہ ہیں۔ یہ تینوں مدارس کراچی میں ہیں یہاں ان کی تھوڑی سی معلومات اس لیے درج کی جارہی ہیں کہ ہمارے ہندوستانی اہل مدارس ان سے کچھ سبق لیں۔

۱- جامعہ بنوریہ کراچی

یہ مدرسہ علامہ محمد یوسف بنوریؒ کی یاد میں قائم کیا گیا ہے، کافی طلبہ (۳۰۰۰)

یہاں پڑھنے آتے ہیں واضح رہے کہ برصغیر میں رائج درسِ نظامی کے بڑے ناقدوں میں ایک مولانا بنوریؒ بھی تھے جنہوں نے اس میں دوررس تبدیلیوں کی وکالت کی ہے، اور اس کے لئے تجاویز بھی دی تھیں۔ (ملاحظہ ہو: ہندوستان کے مدارس اسلامیہ میں تدریس فقہ: ایک جائزہ مطالعات جلد ۱۵، ۱۴، جنوری تا مارچ ۲۰۱۰) جامعہ بنوریہ میں علوم اسلامیہ کی تدریس کے ساتھ ہی خدمت خلق کا بھی ایک اہم شعبہ ہے، اس کی ایک اہم غرض یہ بھی ہے کہ خدمت خلق کے ذریعہ لوگوں کو مدارس سے جوڑنا اور پروپگنڈوں کا مثبت جواب دینا۔ چنانچہ اس کے لئے ''ملک کے مختلف علاقوں میں اسپتال قائم کرنا اور ان کی وساطت سے مریضوں کو ایمبولینس اور دوسری ضروریات فراہم کرنا'' (حسن تدبیر، مدارس نمبر، ایڈیٹر اعجاز عرفی قاسمی صفحہ 153 فروری 2011، 25/q الصمد روڈ بٹلہ ہاوس جامعہ نگرنئی دہلی) اس مدرسہ میں عام طلبہ کو بھی عام مدارس کے مقابلہ میں زیادہ سہولیات فراہم کی جاتی ہیں لیکن اس کے شعبہ بیرونی میں جس میں یوروپی ممالک سے طلبہ آتے ہیں ان کی نفسیات کا خاص خیال رکھنے کے لیے ان کے لیے اعلیٰ معیار کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے بنوائے گئے ہیں۔ اس شعبہ میں اس وقت درجہ حفظ میں ۱۵ کلاسیں اور درجہ کتب میں ۶ کلاسیں ہیں۔ اور زیر تعلیم طلبہ کی تعداد ۵۰۰ ہے۔ شعبہ بیرونی کے طلبہ کو جو سہولیات فراہم کی گئی ہیں وہ یوں ہیں:

۱-طلبہ کی رہائش کے لیے ائرکنڈیشنڈ کمرے

۲-کلاسوں میں بیٹھنے کے لیے قالینوں کا انتظام

۳-طلبہ کو ناشتہ اور کھانا حسب مینو فراہم کرنا

۴-طلبہ کو ایئرپورٹ آنے جانے کی سہولت

۵-طلبہ کے کپڑے دھونے کے لیے لانڈری کا نظم

۶-ٹھنڈے اور گرم پانی کی سہولت

۷-طلبہ کے علاج کے لیے اچھے اسپتال کا نظم

۸-ویزے اور ایئر ٹکٹ کے تمام معاملات کی سہولیات (ایضا صفحہ 155)۔

جامعہ بنوریہ میں لڑکیوں کی تعلیم کا بھی اعلیٰ نظم ہے، جن میں غیر ملکی لڑکیاں بھی کافی تعداد میں پڑھتی ہیں۔ اس جامعہ میں اردو اور انگریزی میں ایک ماہنامہ شائع ہوتا ہے۔ وہ اپنی ویب سائٹ پر فتوی سروس مفت فراہم کرائی ہوئی ہے۔ نیز بنوریہ ویلفیئر ٹرسٹ کے نام سے خدمت خلق کا جو شعبہ ہے اس کے تحت فری ایمبولینس اور دو باقاعدہ کلینک قائم ہیں۔ ضرورت مندوں کو مفت راشن بھی تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جامعہ نے ۵۰ بیڈ کا اسپتال بھی قائم کیا ہے، جس میں طلبہ کے علاوہ علاقہ کے نادار وغریب لوگوں کا مفت علاج کیا جاتا ہے۔ اس میں آپریشن، ایکسرے، الٹرا ساؤنڈ، ای سی جی رپورٹ وغیرہ کی سہولیات فراہم کی گئی ہیں۔ (۴) خدمت خلق کے ذریعہ یہ ادارہ عوام سے بھی جڑا ہوا ہے اور یہ اس کا بڑا کارنامہ ہے، جس سے ہندوستانی مدارس بھی سبق سیکھتے ہیں۔ کیونکہ ان اداروں کو بھی سرکاری گرانٹ نہیں ملتی ہے۔ ان کی ذرائع آمدنی بالکل وہی ہیں جو ہندوستانی مدارس کے ہیں، اصل مسئلہ وژن کی وسعت کا ہے۔

دارالعلوم کراچی

یہ جامعہ برصغیر کے معروف مفتی وفقیہ مولانا مفتی محمد شفیعؒ کا قائم کردہ ہے، ۱۹۵۱ میں اس کی تاسیس ہوئی۔ اب ان کے بڑے صاحبزادے مفتی محمد رفیع عثمانی اس کے ناظم اعلیٰ ہیں دارالعلوم کراچی میں اقامت پذیر طلبہ کی تعداد بھی ہزاروں میں ہے جن کی تمام ضرورتوں کا یہ کفیل ہے۔ مفتی محمد تقی عثمانی یہاں کی معروف علمی شخصیت ہیں جن کی بین الاقوامی شہرت اس کے لیے باعث فخر ہے۔ آج مفتی تقی عثمانی حدیث وفقہ کے میدان میں علمی دنیا کا ایک معروف نام ہیں، ہندوستان رقبہ میں بھی پاکستان سے کافی بڑا ہے۔ اور مسلمانوں کی تعداد بھی یہاں پاکستان کے مقابل کہیں زیادہ ہے، مگر پورے ہندوستان میں اس وقت کوئی بھی علمی شخصیت، کسی بھی مکتب فکر

میں ایسی نہیں جو مفتی تقی عثمانی کے آس پاس بھی پہنچتی ہو۔ دار العلوم کراچی میں پاکستانی طلبہ کے علاوہ، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، افغانستان، بنگلہ دیش، برما، تھائی لینڈ، کناڈا، جرمنی، امریکہ، ویسٹ انڈیز اور ترکی وغیرہ مختلف ممالک کے طلبہ بھی یہاں پڑھنے آتے ہیں۔ دار العلوم نے طلبہ کی سہولتوں پر خاص طور پر دھیان دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی رہائش اور قیام وطعام پر ایک بڑا صرفہ آتا ہے۔ ''اگر رہائشی کمروں کی بات کی جائے تو عصری تعلیم گاہوں کے طرز پر ہر طالب علم کے لیے الگ چارپائی، میز، الماری، ریک، بلب اور پنکھا مختص کیا گیا ہے، ہر دو کمروں کے فاصلے پر گیس کا ایک چولہا نصب کر دیا گیا ہے۔ ٹھنڈے پانی کے لیے ہر عمارت میں واٹر کولر دست یاب کرائے گئے ہیں'' (ایضاً صفحہ 157) یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہاں کا معروف مجلّہ ''البلاغ'' گزشتہ چھ سالوں سے انگریزی میں بھی شائع ہو رہا ہے اور بڑے پیمانے پر جدید تعلیم یافتہ طبقوں میں خاصا مقبول ہے۔ ہندوستان میں مدارس تو دور اسلامی تحریکیں اور تحقیقی ادارے بھی آج تک کوئی ڈھنگ کا پرچہ انگریزی میں نہیں نکال سکے۔

دار العلوم کراچی میں پرائمری اور سیکنڈری اسکول بھی ہیں جن میں عصری علوم کی مقبول تعلیم کا نظم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دار العلوم کا کتب خانہ بھی ملک کے مشہور کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے جس میں تنظیم کتب کا طریقہ اعلیٰ ترین، جدید اور کمپیوٹرائزڈ ہے۔ اور بھی باتیں ہیں، مگر ان کی تفصیل سے گفتگو موضوع سے ہٹ جائے گی۔

جامعہ علوم اسلامیہ کراچی

یہ بھی بنوری ٹاؤن کراچی میں ہے اس کی بنیاد مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے ڈالی تھی جن کا مختصر سا تذکرہ اوپر گزرا۔ اس جامعہ کا بجٹ چھ کروڑ سالانہ سے بھی زیادہ ہے اور یہاں ۶۰ سے زیادہ ممالک کے طلبہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس جامعہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عمر دراز افراد کی تعلیم کا باضابطہ نظم ہے'' بلکہ جامعہ کے خدام اور متعلقین جامعہ کے لیے بھی اس میں

شرکت کو لازمی کر دیا گیا ہے۔ اس شعبہ میں قرب وجوار میں رہنے والے اور دکانوں میں کام
کرنے والے افراد کے لیے قرآن کریم کو تجوید کے ساتھ پڑھانے کے معیاری نظم کے ساتھ ان
کو دین کی بنیادی باتوں سے واقفیت بہم پہنچائی جاتی ہے۔ مغرب کے بعد اس قسم کی کلاسز لگتی
ہیں۔ ان کا با قاعدہ امتحان ہوتا ہے اور اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہونے والوں کی حوصلہ افزائی بھی
کی جاتی ہے" (ایضا صفحہ 163)۔

جامعۃ الرشید کراچی

اس جامعہ نے اپنے نصاب ونظام تعلیم کو جدید وقدیم کے امتزاج سے زمانہ حاضر سے
ہم آہنگ بنانے کی کوشش کی ہے، اس کا نظام شورائی ہے۔ عام طور پر مدارس میں سیکورٹی کا کوئی
نظم نہیں ہوتا مگر اس جامعہ میں حفاظتی انتظامات پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ سیکورٹی کا پورا عملہ ہے،
ویڈیو واچ کے لیے کنٹرول روم بنائے گئے ہیں، زائرین اور مہمانوں کی فوٹیج بھی رکھی جاتی ہے،
ان کے سامانوں کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ برصغیر کے مدارس میں موبائل، لیپ ٹاپ اور کمپیوٹر کے
استعمال کو شجر ممنوعہ سمجھا جاتا ہے، انفارمیشن ٹکنالوجی کے اس دور میں کیا یہ قابل تعجب نہیں کہ مظاہر
علوم سہارنپور میں طلبہ کے لیے موبائل رکھنا ممنوع ہے، طلبہ سے اس بارے میں نہ صرف باز پرس
ہوتی ہے بلکہ ان کا اخراج بھی کر دیا جاتا ہے (ایضا صفحہ 165) جامعۃ الرشید کراچی میں اس
بارے میں زبردست فراخ دلی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "جامعہ میں وائرلیس روٹر
(Router) کی سروس دستیاب ہے، جس سے موبائل یا لیپ ٹاپ پر بغیر تاروں کے انٹرنیٹ
خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ جامعہ کے تمام دفاتر کو کمپیوٹر نیٹ ورکنگ
کے ذریعہ مربوط کر دیا گیا ہے۔ جامعہ میں کمپیوٹر استعمال کرنے والے تیز رفتار انٹرنیٹ کی سہولت
فراہم کی گئی ہے، جامعہ میں تعلیمی اور پروفیشنل کاموں کے لئے انٹرنیٹ کے استعمال کی حوصلہ
افزائی کی جاتی ہے۔

طلبہ کی سہولتوں کا خیال رکھتے ہوئے جہاں مطبخ کے علاوہ جامعہ کے احاطہ میں ہی کینٹین کا انتظام ہے، جہاں طلبہ قیمتاً اپنی پسند کے کھانے کھا سکتے ہیں۔ وہیں جدید ترین ٹکنالوجی سے طلبہ کو واقف کرانے اور اس کے دوررس اور پائے دار نتائج سے آگاہ اور واقف کرانے کے لیے ۳ کمپیوٹر لیب ہیں جن میں ۶۰ سے زیادہ فل لوڈ ڈ کمپیوٹروں کی خدمات حاصل ہیں اور یہ ہمارے مدارس کے ذمہ داران کے لیے باعث حیرت ہوگا کہ جامعہ کے احاطہ میں آج کل کی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہوئے بین الاقوامی معیار کا سوئمنگ پول بھی بنایا گیا ہے، جس میں طلبہ اور اساتذہ طے شدہ نظام الاوقات کے مطابق تیراکی سیکھتے ہیں۔ طلبہ میں کھیل کے ذوق کو پروان چڑھانے اور ان کو صحت مند اور چاق وچوبند بنانے کے لیے کھیل کا میدان بھی بنایا گیا ہے۔ جہاں وہ والی بال، ریس، پٹھو گرم، فریسبی اور کراٹے میں حصہ لیتے ہیں'' (ایضا صفحہ 165)۔

باوجود اس کے کہ پاکستانی مدارس کو بالخصوص طالبان کا گڑھ اور دہشت گردی کا مرکز اور نہ جانے کیا کیا جاتا ہے، جس میں لال مسجد کے سانحہ نے اور زیادہ شدت پیدا کردی ہے، ہم نے ان چند مدارس کے احوال ذرا تفصیل سے اس لیے بیان کیے ہیں کہ ان اداروں نے اپنے ذہن ودماغ کی کھڑکیاں کھلی رکھی ہیں۔ گلوبلائزیشن کے اس دور میں ان تمام عصری تقاضوں پر لبیک کہنا ضروری ہے جو مدارس کے منشور اور ان کے دائرۂ کار سے متضاد ومتصادم نہ ہوں، یہ ساری سہولیات اس لیے بھی بیان کی گئی ہیں کہ آج معیاری طعام ورہائش کا تصور ان جدید لوازمات کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یونیورسٹی وکالجز کے ہاسٹلوں میں طلبہ کا جو معیار رہائش اور کھانے پینے کا جو نظم ہے، وہاں طلبہ کو جو آزادیاں دی جاتی ہیں ان کا ڈائرکٹ اثر ان کی عملی زندگی پر پڑتا ہے۔ یقیناً اس کے بہت سے مضر اور منفی اثرات بھی ہیں، لیکن مفید ومثبت اثرات زیادہ ہیں جن سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں دینی مدارس میں آنے والے طلبہ کے پس منظر کی کھوج بالکل غیر ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اعلیٰ اور خوش حال گھرانوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ

مدارس میں کم آتے ہیں، مجموعی طور پر اہل مدارس کے تنزل میں یہ بھی ایک عامل ہے، مگر طلبہ کے سامنے اونچا نصب العین ہو، انہیں اچھی سہولیات دی جائیں تو نسبۃً نادار اور مفلوک الحال گھرانوں سے آنیوالے طلبہ بھی کما حقہ ترقی کر سکتے ہیں اور زندگی کے میدانوں میں آگے بڑھ سکتے ہیں۔

بعض مدارس کی یہ تفصیلات اس لیے بھی بیان کی گئی ہیں کہ اہل مدارس کے پاس بالعموم یہ عذر لنگ ہوتا ہے کہ "ہم اپنے مختصر سے بجٹ سے اتنی ساری سہولیات کہاں سے دے سکتے ہیں"، لیکن جو مدارس یہ کر رہے ہیں وہ بھی بغیر کسی سرکاری گرانٹ کے عوامی چندوں سے حاصل ہوئے فنڈز سے ہی کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر ہمارے مدارس مذکورہ پاکستانی مدارس کے معیار کو قائم نہیں کر سکتے ہیں تو اس سے کچھ کم معیار تک تو پہنچ ہی سکتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ عام مدارس یہ نہیں کر سکتے تو یقیناً دیوبند، مظاہر علوم، ندوۃ العلماء، مدرسۃ الاصلاح، جامعۃ الفلاح، جامعہ سلفیہ بنارس اور جامعہ دارالسلام عمر آباد وغیرہ تو یہ چیزیں فراہم کر سکتے ہیں۔ اگر اکل کواں (مہاراشٹر) کا مدرسہ آئی آئی ٹی کالج اور میڈیکل کالج چلا سکتا ہے تو یہ بڑے مدارس کیوں نہیں چلا سکتے۔

بات گھوم پھر کر وہی اہل مدارس کی فکری پس ماندگی، معلومات کی کمی، ایمانداری اور شفافیت کے نہ ہونے اور سیاست بازیوں تک پہنچے گی۔ مسلمان عام طور پر سازشی تھیوری میں جیتے ہیں۔ ان کی باریش و بے ریش قیادت ان کو غالباً انہی اوہام وخرافات میں مبتلا رکھنا چاہتی ہے تا کہ اس کی اپنی دکان چلتی رہے۔ جب تک یہ چیز ختم نہیں ہوتی، فکری رویے درست نہیں ہوتے اور مسلمان عموماً اور علماء واہل مدارس خصوصاً مثبت وایجابی انداز نظر پیدا نہیں کرتے۔ وہ مدارس کی اصلاح کے لیے عملی اقدامات کے بارے میں سوچ بھی نہ سکیں گے۔

☆☆☆

دینی مدارس و مکاتب میں تنبیہ وتادیب

مولانا نورالحق رحمانی ☆

انسان کا انسان بننا، مہذب اور شائستہ ہونا اور انسانی صفات سے آراستہ ہو کر اللہ کی بندگی اور انسانیت کی خدمت کا فریضہ انجام دینا اس کی صحیح تعلیم وتربیت پر موقوف ہے۔ اس مقصد کے لئے اللہ رب العزت نے ہر زمانے میں انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا، اور انہوں نے ہر دور میں یہ مقدس فریضہ انجام دیا۔ بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے بعد جب ضلالت وگمراہی زیادہ وسیع پیمانے پر پھیلی تو انسانیت کو جہالت وضلالت کی تاریکیوں سے نکالنے کے لئے اللہ رب العزت نے سلسلہ نبوت ورسالت کی آخری کڑی سید الانبیاء اور نبی آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، جنہوں نے اپنی مثالی تعلیم وتربیت کے ذریعہ عرب کی وحشی اور بدو قوم کی کایا پلٹ دی، اور انہیں انسانیت کا معلم بنایا۔ نبی آخر الزماں کی بعثت کے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا: **هو الذی بعث فی الأمیین رسولا منهم یتلو علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة** (الجمعہ/ ۲) وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

کتاب اللہ کی آیات کی تلاوت، تزکیہ نفس، اور تعلیم کتاب وحکمت نبی رحمت کے فرائض منصبی میں داخل ہیں۔ خود پیغمبر علیہ السلام نے اپنا تعارف معلم کی حیثیت سے کرایا، فرمایا:

☆ استاذ المعہد العالی، پھلواری شریف، پٹنہ

إنما بعثت معلما، اور نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو قیامت تک کے انسانوں کیلئے اسوہ اور نمونہ قرار دیا گیا: لقد کان لکم فی رسول اللہ أسوۃ حسنۃ (الأحزاب/۲۱) یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ میں عمدہ نمونہ ہے۔ اس لحاظ سے اسلامی نظام تعلیم وتربیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو اور آپ کے پاکیزہ طریقۂ تعلیم وتربیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معلم ہیں اور سارے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ کے شاگرد ہیں، استاذ کا شاگردوں سے کیا رشتہ ہوتا ہے اور دونوں کے باہمی تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اس کی وضاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس فرمان کے ذریعہ کی ہے: إنما انا لکم مثل الوالد للولد أعلمکم (سنن الدارمی ۱/۱۸۲) یعنی میں تمہارے لئے ایسا ہوں جیسا باپ اپنی اولاد کے لئے ہوتا ہے۔ ہر انسان کی نظر میں اس کی اولاد سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے، وہ دل سے اس کی ترقی کا خواہاں ہوتا ہے۔ وہ لاکھ جتن کر کے اسے آگے بڑھانا چاہتا ہے اور اسے اپنے سے زیادہ بہتر حالت میں دیکھنا چاہتا ہے، گویا اولاد انسان کی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہوتی ہے؛ اس لئے ہر استاذ کو اپنے شاگردوں کے تئیں اسی کردار اور ایسے ہی پاکیزہ جذبات کا حامل ہونا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کی تعلیم وتربیت جس پیارے طریقے پر فرمائی ہے اس کی بہت سی مثالیں سیرت نبوی اور احادیث کے ذخیرے میں ملتی ہیں، نمونہ کے طور پر ہم دو تین واقعات ذیل میں نقل کر رہے ہیں:

۱ – عن معاویۃ بن الحکم السلمی قال: بینا أنا أصلی مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إذ عطس رجل من القوم فقلت: یرحمک اللہ، فرمانی القوم بأبصارھم فقلت: واثکل أمیاہ ماشأنکم تنظرون إلیّ فجعلوا یضربون بأیدیھم علی أفخاذھم فلما رأیتھم یصمّتونی لکنی سکتّ، فلما صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبأبی ھو وأمی ما رأیت معلما قبلہ ولابعدہ أحسن

تعليما منه فو الله ماقهرني ولاضربني ولاشتمني ثم قال: إن هذه الصلوة لايصح فيها شيئ من كلام الناس إنما هو التسبيح والتكبير وقراء ة القرآن

(مسلم، کتاب المساجد: باب تحریم الکلام فی الصلاۃ)۔

حضرت معاویہ بن حکم سلمی سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا کہ ہم میں سے ایک شخص کو چھینک آ گئی، میں نے کہا: یرحمک اللہ، تو لوگوں نے مجھے گھورنا شروع کر دیا، میں نے کہا کہ کاش مجھ پر میری ماں روچکتی (یعنی میں مر جاتا) تم کیوں مجھ کو گھورتے ہو، یہ سن کر وہ لوگ اپنے ہاتھ رانوں پر مارنے لگے، جب میں نے دیکھا کہ وہ مجھ کو چپ کرانا چاہتے ہیں تو میں چپ ہو رہا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ چکے۔ آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں کہ میں نے آپ سے پہلے اور آپ کے بعد آپ سے بہتر معلم نہیں دیکھا۔ تو اللہ کی قسم نہ آپ نے مجھ کو جھڑکا، نہ مارا، نہ برا بھلا کہا، صرف یہ فرمایا کہ نماز میں دنیا کی باتیں کرنا درست نہیں ہے، اس میں تو تسبیح، تکبیر اور قرآن کریم کی تلاوت ہے۔

۲- اور سیرت نبوی کا یہ واقعہ تو بہت مشہور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے کہ اتنے میں ایک اعرابی آیا اور مسجد کے ایک گوشے میں بیٹھ کر پیشاب کرنے لگا، صحابہ نے دیکھا تو مشتعل ہو کر اس کی طرف لپکے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اسے پیشاب کرنے سے مت روکو، جب وہ پیشاب کر چکا تو آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ اس جگہ ایک ڈول پانی مار کر اسے بہا دو، پھر اسے قریب بلا کر نہایت شفقت و محبت کے انداز میں سمجھایا کہ مسجد عبادت اور تلاوت کی جگہ ہے، پیشاب اور قضائے حاجت کی جگہ نہیں (ابوداؤد)۔

۳- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثالی تعلیم و تربیت سے متعلق ایک واقعہ اور قابل ذکر ہے:

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلۂ قریش کا ایک نوجوان دربار نبوی

میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے زنا کی اجازت دیجئے۔ پس لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور سب نے اس کو ڈانٹا اور چپ چپ کہنا شروع کیا۔ بعدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ تم میرے قریب آجاؤ، چنانچہ وہ آپ کے قریب آگیا، آپ نے اس سے فرمایا: کیا تم اس کو پسند کرو گے کہ کوئی تمہاری ماں کے ساتھ زنا کرے؟ اس نے کہا: نہیں یا رسول اللہ! اللہ مجھے آپ پر قربان کرے۔ آپ نے فرمایا: ایسا ہی تمام لوگ اپنی ماؤں کے ساتھ کسی کے زنا کرنے کو پسند نہیں کریں گے، پھر فرمایا: کیا تم اپنی بیٹی کے ساتھ کسی کے زنا کرنے کو پسند کرو گے؟ اس نے کہا: نہیں یا رسول اللہ! اللہ مجھ کو آپ پر قربان کرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسی طرح لوگ اپنی بیٹیوں کے ساتھ کسی کے زنا کرنے کو پسند نہیں کریں گے، پھر آپ نے فرمایا: کیا تم اپنی بہنوں کے ساتھ کسی کے زنا کرنے کو پسند کرو گے؟ اس نے کہا: نہیں یا رسول اللہ، اللہ مجھ کو آپ پر قربان کرے، آپ نے فرمایا: اسی طرح لوگ اپنی بہنوں کے ساتھ کسی کے زنا کرنے کو پسند نہیں کریں گے، پھر آپ نے فرمایا: کیا تم اپنی پھوپھی کے ساتھ کسی کے زنا کرنے کو پسند کرو گے، اس نے کہا: نہیں یا رسول اللہ! اللہ مجھے آپ پر قربان کرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسی طرح لوگ اپنی پھوپھیوں کے ساتھ کسی کے زنا کرنے کو پسند نہیں کریں گے، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم اپنی خالہ کے ساتھ کسی کے زنا کرنے کو پسند کرو گے؟ اس نے کہا: نہیں یا رسول اللہ! اللہ مجھے آپ پر قربان کرے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسی طرح لوگ اپنی خالاؤں کے ساتھ کسی کے زنا کرنے کو پسند نہیں کریں گے۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ اس پر رکھا اور یہ دعا فرمائی: اے اللہ اس کے گناہ کو بخش دے، اس کے دل کو پاک کر دے اور اس کی شرمگاہ کی حفاظت کر (کہ حرام میں مبتلا نہ ہو)۔ راوی فرماتے ہیں کہ اس کے بعد وہ نوجوان کسی چیز کی طرف التفات نہیں کرتا تھا (یعنی اسے اس گناہ سے نفرت ہوگئی اور کبھی اس نے اس کی طرف توجہ نہ کی)۔

ہمارے معلم اول نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت اور اصلاحی طریقے کے چند نمونے گزرے، ان کا آج کے حالات، ہمارے تعلیمی اداروں اور دینی درسگاہوں سے موازنہ کیا جائے تو پتہ چلے گا دونوں کے درمیان اس معاملے میں کوئی جوڑ ہی نہیں ہے، سرکاری اسکولوں اور عصری تعلیمی اداروں میں تو اب حالات بڑی حد تک بدل چکے ہیں کہ وہاں جسمانی سزا کی قانوناً اجازت نہیں ہے، اس لئے بڑی حد تک اس کا رواج ختم ہو چکا ہے لیکن دینی مدارس کی حالت اب بھی قابل رحم ہے۔ اور حفظ خانوں میں تو واقعی مار پیٹ کے بغیر تعلیم کا تصور ہی نہیں ہے، اس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ بہت سے بچے تعلیم چھوڑ دیتے ہیں بلکہ بہت سے لوگ تو دینی تعلیم بلکہ دین ہی سے متنفر اور بیزار ہو جاتے ہیں۔ ماہرین تعلیم فرماتے ہیں کہ استاذ کی پیشانی پر محبت کی تحریر ہونی چاہئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سابق صدر جمہوریۂ ہند جن کا شمار ملک کے ممتاز ماہرین تعلیم میں ہوتا ہے اور جن کی زندگی کا بڑا حصہ تعلیم وتربیت میں گزرا، انہوں نے استاذ کے بارے میں لکھا ہے کہ ''اس کی کتاب زندگی کے سرورق پر محبت لکھا ہو''۔ یہ گویا اسی حقیقت کی ترجمانی ہے جس کی وضاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں فرمائی ہے کہ استاذ طالب علم کے لئے بمنزلہ باپ کے ہے، نیاز فتح پوری نے ایک دینی مدرسہ اور حفظ خانہ کے بارے میں لکھا ہے:

دوسری چیز جس نے مجھے مذہنیت کی طرف سے بددل کیا اس مدرسے کا حفظ خانہ تھا۔ یہ بڑا اقدیم ادارہ تھا جس میں طلبہ کو قرآن حفظ کرایا جاتا تھا۔ حافظ قادر بخش ...... اس ادارے کے تنہا ذمہ دار تھے۔ اور جس بے دردی سے قرآن حفظ کراتے تھے اس کے خیال ہی سے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس حافظ خانہ میں جو واقعی عذاب خانہ تھا مجھے واسطہ نہیں پڑا، لیکن یہاں جو عذاب بچوں پر نازل ہوتا تھا اس سے میں کیا شہر کا ہر شخص واقف تھا۔ صبح سے دوپہر تک حافظ خانہ کی چیخ وپکار، حافظ قادر بخش کی ستم رانیاں اور بچوں کی آہ وبکا ہر وقت

کانوں میں پڑتی رہتی تھی۔ بچوں کے جسم بید کے ضربات سے لہولہان اور دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر ان کے سروں کو زخمی کرنا اس ظالم و بے رحم حافظ کا دستور تھا۔ مجھے اس سے سخت تکلیف پہنچتی تھی۔ کبھی کبھی میں والد صاحب سے کہہ دیا کرتا تھا کہ اگر قرآن کا حفظ کرانا اس حد تک ضروری ہے کہ بچے کا جسم و دماغ دونوں کو مجروح و بے کار کر دیا جائے تو قرآن سے انکار ہی بہتر ہے۔ بہر حال، مدرسہ اسلامیہ میں (عربی کے استاذ) مولانا نور محمد صاحب کی سخت گیری اور حد سے بڑھے ہوئے تقشف اور حافظ خانہ کے وجود نے جو بالکل ایک مذبح کی حیثیت رکھتا تھا میرے اندر مذہب کی طرف سے احتراز کی ایک خاص کیفیت پیدا کر دی تھی اور میں سوچا کرتا تھا کہ اگر اسلام یہی ذہنیت پیدا کرتا ہے تو یہ کوئی معقول مذہب نہیں (شخصیات اور واقعات جنہوں نے مجھے متاثر کیا)۔

اس دور کے ممتاز عالم دین ڈاکٹر یوسف قرضاوی لکھتے ہیں:

"بعض لوگ تعلیم کے سلسلے میں خاص طور پر چھوٹے بچوں کے لئے مار پیٹ کا طریقہ اپناتے ہیں۔ آج کے ماہرین تربیت اس طریقے کو بالکل مسترد کرتے ہیں"۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ مار پیٹ بنیادی طور پر ممنوع ہونی چاہئے؛ کیونکہ وہ نرمی کے اصول کے خلاف ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے لئے نمونہ ہمارے معلم اول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ آپ کے خاص خادم حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ آپ نے اپنے ہاتھ سے کبھی کسی کو نہیں مارا، نہ کسی عورت کو نہ کسی خادم کو نہ کسی جانور کو (بخاری)۔

اسلام میں بچوں پر ہاتھ اٹھانے کی بات صرف ایک جگہ ملتی ہے، وہ ہے بالغ ہونے سے پہلے نماز کی عادت ڈالنے کے سلسلے میں؛ تاکہ وہ بالغ ہونے کے بعد نماز کے عادی و پابند رہیں۔ حدیث میں آتا ہے: بچے جب سات برس کے ہو جائیں تو انہیں نماز کا حکم دو اور دس برس کے ہو جائیں (اور نماز نہ پڑھیں) تو مارو (ابوداؤد)۔ یہاں بالکل بچپن میں مارنے کی اجازت نہیں ہے بلکہ اس کی اجازت دس برس کی عمر ہو جانے کے بعد اور وہ بھی تین برسوں تک نماز کا شوق

دلانے اوراس کی عادت ڈالنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کے بعد ہی ہے۔ ایسی حالت میں مارنے کی اجازت کا مقصد اولاد کو یہ احساس دلانا ہے کہ باپ اس معاملے میں کتنا زیادہ سنجیدہ اور خواہشمند ہے اور خود نماز کی کتنی اہمیت ہے، جس سے غفلت نہیں برتی جا سکتی (تعلیم کی اہمیت سنت نبوی کی روشنی میں، مولفہ علامہ یوسف قرضاوی، ص:۱۴۱)۔

دین اسلام کی تعلیم سراسر یسر، سہولت، نرمی اور نصح و خیر خواہی پر مبنی ہے۔ ظلم وتشدد اور سختی کو ناپسند کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ارحم الراحمین ہے، اپنے آخری پیغمبر کو اللہ نے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا۔ آپ اپنے صحابہ کے ساتھ بڑے رحیم اور شفیق تھے، ان کی معمولی سی تکلیف اور پریشانی بھی آپ کو گوارہ نہ تھی۔ ارشاد باری ہے: **لقد جاء کم رسول من أنفسکم عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم** (التوبۃ: ۱۲۷) تمہارے پاس ایک ایسے رسول تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس سے ہیں، جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے، جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں، ایمان والوں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں۔

اور دوسری جگہ آپ کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا:

فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لانفضوا من حولك (آل عمران ر ۱۵۹) اللہ تعالیٰ کی رحمت کے باعث آپ ان پر نرم دل ہیں، اور اگر آپ بد زبان اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے چھٹ جاتے۔

عرب کی ناخواندہ اور جہالت اور گمراہی میں ڈوبی ہوئی قوم کی اصلاح و ہدایت اور تعلیم و تربیت کے میدان میں آپ کو یہ زبردست کامیابی اسی لئے حاصل ہوئی کہ اللہ کی توفیق اور اس کے فضل و کرم سے آپ ان کے لئے بالکل نرم ہو گئے تھے کہ لوگوں کا آپ سے دین واخلاق سیکھنا آسان ہو گیا۔ ورنہ اگر آپ سنگ دل، تند مزاج اور بداخلاق ہوتے تو لوگوں کا سارا مجمع

منتشر ہو جاتا اور فیضیاب نہ ہو سکتا۔ یہی شان ہر استاذ کی ہونی چاہئے کہ طلبہ ان کے نرم رویے، حسن سلوک اور بلند اخلاق کے گرویدہ ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو بھی نرمی ہی کی تعلیم دی: علموا ویسروا ولاتعسروا وبشروا ولاتنفروا (مسند احمد) علم سکھاؤ، آسانی کا معاملہ کرو، دشواری پیدا نہ کرو، بشارت سناؤ اور لوگوں کو متنفر نہ کرو۔

یہ حدیث تعلیم ہی سے متعلق ہے۔ اس میں تعلیم کی راہ میں نرمی برتنے اور دل آزاری واہانت کا سلوک کرنے سے منع فرمایا گیا ہے؛ لیکن اس سے زندگی کے دیگر امور میں بھی یہی ہدایت ملتی ہے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

یا عائشة. إن الله رفيق يحبُّ الرفق، ويعطي على الرفق مالايعطي على العنف (مسلم) اے عائشہ! اللہ تعالیٰ نرم خو ہے، نرم خوئی کو پسند کرتا ہے، اور نرم خوئی پر وہ کچھ عطا فرماتا ہے جو سختی اور درشتی پر نہیں عطا کرتا۔ (پتہ چلا کہ نرمی سے وہ کام بن جاتا ہے جو سختی سے نہیں بنتا)۔

اب اگر ہمارے مدارس میں طلبہ کے ساتھ توہین آمیز سلوک، ظالمانہ برتاؤ، حد سے زیادہ زدوکوب ہوتا ہے اور ہمیشہ چھڑی اور ڈنڈے کا استعمال ہوتا ہے تو یہ چیز شریعت کے مزاج سے میل نہیں کھاتی۔ قرآن کریم میں جہاں نافرمان بیوی کی تادیب کے شرعی اصول بیان کئے گئے ہیں وہاں ترتیب وار تین تدابیر اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، زبانی فہمائش اور پندونصیحت، وقتی طور پر ترک تعلق اور آخری مرحلے میں جبکہ پہلی دونوں تدبیریں ناکام ہو جائیں، ہلکی سرزنش اور جسمانی سزا کی اجازت دی گئی ہے۔ لیکن اس کی حد بندی کر دی گئی ہے۔ مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے کہ یہ مار مسواک یا رومال وغیرہ سے ہو محض تنبیہ کے واسطے، توہین اور ایذارسانی مقصود نہ ہو، ضرب مبرح جس کی وجہ سے جسم پر نشانات ابھر آئیں اس کی اجازت کسی

حال میں نہیں ہے۔ چہرہ پر مارنے کو سختی سے منع کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ تم میں سے شریف لوگ ایسا نہیں کریں گے یعنی وہ مار کی سزا سے بچیں گے۔

ان واضح ہدایات اور نبوی تعلیمات کی روشنی میں بچوں کے ساتھ اس ظلم وتشدد، ذلت آمیز سلوک اور بے رحمانہ زدوکوب کا کوئی شرعی، قانونی اور اخلاقی جواز نہیں نکلتا جس کا تذکرہ نیاز فتح پوری نے کیا ہے۔ اور یہ کوئی فرضی داستان نہیں ہے، اس میں کچھ مبالغہ آرائی ہوسکتی ہے لیکن بڑی حد تک حقیقت کی ترجمانی ہے۔ بچپن سے مدارس ہی کے ماحول میں زندگی گزر رہی ہے، اپنی آنکھوں سے بہت کچھ دیکھا ہے اور تجربہ کیا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ہمارے مدارس میں جسمانی سزا کے سلسلے میں حد درجہ غلو پایا جاتا ہے۔ پہلے سرکاری اسکولوں میں بھی مار پیٹ کا رواج تھا؛ لیکن جب سے اسے قانوناً ممنوع قرار دیا گیا اس وقت سے آج تک اس میں بڑی کمی واقع ہو چکی ہے، لیکن ہمارے دینی مدارس ومکاتب کا حال زیادہ نہیں بدلا ہے۔ اور درجہ حفظ میں تو واقعی بغیر زدوکوب کے تعلیم کا تصور ہی نہیں ہے۔ طالب علمی ہی کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ درجہ حفظ کے ایک نہایت ذہین طالب علم کی ایسی سخت پٹائی ہوئی کہ بددل ہوکر وہ بھاگ گیا اور مدرسے کی تعلیم چھوڑ کر اسکول میں نام لکھالیا۔ ایک طالب کو استاذ نے اتنی زور سے کان پر طمانچہ مارا کہ اس کی قوت شنوائی متاثر ہوگئی، وہ کہتا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ کان میں ہمیشہ ڈھول بج رہا ہے۔ سال گذشتہ ایک سفر کے دوران متعدد مدارس میں بھی جانے کا اتفاق ہوا، ایک حفظ خانے میں دیکھا کہ استاذ طالب علم کو بری طرح چہرے پر بار بار مار رہے ہیں جبکہ چہرے پر مارنے کی صریح ممانعت موجود ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ نمونہ کے طور پر ہمارے سامنے ہے۔ نماز میں بولنا، تھوک جھونک کرنا، مسجد میں پیشاب کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زنا جیسی بے حیائی کی اجازت چاہنا کتنے سنگین جرائم ہیں۔ اگر آج کوئی نوجوان ایسی غلطی کا ارتکاب کرے تو نہ صرف یہ کہ لوگ اسے ڈانٹ ڈپٹ کریں بلکہ مار پیٹ کر مجلس سے نکال دیں گے۔ لیکن رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر نہ غیظ وغضب کا اظہار کیا، نہ ڈانٹ ڈپٹ کیا بلکہ قریب بلا کر نرمی اور خیر خواہی کے ساتھ انہیں سمجھایا بجھایا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی اصلاح ہوگئی، وہ نہ صرف اپنی غلطی سے باز آئے بلکہ انہیں ان گناہوں سے نفرت ہوگئی اور پھر انہوں نے کبھی اس کی طرف رخ نہیں کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے عاشق اور گرویدہ ہوئے کہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ جیسا معلم نہ آپ سے پہلے دیکھا نہ آپ کے بعد۔ غزوۂ احد کے موقع پر کھائی پر مقرر اصحاب کی غلطی کی بنا پر جیتی ہوئی لڑائی شکست میں تبدیل ہوگئی، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوئے، دندان مبارک شہید ہوا؛ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کوئی سرزنش نہیں فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے بھی وحی کے ذریعہ آپ کو عفو ودرگزر کی تلقین فرمائی، **فاعف عنهم واستغفر لهم وشاورهم في الأمر** (آل عمران/۱۵۹)۔

طالب علم اگر تعلیم کے سلسلے میں غفلت اور لاپرواہی برتے یا کسی سخت جرم کا مرتکب ہو تو زبانی فہمائش سے کام لینا چاہئے، تنہائی میں بلا کر اگر اسے سمجھایا جائے تو یہ طریقہ زیادہ مفید اور کارگر ہے، اور اصلاح کی زیادہ توقع ہے۔ اگر اس سے کام نہ چلے تو ہلکی سرزنش کی اجازت ہوسکتی ہے لیکن اس سلسلے میں درج ذیل ہدایات ملحوظ رکھی جائیں:

۱- جسم کے نازک مقامات چہرہ اور سر وغیرہ پر نہ مارا جائے کہ سر اکثر حواس کا مرکز ہے، اور اس سے حواس کے متاثر ہونے کا خطرہ ہے۔

۲- مار پیٹ ایسی سخت نہ ہو جو ضرب مبرح کے دائرہ میں آتی ہے یعنی جسم پر نشانات کا ابھر آنا، بچے کا لہولہان ہوجانا یا کسی عضو کا معطل ہوجانا وغیرہ۔

۳- مار پیٹ غصے اور اشتعال کی حالت میں نہ ہو کہ یہ ایک غیر معتدل حالت سے ہوتی ہے اور اس میں زیادتی کا سرزد ہونا امر غالب ہے۔

۴- سزا انتقامی جذبے سے نہ ہو۔ اس سلسلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واقعہ کو

پیش نظر رکھا جائے۔

۵-کسی سامان کے تلف ہو جانے کے نتیجے میں سزا نہ دی جائے کہ برتن کے ٹوٹنے اور سامان ضائع ہو جانے پر عورتوں کو اور خادموں کو زدوکوب کرنے کی ممانعت وارد ہے: **لاتضربوا إماء الله على كسر الأواني فإن لها آجالا كآجالكم۔**

۶-سزا کے سلسلے میں ہمیں دوسرے تعلیمی اداروں سے زیادہ محتاط ہونا چاہئے تا کہ دین اور علماء دین سے بدگمانی نہ ہو اور دین سے نفرت اور دوری پیدا نہ ہو۔

۷-سزا کے اصول مرتب کرنے میں خود طلبہ سے مشورہ کیا جائے اور رائے لی جائے تا کہ سزا کا تحمل آسان ہو ورنہ بغاوت کا خطرہ ہے۔

۸-سزا کے ساتھ طلبہ کی ہمت افزائی کے لئے انعامات بھی ہوں، ورنہ صرف سزا سے بگاڑ کا پیدا ہونا یقینی ہے۔

☆☆☆

عصری اور علوم اسلامیہ کو ایک نئے تعلیمی انقلاب سے ہمکنار کرنے کی فوری ضرورت

پروفیسر احمد سجاد☆

ایک ایسے عہد میں جب اضافۂ آبادی کے ساتھ سائنس وٹکنالوجی، میڈیا اور ابلاغی ذرائع نے تعلیم وتعلم اور درس وتدریس کے میدانوں میں بھی ایک انقلاب برپا کر دیا ہے اور ہر قسم کے دینی و دنیوی علوم وفنون کے حصول کو سہل ترین بنا کر علمی معاشرہ کی تشکیل شروع کر دی ہے۔ امت مسلمہ کی روایتی سوچ اور اپنی تعلیمی وتہذیبی اور معاشی پسماندگی کا ماتم ومرثیہ انتہائی حیرت انگیز اور المناک ہے۔

بیسویں صدی کے آواخر سے علمی دھماکے (Knowledge Explosion) کے نتیجے میں موجودہ عالمی معاشرہ تیزی سے مندرجہ ذیل چار خصوصیات کا حامل بنتا جارہا ہے۔

۱- علمی معاشر (Knowledge Based Society)

۲- تعلیمی عالمگیری (Internationalization of Education)

۳- تعلیم سب کے لیے (Education for all)

۴- تا حیات حصول تعلیم کی سہولیات (Life long Education)

اس صورت حال نے درس وتدریس کے میدان میں ذیل کے تین مزید انقلاب انگیز

☆ رانچی، جھارکھنڈ

اقدامات کیے ہیں:

۱- فاصلاتی تعلیم (Distanace Education)

۲- آن لائن تعلیم (Online Education)

۳- پیشہ ورانہ و ہنرمندانہ تعلیم و تربیت (Professional & Vocational Education)

چنانچہ اب علم نہ صرف ہمارے دروازوں پر دستک (Knowledge at our door step) دے رہا ہے۔ بلکہ معلومات کا خزانہ ہماری انگلیوں کے اشاروں پر (Information at our finger tips) ہمارے سامنے ڈھیر ہونے کو تیار ہے۔ اس لیے ملک گیر ہی نہیں عالمی کلاس روم (World wide Class Room) کے وجود نے حقیقی یونیورسٹی (Virtual University) کو عملاً قائم کر دیا ہے۔ آج عالمی پیمانے پر تقریباً بیس کروڑ سے زائد طلبہ ان جدید طریقہ ہائے تعلیم سے جڑ کے ہر قسم کے تکنیکی وغیرہ تکنیکی علوم وفنون کو اپنی ضروریات وخواہشات اور حسب موقع وسہولت حاصل کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں تقریباً تین کروڑ طلبہ ان جدید طریقوں سے مستفید ہو رہے ہیں۔

اس تعلیمی مناظر میں امت مسلمہ کے مندرجہ ذیل تعلیمی مسائل پر از سر نو غور وفکر اور لائحہ عمل کے ترکیب وتشکیل کی ضرورت ہے۔

(الف) امت مسلمہ کو صدفی صد خواندہ وبا روزگار بنانا۔

(ب) علوم اسلامیہ کو فاصلاتی اور آن لائن نظام تعلیم سے جوڑ کر عالمی بنانا۔

(ج) علوم وفنون کو اسلامیانا (Islamiazation of knowledge)

(الف) امت مسلمہ کو صدفی صد خواندہ اور باروزگار بنانا۔

بیشتر مغربی ممالک اس نشانہ کو پورا کر کے دیگر ممالک تک اپنی خواندگی اور اقتصادی

مشن کو آؤٹ سورسنگ وغیرہ کے ذریعے اپنے دست وبازو مضبوط کرتے جارہے ہیں۔ ہندوستان میں سرو شکچھا ابھیان (تعلیم سب کے لیے-SSA) پر حکومت ہند اربوں کھربوں خرچ کررہی ہے جس سے ملت اسلامیہ کو بھی مستفید ہونے کی ضرورت ہے نیز اپنے تشکیل کردہ درسیات ونصابیات کو فوقانیہ/ مڈل/ میٹرک/ انٹر تک سی بی ایس ای معیار کے لحاظ سے مرتب کرکے نافذ العمل کرنا چاہئے۔ فوری طور پر مدارس اسلامیہ اور مسلم اسکولوں میں NIOS (National Institute of Open Schooling) کے اسٹڈی سنٹر کے اکیڈمک اور فنی درسیات کولاگو کرنا چاہئے تاکہ صد فیصد خواندگی کے ساتھ امت مسلمہ کی نئی نسل باروزگار بھی ہوسکے۔

اس سے آگے کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (MANUU)، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (IGNOU) اور پنجاب ٹکنیکل یونیورسٹی (PTU) وغیرہ سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

(ب) علوم اسلامیہ کو فاصلاتی اور آن لائن نظام تعلیم سے جوڑ کر ملکی وعالمی بنانا

ان دنوں دشمنانِ اسلام نے قرآن، سیرت، علوم اسلامیہ، اسلامی تہذیب وتمدن اور مسلمانوں کے خلاف جو عالمی جنگ چھیڑ رکھی ہے اس کا عین تقاضا یہ ہے کہ امت مسلمہ دینی اور دنیوی دونوں طرح کے علوم وفنون کے حصول اور ان کی توسیع میں تینوں طریقہ ہائے تعلیم یعنی روایتی، فاصلاتی اور آن لائن تعلیمی نظام کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیں۔

تیزی سے بڑھتی ہوئی دنیا کی آبادی اور وسعت پذیر علوم وفنون کی وجہ سے یہ ممکن بھی نہیں ہے کہ ہر جگہ کروڑوں کی عمارتیں کھڑی کرکے حال و مستقبل کی تمام نسلوں کو تعلیم یافتہ اور ہنرمند بنایا جاسکے۔ اسلام اور قرآن پاک صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ ہدی اللناس کی حیثیت سے پوری انسانیت کو مخاطب کرتا ہے لہٰذا مختلف ممالک کے مسلم ماہرین تعلیم پہلے اپنے اپنے ملکوں کے احوال وظروف کے پیش نظر دینی علوم کو فاصلاتی اور آن لائن نظام تعلیم سے جوڑیں

پھر ایک مشترکہ عالمی اسلامی علوم کے درسیات کی ترتیب بھی آسان ہو جائے گی اس سلسلے میں ماہ دو ماہ کے شارٹ کورس سے لے کر سال دو سال سے چار سال تک کے تفصیلی نصابیات کا بھی خاکہ بنایا جاسکتا ہے اس ضمن میں ذیل کے چاروں مسائل پر ورک شاپ سمینار میں ماہرین کو اس خاکے میں عملی رنگ بھرنا ہوگا۔

(۱) اغراض ومقاصد کی تشکیل (Policy Formation)

(۲) نظم وانصرام (Administration)

(۳) ساز وسامان کی فراہمی (Infrastructure Development)

(۴) نصاب سازی (Formulation of different courses)

ان مسائل کے حل کے ساتھ ہی ذیل کے اسلامی کورسیز کی تشکیل کا مرحلہ آسان ہوسکتا ہے۔

(۱) قرآن فہمی کے لیے عربی زبان دانی کا آسان کورس

(۲) عربی بول چال (Functional Arabic)

(۳) درسیات حدیث مختصر المیعاد/طویل المیعاد (سالانہ یا دوسالہ)

(۴) درسیات فقہ۔ مختصر/طویل المیعاد (سالانہ یا دوسالہ)

(۵) درسیات دعوت اسلامی۔ مختصر/طویل المیعاد (سالانہ یا دوسالہ)

(۶) درسیات سیرت پاک۔ مختصر/طویل المیعاد (سالانہ یا دوسالہ)

(۷) اردو زبان دانی۔ ششماہی درسیات

(۸) تاریخ اسلام۔ ششماہی درسیات

(۹) تاریخ وتہذیب ہند۔ ششماہی درسیات

(۱۰) بطرز (SSA) صد فیصد خواندگی کا آسان ششماہی یا سالانہ کورس

(۱۱) ترک تعلیم کرنے والوں کے لیے مڈل اور میٹرک کا نصاب بطرز NIOS اوران کے اسٹڈی سنٹرز کا قیام

(۱۲) تعلیم بالغان کی اسلامی بنیادوں کے ساتھ اردو اور ہندی کی ششماہی درسیات وغیرہ وغیرہ۔

فاصلاتی تعلیم کی درسیات چونکہ خودآموزی (Self Learning) کی بنیاد پر ترتیب دی جاتی ہے اس لیے اس کے تکنیکی اور دیگر مسائل پر غور وفکر سے پہلے مندرجہ ذیل اقدامات برائے مشاورت اور ذہن سازی بے حد ضروری ہیں۔

(۱) ہم خیال و ہم فکر علماء، دانشوران اور ذمہ داران مدارس کے ساتھ اس سلسلے کے مختلف مسائل پر غور وخوض کے لیے سمینار و سمپوزیم اور ورک شاپ کا انعقاد۔

(۲) مذکورہ بالا چاروں تکنیکی مسائل پر غور اور لائحہ عمل کی تیاری کے لیے ان مسائل کے ماہرین کے درمیان تبادلۂ خیال کی نشستوں کا انعقاد۔

(۳) بعض قائم شدہ مدارس اور مسلم اسکولوں میں NIOS کے اکیڈمک + ووکیشنل اسٹڈی سنٹر کے قیام پر غور وخوض۔

بعض مسلم ملکوں میں اور ہندوستان میں بھی اس جانب جزوی اقدامات کیے گئے ہیں مگر انہیں علوم اسلامیہ کو فاصلاتی تعلیم سے جوڑنے کے لیے ابھی میلوں آگے جانا ہوگا۔ اس جانب عملی اقدامات کرنے میں ہندوستان دیگر مسلم ممالک سے نسبتاً بہتر مواقع کا حامل ہے جس کے دو اسباب بالکل واضح ہیں۔ اولاً یہ کہ ہندوستان میں علوم اسلامیہ کی نشوونما اور فروغ وارتقا کی ایک عظیم روایت اور تاریخ ہے۔ دوم تقریباً تمام مسلم ملکوں کے مقابلے میں ہندوستان نے انفارمیشن ٹکنالوجی اور ان جدید طریقہ ہائے تعلیم کا زیادہ عملی تجربہ کیا ہے اس سلسلے کی تکنیکی سہولتیں مسلم ملکوں سے زیادہ یہاں ہندوستان میں دستیاب ہیں۔ یہاں ویڈیو آن ڈیمانڈ کے علاوہ گیان

درشن (G.D.) کے ۴۔ ۴ ٹی وی چینل ۲۴ گھنٹے تعلیمی نشریات پیش کرتے رہتے ہیں۔ ان پر مستزاد ایف، ایم ریڈیو کی تعلیمی نشریات کا سلسلہ بھی قائم ہے۔ لہٰذا ''مانو'' اگنو، ان. آئی. او. ایس. ہمدرد اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے مسلم ماہرین فاصلاتی و آن لائن تعلیمی نظام سے استفادہ کر کے مدارس اسلامیہ ہند ساری دنیا کے مدارس اسلامیہ کے سامنے ایک عمدہ اور عملی نمونہ پیش کر سکتے ہیں شرط صرف منصوبہ سازی اور عمل آوری کا ہے۔

(ج) علوم وفنون کو اسلامیانہ (Islamization of Knowledge)

اس ضمن میں پوری امت مسلمہ پر پوری تین سو سالہ سائنسی پسماندگی کا قرض اتار کر دنیا کی ترقی یافتہ قوموں سے بھی آگے بڑھنے کا عمل ہے۔ دوم جملہ الحادی علوم وفنون کو قرآن وسنت کی بنیاد پر ''مسلمان'' بنانا ہے۔ آخر کیا بات ہے کہ چند صدیوں پیشتر انہیں مدارس اسلامیہ سے الجبرا کا موجد محمد بن خوارزمی ابھرا، نصیر الدین نے سب سے پہلے علم مثلث (Trigonometery) ایجاد کی۔ یہیں سے بصریات کا امام ابو الہیثم نکلا ابوبکر رازی نے مادہ، حرکت، مکان وزمان اور مناظر ومرایا پر کتابیں لکھیں، ابو یوسف یعقوب الکندی نے موجوں (Tides) کی جانکاری فراہم کی۔ جابر بن حیان کو دنیائے سائنس میں بابائے کیمیا (Father of Chemistry) کہا گیا۔ ابن بیطار کو سولہویں صدی میں امام علم نباتات قرار دیا گیا۔ الدمیری نے ''حیاۃ الحیوان'' لکھنے کا کارنامہ انجام دیا۔ الفرغانی نے فلکیات کے قیمتی مشاہدات پیش کیے، البتانی نے سورج کے گرد مدار ارضی (Orbit) کو گول نہیں بیضاوی ثابت کیا۔ البیرونی ۱۸ قیمتی دھاتوں کے اوزان مخصوصہ (Specific Gravity) دریافت کیے۔ ابن سینا کی تاریخ ساز کتاب ''القانون فی الطب'' کو طب کا بائبل کہا گیا ہے۔ رازی نے سب سے پہلے چیچک اور خسرے پر نہایت گراں قدر تحقیق پیش کی۔ ابو القاسم الزہراوی کو بابائے سرجن کہا گیا۔ ابو عبد اللہ محمد ادریسی جغرافیائی علم اور نقشہ نویسی میں عہد وسطیٰ کا امام قرار دیا گیا۔ ابو جعفر محمد نے کیمیاوی ترازو (Chemical Balance) ابو الحسن

نے دوربین اور فرغانی نے دریا کی طغیانی ناپنے کا آلہ اور دھوپ گھڑی ایجاد کی۔ یوں ہنری پرمنے (Henry Pirmne) کے لفظوں میں ''اسلام نے کرۂ ارض کی صورت ہی بدل ڈالی'' قرآنی بصیرت نے مسلم سائنسدانوں کو اس عظیم ترین سائنسی صداقت کا شعور بخشا کہ قدیم کلاسیکی سائنس جو لنگڑی اور محض استقراری (Inductive) منطق کے ایک پاؤں پر اچک اچک کے بمشکل چل رہی تھی مسلمانوں نے استخراجی (Deductive) منطق کے ساتھ ہی ساتھ سائنس کو اقرأ باسم ربک الذی کی ہدایت کے مطابق خدا پرست بنا کر اسے دو پاؤں اور چھوؤں سمتوں کی تجرباتی باریک بینی بھی عطا کر دی۔

یہ تو پدرم سلطان بود والی باتیں تھیں آج کی تقابلی صورت حال میں اپنی پستی کا حد سے گزرنے پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے کل ۵۷ مسلم ممالک میں یونیورسٹیوں کی جملہ تعداد ۵۰۰ ہے جب کہ صرف ایک ملک امریکہ میں ۵۷۵۸ یونیورسٹیاں ہیں۔ دنیا بھر کی یونیورسٹیوں کی رینکنگ کے مطابق دنیا کی ۵۰۰ سرفہرست یونیورسٹیوں میں مسلم ممالک کی ایک بھی یونیورسٹی نہیں ہے جو انتہائی مایوس کن اور شرمناک ہے UNDP کی طرف سے اکٹھا کیے گئے اعداد و شمار کے مطابق عیسائی ممالک کی شرح خواندگی %۹۰ ہے ان میں سے ۱۵ ممالک میں ۱۰۰ فی صد شرح خواندگی ہے اس کے برعکس مسلم ممالک کی اوسط شرح خواندگی %۴۰ ہے۔ دنیا بھر کے ایک بھی مسلم ملک میں %۱۰۰ شرح خواندگی نہیں۔ یورپی ممالک کی %۴۰ آبادی اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہے مسلم ممالک میں یہ تعداد %۲ سے زائد نہیں۔ مسلم ممالک کے ہر دس لاکھ میں سے ۲۳۰ سائنسداں بنتے ہیں اس کے برعکس امریکہ کے ہر دس لاکھ میں سے ۴۰۰۰ اور جاپان میں ۵۰۰۰ سائنسداں بنتے ہیں۔

تحقیق کے میدان میں بھی یہودی اور عیسائی مسلمانوں سے کوسوں آگے ہیں۔ پوری عرب دنیا میں کل وقتی عرب محققوں کی تعداد صرف ۳۵۰۰۰ ہے یعنی دس لاکھ عربوں میں ۵۰ ٹکنیشین، اس کے برعکس ہر دس لاکھ یہودی عیسائی افراد میں ۱۰۰۰ ٹکنیشین ہیں۔ مسلم ملکوں کے پاس بحیثیت مجموعی انسانی اور مادی وسائل کی کوئی کمی نہیں پھر بھی مسلم ممالک میں (GDP)

کل آمدنی کا صرف 0.2% تحقیق وترقی پر خرچ ہوتا ہے مگر مغربی ممالک ۵% خرچ کرتے ہیں۔ برطانیہ کے ہر دس لاکھ افراد پر ۲۰۰۰ کی تعداد میں کتب کی اشاعت ہوتی ہے۔ مصر میں صرف ۲۰ کتب۔ یوں زندگی کے ہر میدان میں مسلمان عیسائیوں سے پیچھے ہیں۔ تمام ۵۷ مسلم ممالک کی GDP تین کھرب ڈالر ہے جبکہ صرف امریکہ کی GDP ۱۲ کھرب، جاپان کی ۴ کھرب ۸۰ارب ڈالر، جرمنی کی ۲ کھرب ۴۰ارب ڈالر ہے۔

آبادی اور وسائل کے اعتبار سے یہودی مسلمان سے ۱۰۰ درجے کم ہیں اس کے باوجود یہودی مسلمانوں سے ۱۰۰ گنا زیادہ طاقتور ہیں اور دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ بیسویں صدی یہودی صدی تھی، ایٹم بم کا موجود آئن اسٹائن بابائے نفسیات سگمنڈ فرائڈ اور بانئ کمیونزم کارل مارکس تینوں یہودی تھے۔ پولیو ویکسین پیٹا ٹائٹس ویکسین کے موجد جنسی مرض آتشک، اعصابی عدم توازن، ہر قسم کے فوبیاز اور ڈپریشن (برناڈ کیٹز)، انسانی آنکھوں کا محقق (نوبل یافتہ سٹانلے کوہن) گردوں کی صفائی کی مشین ڈائیلاسس کا موجد (ولیم کولف) سب کے سب یہودی تھے۔ ان کے علاوہ پہلی مائیکرو پروسیسنگ چپس کا موجد نیوکلیر چین ری ایکٹر آپٹیکل، فائبر کیبل ٹریفک سگنل، اسٹین لیس اسٹیل (Stainless steel) ٹیلیفون، مائکروفون، ویڈیو ٹیپ ریکارڈ، ساؤنڈ موویز وغیرہ کے موجود بھی یہودی تھے۔ حد تو یہ ہے کہ اولمپک گیمز میں سونے کے سات تمغوں کی جیت کا ورلڈ ریکارڈ بنانے والا مارک پٹز اور مسلسل تین بار سونے کے تمغے جیتنے والے بھی یہودی (لینی کر لیز یلبرگ اور بورس بیکر) تھے۔ پچھلے ایک سو پانچ برسوں میں یہودیوں نے ۱۸۰ نوبل پرائز انعام جیتے جبکہ ایک ارب سے زائد آبادی والی مسلم قوم نے کل ۴ نوبل پرائز جیتے (ڈاکٹر عبد السلام، مسز عبادی، نجیب محفوظ، محمد یونس)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی دنیا نے پچھلی کئی صدیوں میں علمی وسائنسی انقلاب برپا کر دیا ہے مگر اس علمی دھماکے نے جس بے لگام انداز میں نہایت سرعت کے ساتھ ترقی کے نام پر پوری انسانیت کو بے سمت کر کے بیابان مرگ میں پہونچا دیا ہے۔ اس نے پوری انسانیت بلکہ

پورے کرۂ ارض کو شدید ترین خطرات سے دوچار کر دیا ہے کیونکہ مغرب کی الحاد زدہ اور مادہ پرست سائنس نے انسانی اور کائناتی صلاح وفلاح کے لیے اسلام کی عطا سائنس کی غایتی (Purpose) بنیاد کو یکسر نظر انداز کر کے صرف علت (Cause) اور معلول (Effect) کو ہی سب کچھ سمجھ رکھا ہے جبکہ کائنات کی ہر شئ کی بقا کے لیے تینوں بنیادیں لازمی ہیں لہٰذا انسانی وکائناتی تحفظ وارتقا کے لیے ضروری ہے کہ امت مسلمہ سارے جہان میں اقرأ باسم ربک الذی کی وجہ سے نظریاتی سپر پاور تو ضرور ہے اسے سائنسی اور مادی اعتبار سے بھی سائنسی سپر پاور بننا ہوگا۔ اسی پر خود مسلمانوں اور سارے انسانوں کے محفوظ مستقبل کا انحصار ہے واعدوا لھم ما استعطتم کا بھی تقاضا ہے اور تسخیر کائنات کی ۷۵۶ آیات قرآنی کا بھی یہی مطالبہ ہے۔ ورنہ افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض کا طعنہ ہم پر بھی صادق آئے گا۔

اس لیے امت مسلمہ کو الحادی علوم وفنون کو مسلمان بنانے کے حالیہ عمل کو تیز تر کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں اسماعیل راجی الفاروقی شہید، ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم، مولانا شہاب الدین ندوی، ضیاء الدین سردار، حسین نصر، پروفیسر سید محمد سلیم کی کاوشوں کو جدید سائنسی وتعلیمی چیلنجوں کے پیش نظر انہیں مربوط ومدلل بنا کے آگے بڑھانا ہوگا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد اقبال، ابوالاعلیٰ مودودی، علامہ شبلی، مولانا علی میاں اور مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ نے بھی اپنی بعض وقیع تصانیف میں جو اشارے کیے ہیں ان کی توضیح وتوسیع کی بھی ضرورت ہے تمام مسلم ملکوں کی اہم یونیورسٹیوں اور دارالعلوم میں حسب استطاعت ایک شعبہ نظری وعلمی وسائنسی تحقیق وترقی کو جدید ترین معیار کے مطابق متشکل ومستحکم کیے بغیر ان الحادی علوم کو نہ تو مسلمان بنایا جاسکتا ہے نہ ہمارے مدارس اسلامیہ اور امت مسلمہ کو اصلی چیلنجوں کا جواب بنایا جاسکتا ہے۔ اقبال نے سچ کہا ہے کہ ۔

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

☆☆☆

مدارس اسلامیہ اور میڈیکل سائنس

ڈاکٹر فخر عالم (ریسرچ آفیسر) ☆

صحت و مرض کا مسئلہ براہ راست انسانی بدن سے جڑا ہونے کے باعث ہر دور میں بنیادی اور ترجیحی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ مگر گزشتہ کچھ دہائیوں سے اس مسئلہ نے عالمی اہمیت اختیار کرلی ہے اور عالمگیر نوعیت کا حامل بن گیا ہے۔ اس کے تدارک اور حل کی عالمی سطح پر کوششیں ہورہی ہیں۔ جس کے نتیجہ میں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن، ریڈ کراس اور یونیسف جیسے بین الاقوامی ادارے وجود میں آئے ہیں۔ ان اداروں کے قیام کا اصل مقصد ایک صحت مند عالمی سماج کی تشکیل ہے۔

دراصل عالمی سطح پر یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ صحت کا مطلوب حاصل کئے بغیر نہ تو انسان دنیاوی لذتوں سے لطف اندوز ہوسکتا ہے اور نہ وہ کلیدی کردار ادا کرنے کا اہل ہوسکتا ہے، جو کائنات کی اہم ترین مخلوق ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔

حسن صحت کی سوچ محض انسانی داعیہ نہیں بلکہ یہ خالق کائنات کے تخلیقی مطلوب کا بھی حصہ ہے۔ متعدد قرآنی آیات سے انسان اور کائنات کی تخلیق کے سلسلہ میں غایت اہتمام، کمال تزئین اور آرائش و زیبائش کے اشارے ملتے ہیں[1]۔ چونکہ انسان اس کائنات کا مرکزی کردار ہے اور اس کی خوبصورتی کا راز اس حسن صحت میں پنہاں ہے۔ اس لئے انسانوں کی صحت کے

☆ ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ

بغیر نہ تو خوبصورت دنیا آباد کرنے کے منصوبہ کی تکمیل ہوسکتی ہے۔ اور نہ ہی صحت مند سماج کا وجود عمل میں آسکتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام ادیان میں صحت و مرض کا بیان مذہبی تعلیمات کے حصہ کے طور پر ملتا ہے۔ اور علوم کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میڈیکل سائنس کا وجود مذہب کے بطن سے ہوا ہے اور تاریخ کے ابتدائی دور میں مذہبی پیشوا ہی طبی علوم کے علمبردار رہے ہیں [۲]۔ یونانی طب اور آیورویدکا شمار دنیا کی قدیم طبوں میں ہوتا ہے حضرت ادریسؑ اور برہما جی کو ان طبوں کا بانی خیال کیا جاتا ہے۔

اس واقعہ سے قطع نظر انسانوں کے ذہنی اور فکری ارتقاء کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ کرۂ ارض پر اپنے وجود کے ابتدائی ایام میں اس عہد کا انسان غذا اور پانی کی تلاش کے ساتھ ازالۂ مرض اور قیام صحت کے اسباب کی جستجو میں مصروف رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طبی علوم کا شمار، اولین سائنسی بازیافتوں میں ہوتا ہے۔ چونکہ یہ شعبۂ علم، انسان کی بنیادی ضرورتوں سے تعلق رکھتا ہے اس لئے آج تک اس کی اہمیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، بلکہ امتداد وقت کے ساتھ اضافہ ہی ہوا ہے۔

امراض وعلاج کے باب میں طویل تحقیقی تگ ودو کے بعد یہ بات محسوس کی گئی کہ صحت و مرض کی جنگ ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ ان تحقیقی تجربوں سے محققین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ صحت کا مطلوب حاصل کرنے کے لئے تحفظی تدابیر اور Prevention کے ضابطے زیادہ موثر ہیں، اس احساس کے بعد حفظان صحت کے پہلوؤں پر خاص توجہ مرکوز کی جارہی ہے۔ اور عوام میں اس کا شعور بیدار کرنے کے لئے تشہیر کے تمام وسائل بروئے کار لائے جارہے ہیں۔ اس ضمن میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اور ان کوششوں کے بڑے خوشگوار نتائج سامنے آرہے ہیں۔ مگر چونکہ ذرائع ابلاغ کی تشہیر کے نتائج، عارضی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ محسوس کیا گیا کہ سماج کے ہر طبقہ میں صحتی بیداری کی عام لہر پیدا کرنے اور صحت کے تئیں پائیدار عوامی شعور۔ بیدار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سماج کے افراد کی اس طرح ذہنی اور فکری تربیت کی جائے کہ یہ شعور ایک راسخ عقیدہ بن جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے

اسکولوں کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ اسکولوں کی تربیت کے ذہنوں پر بہت گہرے نقوش مرتب ہوئے ہیں۔ یہاں کی جانے والی تربیت کا فائدہ یہ ہے کہ آج جو بچے اسکولوں میں زیر تعلیم ہیں وہی ہمارے سماج کا مستقبل بنیں گے۔ لہٰذا ان کی ذہنی اور فکری تربیت سے حال اور مستقبل دونوں کی تربیت کا مطلوب حاصل ہونے کی امید ہے۔

اس وقت ہندوستان کی تمام عصری تعلیم گاہوں میں ہیلتھ ایجوکیشن کا انتظام ہے اور صحت کے موضوعات ان کے نصاب تعلیم کا لازمی حصہ ہیں۔ اور ابتدائی درجات ہی سے صحت و مرض کے مختلف عناوین کی تعلیم شروع کردی جاتی ہے اور یہ سلسلہ ہائی اسکول اور سینئر سیکنڈری تک قائم رہتا ہے۔ عصری اسکولوں میں زیر تعلیم طلبہ کو بارہویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے صحت و مرض اور ان کے اسباب و تدارک سے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچادی جاتی ہیں اور حفظان صحت اور قیام صحت سے متعلق بیشتر ضروری امور سے انہیں واقف کرادیا جاتا ہے۔ مثلاً ماحولیات سے بدن انسانی کا رشتہ، آلودگیوں کی مختلف اقسام اور ان کے اسباب و عوامل، تعدیہ کے ذرائع، متعدی امراض، ان کے روک تھام کی تدابیر، صحت بخش غذائیں، نقص تغذیہ سے پیدا ہونے والی بیماریاں، جنسی امراض اور حیاتیاتی سائنس کی نئی دریافتوں وغیرہ کے بارے میں انہیں اس قدر تعلیم دی جاتی ہے جو صحت کے تئیں ان کے شعور کو بیدار کرنے کے لئے ضروری ہے۔

اس جدید تعلیمی نظام سے صحت کے تئیں عوامی شعور بیدار کرنے میں بڑی مدد ملی ہے اور صحتی منظر نامہ میں اس کے بہت ہی مثبت اثرات محسوس کئے جا رہے ہیں اور بیداریٔ صحت کے تعلق سے اہم تبدیلیاں دیکھنے میں آرہی ہیں۔ مگر ہمارے ملک کی مسلم آبادی ان تبدیلیوں کے عمل سے بہت دور ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے ہم وطنوں کے مقابلہ میں مسلمانوں میں خواندگی کی شرح بہت کم ہے۔ تعلیم اور صحت کے درمیان گہرے رشتہ کے باعث، مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کے اثرات، مسلمانوں کی صحت پر بھی پڑے ہیں۔ اور مسلمان زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح صحتی معاملہ میں بھی پچھڑے پن کا شکار ہے۔

مسلمانوں میں تعلیم کا تناسب کم ہونے کے ساتھ ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے میں عصری درسگاہوں کے بجائے مدرسوں کی تعلیم کا رواج ہے، جہاں تعلیم کا تمام زور عقائد اور مذہبیات پر ہوتا ہے۔ چونکہ مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد تعلیم کے باب میں صرف مدرسوں پر منحصر ہے جہاں تعلیم کے محدود تصور کے باعث ایسے فارغین نہیں پیدا ہو رہے ہیں، جو زمانے کے اسلوب اور قدروں سے بھی واقف ہوتے۔

مدارس کی وجہ سے مسلمانوں میں تعلیم تو آئی اور خواندگی کی شرح میں اضافہ بھی ہوا مگر تعلیم کا دائرہ صرف مذہب تک محدود رہنے کے باعث تعلیم کے باوجود مسلم معاشرہ زمانہ کی مثبت تبدیلیوں کے اثرات سے دور رہا۔ اور مسلمانوں کی سماجی پسماندگی کے ازالہ میں یہ تعلیم مفید ثابت نہیں ہو سکی اور تعلیم کے زیر اثر صحت کے میدان میں ان تبدیلیوں سے بھی مسلم معاشرہ دور رہا جن کا مشاہدہ دوسرے تعلیم یافتہ طبقوں میں ہوتا ہے۔

ان سچائیوں کے ساتھ یہ بھی ایک اہم واقعہ ہے کہ یہ دینی مدارس اسلامی ورثہ کے تحفظ و بقا اور نشر و اشاعت نیز لسانی تشخص اور تہذیبی اقدار کے احیاء اور فروغ میں اہم کردار ادا کرنے کے علاوہ قومی خواندگی مشن جیسے اہم ہدف کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ ان مدرسوں کا ایک اہم پہلو اور بھی ہے جس کا اعتراف بہت کم کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ لاکھوں ہندوستانیوں کو روزگار کے مواقع فراہم کر کے یہ مدارس ملک کو اقتصادی تعاون پیش کر رہے ہیں۔

ایک متوازن اور متبادل نظام تعلیم کے طور پر مدارس کی افادیت کو محسوس کرتے ہوئے، صوبائی اور مرکزی حکومتیں ان کی طرف متوجہ ہو رہی ہیں اور معاصر ہندوستان میں ایک مستقل تعلیمی نظام کی حیثیت سے فروغ دینے کے لئے مدرسوں کی تجدید کاری کا منصوبہ وضع کیا جا رہا ہے۔ مدارس اسلامیہ کے نصاب تعلیم کی اصلاح کی ضرورت محسوس کئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ مدارس کی تعلیم کا دائرہ صرف اسلامیات تک محدود رہنے کے سبب بہت سے سماجی اور عصری

داعیے نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ علوم ہماری سماجی ضرورتوں کا اہم حصہ ہیں اور چونکہ مذہب کا موضوع بھی انسانی سماج ہے۔ بایں ہمہ سماجی اور عصری علوم، دراصل مذہب کا توسیعی گوشہ ہیں۔ لہٰذا یہ محسوس کیا گیا کہ مدارس کے دائرے سے سماجی اور عصری رشتوں کو مربوط کر کے، ان کے کردار کو زیادہ وسیع بنایا جا سکتا ہے۔ اس طرح مدارس اسلامیہ مذہبی ضرورتوں کی تکمیل کے ساتھ دیگر قومی اور ملی تقاضوں کے پورا کرنے کے اہل ہو جائیں گے اور یہاں کے فارغین اسلامی تعلیمات کے ساتھ معاصر علوم سے بھی بہرہ مند ہوں گے۔ اور مذہبی فرائض کے ساتھ شہری اور سماجی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں عصری درسگاہوں کے فضلاء کے شانہ بہ شانہ ہوں گے۔

حکومت کے علاوہ بہت سے مسلم حلقوں کی طرف سے بھی مدرسوں کی تعلیم کو عصری اسلوب سے ہم آہنگ بنانے کی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ اور ارباب مدارس بھی اس پہلو پر غور کر رہے ہیں [۳، ۴]۔ مگر اب تک یہ مسئلہ غور و فکر کے دائرہ سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ اور چند متفرق مثالوں کے علاوہ اب تک کوئی ایسی نظیر سامنے نہیں آسکی ہے، جس سے مدرسوں کے نصاب تعلیم میں بدلاؤ کا اشارہ ملتا ہو۔ چاہے مسئلہ مدرسوں کے فارغین میں صحتی بیداری کا ہو یا پھر مدارس کے فضلاء کو عام قومی، سماجی اور سیاسی دھارے سے جوڑنے اور انہیں اقتصادی اور معاشی اعتبار سے مستحکم کرنے کا۔ یہ سارے داعیے مدارس کے روایتی نصاب میں تبدیلیوں کے متقاضی ہیں۔

اس وقت مدرسوں میں رائج نصاب تعلیم سے کسی حد تک قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم کا مقصود تو حاصل ہو رہا ہے۔ مگر مکمل طور پر اسلامی تعلیم کی ضرورتیں پوری کرنے سے یہ نصاب قاصر ہے۔ بلاشبہ یہ مضامین اسلامی تعلیمات کی اساس اور دینی تعلیم کا مقصود ہیں۔ اور ان مضامین کی تعلیم کے بغیر اسلامی تعلیم کا تصور ناقص ہے، مگر اسلام جو کہ ایک مکمل نظام حیات ہے، اس کا دائرہ عقائد کی اصلاح اور اخلاقی تعمیر کے ساتھ قومی و عصری داعیوں اور مسائل پر بھی محیط ہے۔ لہٰذا ذمہ داران مدارس کو یہ طے کرنا ہوگا کہ کیا مسلمانوں کی تعلیمی ضرورت، صرف مذہبی علوم

تک محدود ہے؟ کیا مدارس کی موجودہ تعلیم سے زندگی کے سارے شعبوں میں مذہبی رہنمائی کی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں؟ اور یہ سوال بھی بے حد اہم ہے کہ اس وقت ہمارے مدرسوں میں جس ڈھنگ کا نصاب رائج ہے کیا درسیات کا یہی اسلوب ماضی کے مدرسوں کا بھی تھا۔

ماضی میں رائج مدرسوں کے نصاب تعلیم کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے مدارس نے اسلامی علوم کے علاوہ اپنے عہد کی سماجی اور معاشرتی ضرورتوں کی تکمیل میں بھی نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ مثلاً عباسی حکومت کے زمانہ میں جب یونانی علوم وفنون کی یلغار کے نتیجہ میں الحاد اور بے دینی کا سیلاب امنڈ پڑا تھا اور مذہب میں شکوک اور اوہام کی وباء پھیل گئی تھی تو اسلامی علوم وآداب میں اصلاح کی ضرورت محسوس کی گئی اور مسلمانوں کے ایک گروہ نے یونانی علوم و فنون میں مہارت اور دسترس پیدا کر کے ان کا رد کیا تھا۔ امام غزالی نے ان علوم کو اپنے زمانہ کے نصاب میں اسی لئے داخل کیا تھا کہ علماء اسلام ان سے واقف ہو کر ان کے اثرات کا خاتمہ اور الحاد و بے دینی کا سدباب کر سکیں۔[5]

عصری داعیوں کے تناظر میں عہد سلطنت اور مغلیہ دور کے تعلیمی نصاب کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے مدرسوں میں منقولات کی تعلیم کا متوازی انتظام تھا۔ موجودہ دور کی اصطلاح میں یہ نصاب تعلیم، اسلامی اور عصری دونوں قسم کے علوم کا جامع تھا۔ عہد سلطنت کے مدرسوں میں مدرسہ فیروز شاہی (قیام ۱۳۵۲ء) اپنے عہد کی ایک ممتاز تعلیمی درسگاہ تھا۔ اس مدرسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے نصاب یا درسیات میں عقلی اور نقلی، دونوں علوم کے مضامین شامل تھے۔ یہاں اسلامی علوم مثلاً قرآن، حدیث اور فقہ کے علاوہ ادبیات، علم معانی و بلاغت، منطق و فلسفہ، علم کلام، علم تصوف، علم ہیئت و ریاضی، علم نظر، علم طبعی، علم الٰہیات، علم طب و خطاطی کی تعلیم دی جاتی تھی۔[6]

عہد فیروز شاہی کے حوالہ سے، نصاب تعلیم کی جو تفصیل ہم نے بیان کی ہے، اس میں

وہ تمام علوم شامل ہیں جو اس زمانہ تک منصۂ شہود پر آ چکے تھے اور اس عہد کا شاید ہی کوئی ایسا عصری علم ہو جو مدرسوں کے نصاب تعلیم میں شامل نہ ہو۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے الجزء اللطیف میں اپنی درسیات کی جو تفصیل لکھی ہے اس میں طب کی ایک اہم کتاب 'موجز القانون' کا بھی تذکرہ ہے۔

ملا نظام الدین کے مرتب کردہ نصاب کو ہندوستانی مدرسوں میں بڑی مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اور کسی قدر تبدیلیوں کے ساتھ آج بھی ہندوستان کی بہت سی اسلامی درسگاہوں میں یہ نصاب تعلیم رائج ہے۔ اصل درس نظامی میں اسلامیات کے ساتھ طب کی کتابیں بھی شامل تھیں، اس مگر بعد میں یہ نصاب سے خارج ہو گئیں۔

طبی تعلیم کے حوالہ سے یہ واقعہ بھی بے حد اہم ہے کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بہشتی زیور جو لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے مقصد سے لکھی گئی ہے اور اس کا شمار مسلم گھروں میں بکثرت پڑھی جانے والی کتابوں میں ہوتا ہے۔ تھانوی صاحب نے اس کتاب میں نسوانی زندگی سے متعلق تقریباً تمام ضروری شعبوں کا احاطہ کیا ہے۔ اس کتاب میں طب کا ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔

ان تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے عہد کے برعکس ماضی کی اسلامی درسگاہوں کے پیش نظر تعلیم کا وسیع تصور تھا، اس عہد کے نصاب تعلیم میں اسلامیات کو ترجیحی مضمون کی حیثیت بہر کیف حاصل تھی، مگر حسب ضرورت عصری علوم کی تعلیم کا انتظام تھا اور اس عہد کے جتنے علوم تھے تقریباً ہر مضمون کی بنیادی معلومات بقدر ضرورت طلبہ کو فراہم کر دی جاتی تھیں۔ حالانکہ بیسیوں صدی سے پہلے علوم کی اس قدر شاخیں نہیں تھیں لیکن اس عہد کے مروجہ علوم مثلاً طب، ریاضی وغیرہ نصاب تعلیم کا ضروری حصہ تھے۔ اس عہد کے اسلامی اداروں میں ان مضامین کی تعلیم کے دو مقاصد تھے۔ ایک مقصد یہ تھا کہ یہ مضامین سماجی ضرورتوں کا حصہ تھے، ان علوم کی تدریس کی ایک غایت یہ بھی تھی کہ یہ علوم اسلامی مضامین کی تفہیم میں معاون تھے، اور ان سے سماج کی مذہبی

رہنمائی کی بہت سے داعیے وابستہ تھے۔مگر رفتہ رفتہ مدرسوں کے نصاب تعلیم اور درسیات کے باب میں ارباب مدارس کے نظریہ میں بدلاؤ آیا اور بیسویں صدی کے نصف کے بعد مدرسوں کے نصاب سے ضروری معاصر علوم مثلاً طب وغیرہ خارج کردئے گئے۔اور مدرسوں کی تعلیم کے دائرے کو صرف بنیادی مضامین تک محدود کردیا گیا۔جب کہ مدرسوں سے طب کی تعلیم کا کتنا گہرا تعلق رہا ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے نصف اول کے فضلاء طبابت سے عملی رشتہ بھلے نہ رکھتے ہوں۔مگر طبی مبادیات کا علم انہیں ضرور رہتا تھا۔

مدارس کے نصاب تعلیم کے بارے میں اہل نظر کے خیالات مختلف ہو سکتے ہیں۔اور اسلامی درسگاہوں میں کس قسم کا نصاب رائج ہو اور مدرسوں کا منہج تعلیم کیا ہو۔اس باب میں اختلاف رائے کی گنجائش ہے، مگر اس واقعہ سے انکار ممکن نہیں کہ مدارس اسلامیہ آنحضور ﷺ کے لائے ہوئے دین کے علمبردار اور مبلغ ہیں لہٰذا اسلامی تعلیمات کے باب میں آنحضور ﷺ کے طرز عمل کو مثالی رہنما اور قابل تقلید نمونہ ہونا چاہیئے۔

تعلیمات نبوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عقائد کی اصلاح، ذہنی، روحانی اور اخلاقی تربیت کے علاوہ جسمانی صحت کی اہمیت پر اسلام کی خاص توجہ رہی ہے۔اس لئے کہ اسلام کو ایک ایسا معاشرہ مطلوب ہے جو صالح عقائد کے ساتھ اعلیٰ اخلاقی اقدار سے متصف ہو اور اس کے افراد جسمانی طور پر صحت مند اور توانا ہوں۔چنانچہ اسلامی تعلیمات میں افراد کی جسمانی صحت کو فضیلت و برتری کے معیار کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔اس سلسلہ میں آنحضور ﷺ کا بیان بے حد اہم ہے المومن القوی خیر و احب الی من المومن الضعیف و فی کل خیر[8] یہ بیان صحت کی ترغیب اور صحتی شعور کی بیداری کے حوالہ سے ایک اعلیٰ مثال ہے۔

احادیث کی کتب صحیحہ، تعلیمات نبوی کا اہم ماخذ ہیں۔ان احادیث کا ایک قابل شمار حصہ طبی تعلیمات پر مشتمل ہے۔جس میں حفظان صحت، علاج بالتدبیر، علاج بالغذاء اور علاج

الدواء کا تذکرہ ہے۔ ان بیانوں سے طبی سائنس کے بہت سے ایسے سنہرے اصول برآمد ہوتے ہیں جن کی روشنی میں ایک مکمل نظام طب قائم کیا جا سکتا ہے۔

علماء نے طبی موضوعات سے متعلق ان احادیث کو علاحدہ کتابی صورت میں جمع کر دیا ہے، اور یہ کتابیں طب نبوی کے نام سے اہل علم کے مطالعہ کا حصہ ہیں۔ طب نبوی پر کام کرنے والوں میں شمس الدین ذہبی، جلال الدین سیوطی، ابوالعباس جعفر مستغفری، ابوالحسن علی بن موسی رضا، ابوالقاسم نیشاپوری، محمد بن ابوبکر بن السنی، عبدالملک بن حبیب اندلسی، محمد بن عمر چغمنی، امین الدولہ بن تلمیذ شمس الدین محمد بن طولون الفقی اور علاء الدین کمال صفدی کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔[9]

طب نبوی کو ہندو پاک کے مصنفین نے بھی تحقیق و مطالعہ کا موضوع بنایا ہے۔ حکیم اکبر ارزانی، حکیم غلام امام اکبرآبادی، ڈاکٹر اقتدار فاروقی اور ڈاکٹر خالد غزنوی اس سلسلہ کے اہم نام ہیں۔

نبوی تعلیمات کے متنوع موضوعات کے تجزیہ اور طب نبوی کے تعلق سے درج، مذکورہ تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوی درسگاہ کے نصاب تعلیم میں صحت و مرض اور میڈیکل سائنس کو اہمیت کا درجہ حاصل تھا، مگر موجودہ عہد کے اسلامی مدارس، جو کہ تعلیمات نبوی کی اشاعت کے علم بردار ہیں اور نبوی تعلیم ان کا اصل مطمح نظر ہے، ان کے نصاب اور درسیات سے طبی تعلیم جیسے اہم موضوع کا حذف ہو جانا یقیناً باعث حیرت ہے۔

اسلامی مدرسوں کی درسیات میں قرآن، حدیث اور فقہ کے غلبہ کی تائید تو کی جا سکتی ہے لیکن معاصر علوم خصوصاً میڈیکل سائنس کی ضرورت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر نبوی درسگاہ اور ماضی کے مدرسوں کی طرح موجودہ مدارس کے نصاب میں طبی تعلیم کو شامل کر لیا جائے تو یہاں سے فارغ ہونے والے طلبہ صحت و مرض کی اہمیت سے واقف ہوں گے۔ اور اس

طرز تعلیم سے مسلمانوں میں حفظان صحت کا شعور بیدار کرنے میں مدد ملے گی۔ اور مسلمان
سماجی دھارے کا حصہ بن سکیں گے۔

طبی تعلیم کی ضرورت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ہمارے سماج میں علماء اور مدارس
فضلاء کو مذہبی رہنما اور ملی قائد سمجھا جاتا ہے۔ اور زندگی کے تمام شعبوں میں ان سے رہنمائی حا
کی جاتی ہے۔ لہذا مسئلوں کی اصل نوعیت اور ان سے صحیح آگہی کے بغیر قیادت کا فریضہ انجام نہ
دیا جا سکتا ہے۔ اس وقت امت کے سامنے مذہبی ارکان اور عقائد کے علاوہ بہت سے ایسے مس
ہیں جو میڈیکل سائنس سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً حیاتیاتی اور طبی ٹکنالوجی کی ترقی نے بہت
ایسے مسئلوں کو جنم دیا ہے جو اسلامی فقہ کے لئے بالکل نئے ہیں۔ ان مسائل کے سلسلہ میں اسلا
کے موقف کی وضاحت کے لئے فقہ کے ساتھ حیاتیاتی ٹکنالوجی اور طبی سائنس سے واقفیت ضرور
ہے۔ مثلاً ضبط تولید، اسقاط حمل، اعضاء کی پیوندکاری، تبدیلی جنس کے آپریشن، جنیٹک اسکریننگ
مصنوعی تخم ریزی، بارآوری اور ٹسٹ ٹیوب بے بی وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن کے فقہی حل کے
طبی سائنس سے واقفیت لازمی ہے۔ لہذا موجودہ مدارس کے نصاب میں طبی مضامین کی شمولیت ک
اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس سے ہمارے مدرسوں کے کردار میں وسعت و جامعیت پ
ہوگی۔ اور ہمارے مدارس مذہبی ضرورتوں کی تکمیل کے علاوہ عصری اور سماجی تقاضوں کے پ
کرنے کے اہل ہو سکیں گے۔ اور معاصر تعلیمی نظام کی طرح مدارس کے فضلا بھی سماجی ذمہ داریو
کو ادا کرنے کے لائق ہو سکیں گے۔ اس نئے نظام تعلیم سے مسلمانوں کی سماجی حالت میں بہتری
اقتصادی پسماندگی کی اصلاح اور صحت کی ابتر صورت حال میں بدلاؤ کی امید ہے۔

حوالے وحواشی

۱۔ ملاحظہ ہو۔ سورۃ الملک، آیت نمبر ۵، سورۃ الحدید، آیت نمبر ۴، سورۃ التین وغیرہ

۲۔ ابن ابی اصیبعہ، عیون الانباء فی طبقات الاطباء، جلد اول (اردو ترجمہ)، اشاعت ۱۹۹۰ء، سی سی آر یا

،نئی دہلی، ص ۱۹ تا ۴۰

۳۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ ''عربی مدارس کا نصاب ونظام تعلیم اور عصری تقاضے'' (مدرسہ سسٹم پر ۱۹۹۰ء کے رانچی۔ دہلی سیمیناروں کی روداد: مقالات اور بحث)، شائع کردہ: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

۴۔ ملاحظہ ہو۔ ''عربی مدارس کا نصاب ونظام تعلیم'' از محمد یوسف بنوری، پیشکش: سید سلمان حسینی ندوی، شائع کردہ: جامعہ سید احمد شہید، احمد آباد (کٹولی) ملیح آباد، لکھنؤ

۵۔ ملاحظہ ہو۔ الغزالی، مرتبہ علامہ شبلی نعمانی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، اشاعت: ۱۹۲۸ء

۶۔ تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں، از ظفر الاسلام اصلاحی، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، اشاعت: ۲۰۰۷ء: ص ۳۳

۷۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، از ابوالحسنات ندوی، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ طبع جدید ۲۰۰۸ء: ص ۲۷، ۷۳

۸۔ صحیح المسلم، کتاب القدر، باب الایمان

۹۔ ''زادالمعاد میں مذکور نباتی ادویہ کی تعیین، جدید بیانات کی روشنی میں'' از فخر عالم، ماہنامہ محدث، جنوری ۲۰۰۴ء۔ دارالترجمہ والتالیف، بنارس، ص ۲۵

☆☆☆

عالمی تعلیمی رجحانات کے تناظر میں

بہار کے مدارس ملحقہ - مسائل، مشکلات اور حل

مولانا وصی احمد شمسی ☆

موجودہ دور میں علم وفن کی ترویج واشاعت دنیا میں جس اعلیٰ پیمانہ پر جاری ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے ہر چیز سے یکسو ہوکر جب ہم سوچتے ہیں اور ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں تو ہر طرف علمی وتعلیمی دنیا میں چہل پہل نظر آتی ہے۔ علم وفن کے میدان میں بھاگ دوڑ کا خوشگوار منظر آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔ اور کانوں میں انکشافات جدیدہ کی مست انگیز صدا گونجنے لگتی ہے۔ آج کے گلوبلائیزیشن کے دور میں عالمی تعلیمی رجحانات کے اندر امکانات کے تلاش وجستجو کے لئے نت نئی تدبیر وکوشش جاری ہے۔

حضرت محمد ﷺ جس دین اسلام کو لے کر تشریف لائے وہ ایک مکمل ضابطہ حیات اور دستور زندگی رکھتا ہے۔ انسانی معاشرہ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کو اس سے الگ کہا جاسکے۔ جہاں اخلاقی اصلاحات وتعلیمات کے سارے لازوال چشمے بہائے گئے وہیں علم وفن کا شعبہ بھی اپنی عام اصلاحات کے ساتھ بروئے کار لایا گیا۔

جن لوگوں نے گہری نظر سے اسلام کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کی بسم اللہ ہی تعلیم وتعلّم، درس وتدریس اور کتاب وقلم سے ہوئی ہے۔ اس دین مکمل میں یہ تمام چیزیں

☆ روپس پور، دھمسائن، دربھنگہ، بہار

ازبس ضروری ہے۔غیر ممکن ہے کہ کوئی مسلمان بھی ہو اور تعلیم و تعلم اور کتاب و قلم کا منکر بھی۔

کون نہیں جانتا کہ رحمت عالم ﷺ پر ایک ایسا زمانہ بھی گذرا کہ آپ اپنے ماحول سے گھبرا کر اور سب سے کنارہ کش ہو کر "حرا" نامی پہاڑ کے ایک غار میں غور و فکر کی زندگی شروع کی دنیا کی گمراہی پر اپنے رب سے لطف و کرم کے امیدوار تھے۔ کہ رب کائنات کی طرف سے حضرت جبرئیل امین تشریف لائے۔ اور پروردگار عالم کی طرف سے پیغام سنایا جو سب سے پہلا پیغام تھا۔ **اقرا باسم ربک الذی خلق ۔الانسان من علق ۔اقرا و ربک الاکرم ۔ الذی علم بالقلم ۔ علم الانسان مالم یعلم ۔** (سورہ علق پارہ۔۳۰، آیت ۔۵) "ترجمہ:- اپنے رب کا نام لے کر پڑھئے جس نے پیدا کیا انسان کو گوشت کے لوتھڑے سے بنایا، پڑھئے اور آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو ان کو معلوم نہ تھیں"۔ ان آیتوں کے پڑھنے پر آپ کو مجبور کیا گیا۔ آپ نے اپنا عذر پیش کرتے ہوئے فرمایا میں پڑھنا نہیں جانتا مگر باربار مطالبہ ہوا۔ اللہ کا جو حکم ہوا تھا اسے اللہ ہی کی مدد سے آپ کو بجالانا پڑا، جو اشارہ تھا کہ کائنات انسانی ضلالت و ظلمت کی وادی سے نکل کر ہدایت و نور کی شاہراہ پر اسی وقت آسکتی ہے جب وہ اللہ کا نام لے کر پڑھنا شروع کر دے اور درس و تدریس اور کتاب و قلم پر ایمان لائے۔ فیصلہ کیا جائے جس دین میں پڑھنے لکھنے اور تعلیم و تعلم کی یہ شان ہو۔

علم کی ترغیب کے سلسلہ میں ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا: "خود رب کائنات، اس کے فرشتے، زمین و آسمان اور حد یہ ہے کہ مچھلیاں پانی کے اندر اور چونٹیاں سوراخوں میں اہل علم کے لئے دعا گو ہیں"۔

1857 کی تباہی و بربادی کے بعد اسلام کی اشاعت اور کتاب و سنت کی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اپنے رفقاء کے مشورہ سے چھوٹی سی بستی دیوبند

ضلع سہارن پور یوپی میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی جو بعد میں ام المدارس کی حیثیت سے ہندوستان کی تاریخ میں نمایاں جگہ حاصل کیا۔ ملت کے علماء ودانشور اس سے ضرور واقف ہوں گے کہ گذشتہ صدی میں دیوبند، کا تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کے دورِ انحطاط میں اخلاص وللّٰہیت تواضع وسادگی، تقویٰ وطہارت، جرأت وحق گوئی کے اوصاف عالیہ کو زندہ کیا۔ اور ایسے انسان پیدا کئے جو ہندوستان میں ہزاروں مکاتب و مدارس اور دینی اداروں کے قیام کا ذریعہ بنے اور ایسے پاکیزہ سیرتوں کو پیدا کیا، جنہوں نے پیٹ پر پتھر باندھ کر علم دین کی خدمت کی اور ملک وملت کے وقار کو بلند کیا۔

صوبہ بہار اس سے الگ نہیں رہا بلکہ صوبہ بہار کے علماء نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بڑے بڑے مدارس اور ادارے قائم کئے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ صوبہ بہار میں مذہبی و دینی تعلیم کے آغاز کی تاریخ نوسو سال سے بھی زیادہ قدیم ہے اس دورِ قدیم میں علماء صوفیا کرام مکاتب اور خانقاہیں قائم کر کے ان مراکز میں تعلیم وتربیت کا درس دیا کرتے تھے۔ یہی طریقہ تعلیم آگے چل کر باضابطہ مدارس کے نظام کا سلسلہ جاری ہوا۔ جیسے حالات بدلتے رہے مدارس و مکاتب اور خانقاہوں کے دائرہ کار بڑھتے رہے۔ رفتہ رفتہ مدارس میں تعلیم ونصاب کے مطابق تعلیمی ماحول قائم ہوتے رہے۔ آگے چل کر دوستوں کی قسموں کی طرح مدرسوں کے بھی اقسام بنتے گئے۔ دیوبندی، بریلوی، شیعہ، سنی، اہل حدیث، ندوی، ملحقہ، غیر ملحقہ، عالیہ، نظامیہ، وفاقی، غیروفاقی، دینی، دنیاوی، جتنے فرقے جتنے مکتبۂ فکر اتنے افکار کے مدارس، اب تو ذاتی مفاد ذاتی اغراض ذاتی اختلافات روزی، روٹی کی بنیاد پر ایک ایک گاؤں ایک ایک قصبہ میں کئی کئی مدارس قائم ہوئے ہیں۔ آپسی وفاق اور توافق کے فقدان میں بڑے بڑے مدارس ویران ہورہے ہیں ضرورت ہے ان مدارس کے درمیان رابطہ اور وفاقی نظام قائم کیا جائے اور کوئی لائحہ عمل تیار کیا جائے ہمارے علم میں ایسے بھی مدارس ہیں جو ذاتی مفاد کے لئے قائم کئے گئے طلباء

اساتذہ کا پتہ نہیں مگر وہ اپنے مدرسہ کی تائید معتبر اداروں سے حاصل کر لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ضرورت ہے ان اداروں کو محتاط ہونے کی ورنہ ایسے ہی مفاد پرست لوگوں کا بازار گرم رہے گا۔مخلص پیچھے رہیں گے۔

مدارس اور دینی تعلیم کے اداروں کے قیام کا مقصد قرآن وحدیث دعوت وتبلیغ تھا جس سے انسانی معاشرہ میں مدرسہ صدق وصفا کا منبع انسانیت کا مرکز مانا جاتا تھا مگر اب کے زمانے میں بہت سے مدارس کذب وریا کا چشمہ اور بدعنوانیوں کا اڈہ مانا جارہا ہے۔

بہار میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کا قیام 1912 میں ہوا جس کو الحاج سید نورالہدیٰ صاحب نے اپنے والد جناب شمس الہدیٰ کے نام سے منسوب کیا۔انہوں نے اپنی جائیداد خاص کی آمدنی تقریباً دو ہزار روپے جنوری 1912 میں وقف کردی اس زمانے میں اس مدرسہ میں بڑے باصلاحیت اساتذہ خدمت پر مامور کئے گئے اس زمانے میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کا معیار بلند تھا۔حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب امیر شریعت خامس بھی اس مدرسہ سے 1928 میں امتیازی نمبر سے کامیاب ہوئے تھے۔انہیں سونے کا تمغہ ملا تھا۔جناب سید نورالہدیٰ صاحب نے 1919 میں مدرسہ کو سرکار کی تحویل میں دے دیا۔اسی مدرسہ کی بنیاد پر 1921 میں مدرسہ اگزامنیشن کمیٹی قائم کی گئی۔27 فروری 1979 میں ایک آرڈیننس کے ذریعہ "بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ" کا قیام عمل میں آیا۔

اس وقت صوبہ بہار میں مدارس ملحقہ کی مجموعی تعداد 3588 ہے۔جس میں امداد یافتہ 1128 غیر امداد یافتہ 2460 ہے۔اس کے علاوہ مدرسہ نظامیہ جس کو عرف میں آزاد مدارس کہتے ہیں ان کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد ہے۔موجودہ سرکار اپنے ایک مکتوب 11.02.11.162 کے حوالہ سے 2460 غیر امداد یافتہ کو امداد یافتہ کے زمرہ میں شامل کرنے کا حکم جاری کیا ہے۔جس کے لئے ایک ارب آٹھ کروڑ بیس لاکھ چالیس ہزار روپے بھی مختص کیا ہے۔جس سے ملازمین واساتذہ

کے ایک سال کے تنخواہ کی ادائیگی ہوگی۔ اساتذہ وملازمین کی شرح تنخواہ وہی ہوگی جو ابھی پرائم
اور سکنڈری اسکولوں کے اساتذہ وملازمین کو ملتی ہے۔ مشکلات یہ ہیں کہ سرکار کے حکام وملاز
کے اقلیتوں کے تئیں جو رویہ رہے ہیں ان تجربات کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک ارب آ
کروڑ بیس لاکھ چالیس ہزار روپے جو مختص کئے گئے ہیں وہ ادائیگی کے لئے نہیں بلکہ ہمیں بھو
بھلیوں کے جال میں پھنسے رہنے کے لئے نہ کہ اقلیتی اداروں کے مسائل کے حل کرنے کیلئے۔

آج سے تقریباً 28 سال پہلے 2986 مدارس جگن ناتھ مشرا سرکار کے کابینہ سے منظو
کراکر مدرسہ بورڈ نے ملحق کیا مگر سرکار کے محکمۂ مالیات نے ایک آرڈیننس جاری کیا کہ اگل
آدیش تک مالیاتی منظوری ملتوی رہیں گے۔ ظاہر ہے ایک طویل مدت کے بعد موجودہ سرکا
مذکورہ روپے منظور کیے ہیں۔ سرکار کی طرف سے ضلع ایجوکیشن افسر (D.E.O) اپنی سطح سے جا
کررہے ہیں بعد میں اپنی رپورٹ مدرسہ بورڈ کو بھیجیں گے۔ پھر مدرسہ بورڈ اپنی سطح سے جا
کرائے گی۔ ظاہر ہے۔ ان بھول بھلیوں کے جال سے نکلنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

جانچ کے کام اور اساتذہ کی بحالیوں میں بغیر صلاحیت کی جانچ کئے ہزاروں رو
رشوت چندہ کے نام پر ایجنٹوں اور دلالوں کے ذریعہ وصول ہونے کی بات فضا میں سنائی دی
ہیں۔ ایسے ماحول میں ان مفاد پرستوں کے ذریعہ جو مدارس قائم کئے گئے یا کئے جارہے ہیں
ان مدارس کے تعلیمی نظام اور معیار کیسے ہوں گے فرضی امتحان دینے والوں سے امتحان دلوا
جائیں گے۔ اور مدرسہ بورڈ کی اسناد تقسیم کروائیں گے۔ پھر ان مدرسوں کو دینی تعلیم کا ادار
صدق وصفا کا منبع کون کہے گا۔ البتہ کذب وریا اور بدعنوانیوں کا اڈا کہا جائے گا۔ بہر حال
مشکلات ہمارے اندرونی ہیں ان کے اصلاح کے لئے ارباب وحل وعقد کے لئے ایک سوالی
نشان ہے جس پر غور وفکر کرنا ہے۔ مشکلات یہ ہے کہ مدسہ بورڈ کو ایکٹ کے ذریعہ بہت سار
اختیارات حاصل ہیں۔ لیکن مدرسہ بورڈ محکمۂ تعلیم کے مابین ربط نہیں ہونے کی صورت میں

درمیان ہی میں معاملہ رک جاتا ہے۔ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ پاتا ہے۔ جناب انوار کریم صاحب اپنے دور میں بحیثیت چیئر مین ٹیچرس سروس کنڈیشن اور اصول وضوابط تیار کر کے 1991 میں حکومت بہار کے محکمہ تعلیم کو دستیاب کرایا لیکن تادم تحریر حکومت بہار سے اس کی منظوری حاصل نہیں ہوسکی۔ جناب نورالاسلام صاحب موجودہ انسپکٹر مدرسہ بورڈ خود ہی بتاتے ہیں کہ میں نے ذاتی طور پر موجودہ اسپیشل ڈائرکٹر سے رجوع کیا لیکن سراغ نہیں مل سکا۔ تحریری طور پر آسانیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن عملی اقدام میں کافی دشواریاں اور مشکلات ہیں۔ اختیارات یا تو ہیں لیکن محدود وسائل کی وجہ سے بہت سے مثبت اقدام درمیان ہی میں رہ جاتے ہیں۔ گویا سرکاری بھول بھلیوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں اور صرف اشتہار بازی اور پروپیگنڈہ کے شکار ہو رہے ہیں۔

مدارس ملحقہ کے تدریسی نظام کے متعلق میں نے قبل ہی تحریر کیا ہے کہ کچھ مدارس کو چھوڑ کر سبھی کے تدریسی نظام اور امتحان غیر معیاری ہیں۔ بلکہ 2460 اور امداد یافتہ مدارس 1128 میں اکثر نام نہادی خانہ پری کرنے والے مدارس ہیں۔ جن میں وہ مدارس بھی ہیں جن کے ماضی میں بڑے نام تھے۔ آج وہ صرف ڈھانچوں کی شکل میں امت کے ذمہ داروں پر مرثیہ خواں ہیں۔

31 جولائی 1976 کو نیا نصاب کا خاکہ حکومت بہار کو پیش کیا گیا جسے منظور کرتے ہوئے 1978 کے گزٹ میں شائع کر دیا گیا۔ جس میں مدرسہ بورڈ کے اسناد کو وسطانیہ برابر درجہ آٹھ (میڈل) فوقانیہ برابر میٹرک، عالم برابر بی اے تسلیم کیا گیا۔ 22 سال کے بعد مدرسہ بورڈ کا نیا نصاب تعلیم 2001 میں تیار ہوا جو مدرسہ بورڈ کے منظوری کے بعد مدارس ملحقہ ہیں۔ نافذ ہے نیا نصاب تعلیم وسطانیہ اور فوقانیہ کے لئے ہے۔ 1978 کے نصاب تعلیم میں حالات کے پیش نظر جو کمیاں محسوس کی گئیں اسے نصاب تعلیم میں مکمل کر دیا گیا۔ عصری علوم کے مضامین کو بھی CBSE کے مطابق نصاب تعلیم میں شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح علم طبیعات علم کیمیا علم حیاتیات نظریاتی 75 اور عملی 25 نمبرات دے کر مجموعی نمبر 100 کا پرچہ سائنس ہے جو شامل نصاب ہے۔ درجہ

فوقانیہ کا نصاب CBSE کے نصاب تعلیم کے عصری علوم کے نظام تعلیم کے مساوی ہے۔واضح ہو کہ مدرسہ بورڈ کے فوقانیہ مولوی کے اسناد کو کونسل آف بورڈس اسکول ایجوکیشن ان انڈیا (COBSE) نے منظوری دے دی ہے۔ مدارس ملحقہ میں تعلیمی نظام تشفی بخش نہیں ہے۔شریک امتحان طلبا و طالبات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔لیکن ان بچوں اور بچیوں بلکہ کہنا چاہئے ان فرضی طالب علموں مردوں اور عورتوں میں تعلیمی فقدان تو دور کتنوں کو اپنا نام و پتہ بھی لکھنا نہیں آتا۔اور ان کے فارم امتحان موٹی رقم کے عوض بھر دیئے جاتے ہیں۔امتحان کا پرمیشن بھی مل جائے گا۔اس طرح کے طرز تعلیم سے قوم و ملت کے نونہالوں کا مستقبل کبھی روشن نہیں ہوگا۔اس سمت میں اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔ان مدرسوں کے امتحانات اور کاپی جانچ اور تعلیم وغیرہ کی اصلاح کیسے ہو؟ان مکانوں کے ڈھانچوں مین کیسے تعلیمی ماحول برپا کیا جائے،یہ ایک اہم سوال ہے؟

جب تک انسان اپنی ذمہ داری اور داعیانہ احساسات کو زندہ اور اپنے ذاتی اغراض و مفاد کو ملت نیم جاں کو زندہ کرنے کے لئے نہیں ترک کرے گا اس وقت تک ان مدرسوں میں تعلیمی بیداری نہیں آسکتی ہے۔ضرورت ہے کہ ہم قوم و ملت کے درد وغم رکھنے والے ذمہ دار دانشور اور علماء کرام قوم و ملت کے جانباز نوجوانوں! ہم سب مل کر قوم کے اندر جو تعلیمی بدعنوانیاں ہیں عورتوں مردوں میں جو جہاں ہے اس کو ختم کرنے کے لئے بیدار ہو جائیں۔اصلاح کیلئے ذمہ داروں کا ایجوکیشن ٹاسک فورس بنائیں چند مدارس کو ٹارگیٹ بنائیں اور لگاتار اصلاح کی سعی و کوشش کریں۔ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ سرکار کی تحویل میں دے دیئے جانے کے بعد بہار مدرسہ بورڈ کا وجود ہوا۔اب جو مدارس بورڈ سے ملحق ہے وہ عرف میں سرکاری مدارس کہلاتے ہیں جو مدارس بورڈ سے ملحق نہیں ہیں وہ عرف میں آزاد مدارس کہلاتے ہیں۔ حالانکہ یہی آزاد مدارس والے ہر طرح کے اصول وضوابط کے پابند ہیں۔ داعی بن کر داعیانہ جذبہ سے مدرسہ میں قربانیاں دے کر قرآن وسنت کی تعلیم کی درس وتدریس میں مشغول ہیں۔ بہت سے ملحقہ مدارس

میں بھی زندہ تابندہ ... تدہ کرام اراکین حضرات ہیں۔ جنکے دم قدم سے مدرسہ میں تعلیمی دینی روحانی ماحول قائم ہے۔

مدارس کے نصاب کو آج کے عالمی تعلیمی رجحانات کے اندر کیا امکانات ہوسکتے ہیں جن کو ہم اپنے مدارس میں اپنا کر عصری علوم وفنون کے بڑھتے دباؤ کو روک سکیں اور اپنی شناخت اور روایتی تہذیب وتمدن کو بھی بچائے رکھیں۔ بغیر محنت وکوشش سے مدرسہ بورڈ کے درجوں کے امتحانات میں اچھے نمبرات سے کامیابی مل جانے کی وجہ سے اب مدرسہ بورڈ کے امتحانات میں بہت سے غیر مسلم بچے بچیاں امتحان میں شریک ہوکر کامیاب ہوتے ہیں۔ بقول چیئرمین مولانا اعجاز احمد صاحب غیر مسلموں کا مدرسہ میں داخلہ لے کر پڑھنا ہمارے لئے فال نیک ہے۔ مستقبل میں کیسا رہے گا ایک سوالیہ نشان ہے- قابل غور ہے۔

مولانا وحید الدین خاں صاحب معروف اسلامی اسکالر ہیں وہ فرماتے ہیں کہ مدرسہ کی جدید کاری کا معاملہ اب محض نظریہ بن کر نہیں رہ گیا ہے بلکہ بے شمار مدارس ایسے ہیں جہاں عملاً جدید کاری کا کام شروع ہوچکا ہے مثلاً دار العلوم دیوبند اور جے پور میں واقع مدرسہ جامعہ الہدایہ نے اپنے نصاب میں جدید علوم جسے عصری علوم بھی کہتے ہیں کو شامل کرلیا ہے۔ دار العلوم دیوبند اور ملک کے دوسرے مدارس نے جدید طریقہ تعلیم کو اپنے یہاں رائج کیا ہے۔ وہاں کمپیوٹر کی ٹریننگ دی جاتی ہے اور ہندی وانگریزی زبانیں سکھائی جاتی ہیں۔ مدرسہ انتظامیہ کے متعلق جدیدیت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے مدرسہ میں بروئے کار نہ لایا جائے مسئلہ یہ ہے کہ مدرسہ سے پڑھنے والے بچوں کے لئے ملازمت کے وہ مواقع نہیں ہیں جو کہ سیکولر اداروں سے نکلنے والوں کے لئے ہیں۔ میرے تجربہ کے مطابق اگر تربیتی ادارے قائم ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ تمام مدارس عصری علوم اپنے یہاں نافذ کردیں گے''۔ (دیکھئے دی سنڈے انڈین اردو ص50، 21 اگست 2011ء)۔ دینی وعصری علوم کے ادارے اسلامی ماحول میں جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم

اکل کوا انندور بار مہاراشٹر میں جناب مولانا غلام محمد وستانوی مدظلہٗ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند نے قائم کر کے عملی نمونہ پیش کیا ہے۔کوئی جائے وہاں دیکھے۔اور سیکھے۔

مارگریٹ الوا گورنر اترا کھنڈ نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ وہ 16 ستمبر کو عالمی تعلیمی رجحان کے جائزے اور امکانات کے بین الاقوامی سمینار جو IOS کے زیر اہتمام سنہا انسٹی چیوٹ پٹنہ کے ہال میں ہو رہا تھا 2011 کی مردم شماری میں کئی مثبت چیزیں ہیں جن میں سب سے نمایاں یہ ہے کہ ملک کی شرح خواندگی 74% تک پہنچ گئی ہے ملک اسی شرح خواندگی کے ساتھ ترقی کے راہ پر بھی گامزن ہوا ہے۔ کیونکہ تعلیم اور ترقی کا رشتہ چولی دامن کا ہے۔آج ہندوستان دنیا کو امید کی ایک نئی کرن دے رہا ہے۔اور ہم مسلمانوں کی حالت سچر رپورٹ میں دلت مہادلت سے بھی کمتر بتائی گئی ہے۔کیا ہم اس حالت سے اوپر اٹھنا چاہتے ہیں کہ نہیں۔ اگر چاہتے ہیں تو پھر ہمیں آج ہی سے کمر کس لینا ہوگا۔تب ہی حالات بدل سکتے ہیں۔ ورنہ یہ سمینار اور جلسے ہوتے ہی رہیں گے۔اور حالت ہماری بدتر ہوتی چلی جائے گی۔

ملیشیا سے آئے مہمان دانشور ڈاکٹر محمد غزالی بن محمد نور نے کہا کہ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ بہت سارے مواقع ابھر کر آج ہمارے سامنے آئے ہیں۔لیکن اصل سوال یہ ہے کہ اس عالمی تعلیمی رجحانات کے ماحول میں نظام تعلیم میں ہونے والی تبدیلیوں سے پیدا شدہ مواقع کا فائدہ اٹھانے کے لئے تیار بھی ہیں کہ نہیں۔ تعلیم بھی عالمی شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔جس کی وجہ سے بہت سے مقامی کلچر اقدار رسم و رواج اور روایتی تعلیم کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ روایتی یعنی دینی تعلیمی اداروں کو تحفظ فراہم کیا جائے۔ کیونکہ یہی وہ ادارے ہیں جنہوں نے ماضی میں اقدار پر مبنی تعلیم کو فروغ دیا۔اور ایسی امید مستقبل میں صرف انہیں دینی اخلاقی روحانی اداروں سے کی جاسکتی ہے۔ملیشیا میں صرف انہی دینی اخلاقی روحانی سے کی جاسکتی ہے۔

ملیشیا کی معروف دانش گاہ ایشیا یونیورسٹی کے ماہر تعلیم پروفیسر جان ارول فلپس نے کہا کہ ملیشیا نے اس سلسلے میں پیش رفت کی ہے۔ جس کی وجہ سے وہاں روایتی تعلیمی اداروں کو درپیش خطرات سے بچایا جاسکا ہے۔ انہوں نے کہا کہ انہیں تجربات کی روشنی میں ہندوستان میں بھی اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔

مذکورہ مدارس کی اصلاح اور ان میں تعلیمی ماحول قائم کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ اصلاح معاشرہ کے طرز پر عوام اور دانشوروں میں جلسے کئے جائیں۔ آپس میں تبادلہ خیال کر کے ہر شہر اور ہر مقامات پر علماء دانشور ذمہ دار جوانوں پر مشتمل کمیٹی یا وفد یا ایجوکیشن ٹاسک فورس بنا کر اصلاح کی کوشش کی جائے۔ طویل مدتی تعلیمی بیداری ایجنڈا بنایا جائے اور کام شروع کیا جائے۔ ان میں ہر طبقے کے افراد شامل کئے جائیں بلکہ سنجیدہ تعمیری ذہن کی خواتین کو شامل کیا جائے۔

سرکاری سطح پر مسلمانوں کے لئے جو اسکیم اور فلاحی منصوبے و پروگرام ہیں اسے عام مسلم مرد و خواتین میں احساس دلایا جائے۔ مدارس کے تعلق سے تمام حکومتوں سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی سفارشات کو منظور کرتے ہوئے اپنا لائحہ عمل بنائیں۔ ہندوستان خاص کر بہار میں مسلم اقلیت کے لئے تعلیم کی فنڈنگ اوقاف کا نئے وسائل کے طور پر استعمال میں لایا جائے۔

''بچوں کے مفت اور لازمی حصول تعلیم کا حق (جسے عام طور پر R.T.E ایکٹ کہا جاتا ہے اس قانون سے مدارس اسلامیہ پر سیدھی ضرب پڑے گی۔ اور اس کی گردن تن سے جدا ہو جائے گی۔ آئین ہند کے دفعہ 30 (بنیادی حقوق) کے تحت چلنے والے اداروں کے حقوق بھی اس ایکٹ سے پامال ہوں گے۔

نہ تھک کے بیٹھ کہ تیری اڑان باقی ہے
زمین ختم ہوئی آسمان باقی ہے

☆☆☆
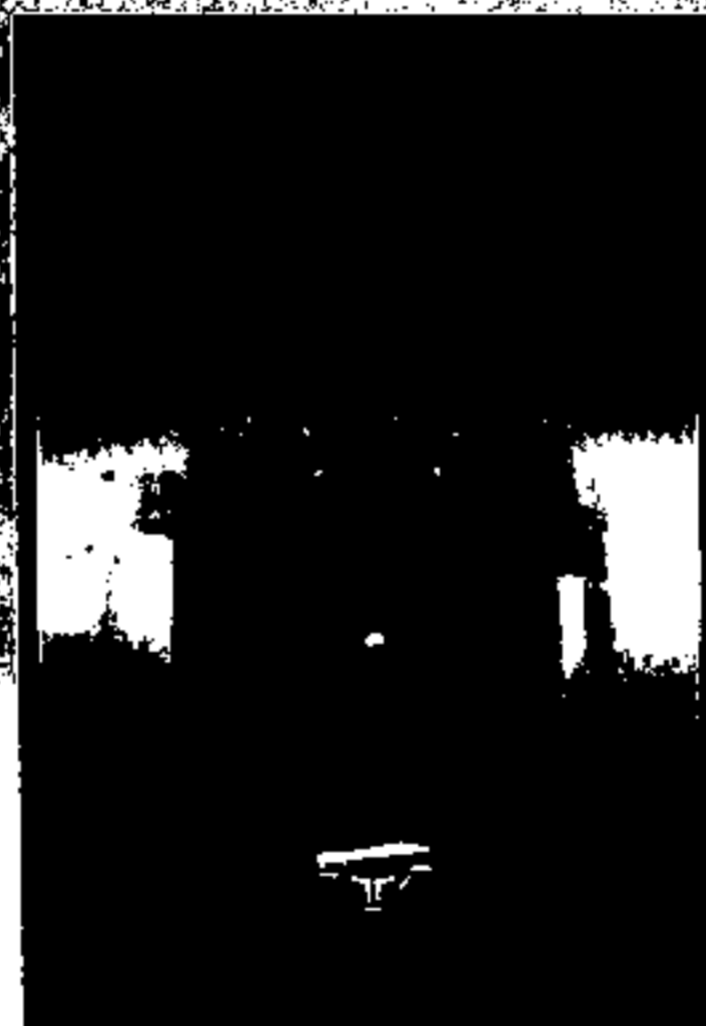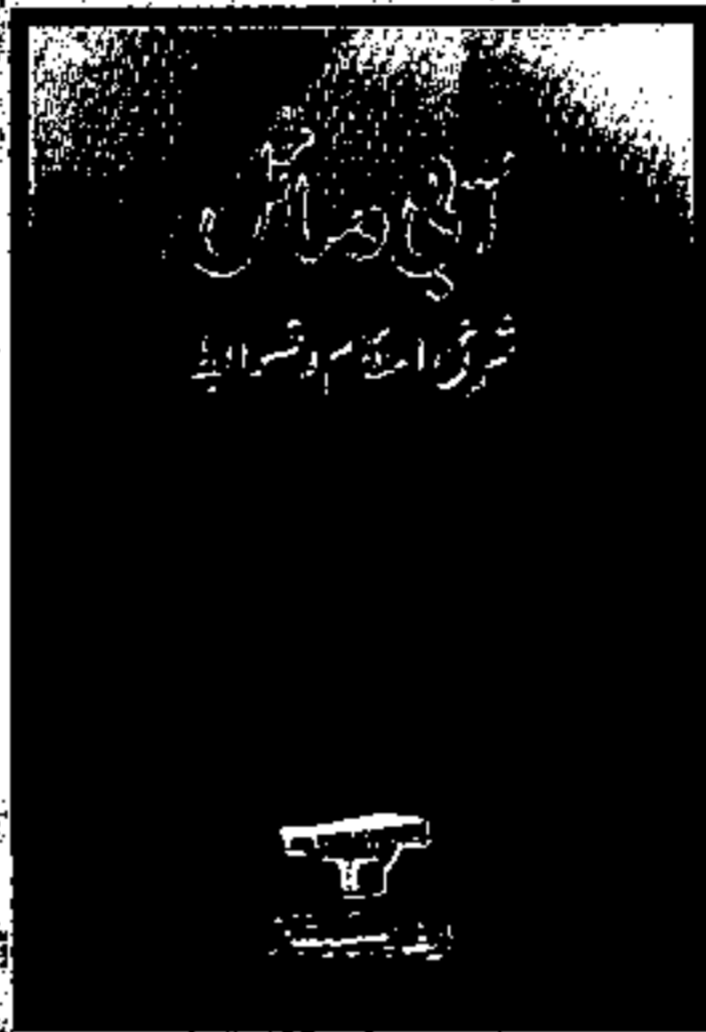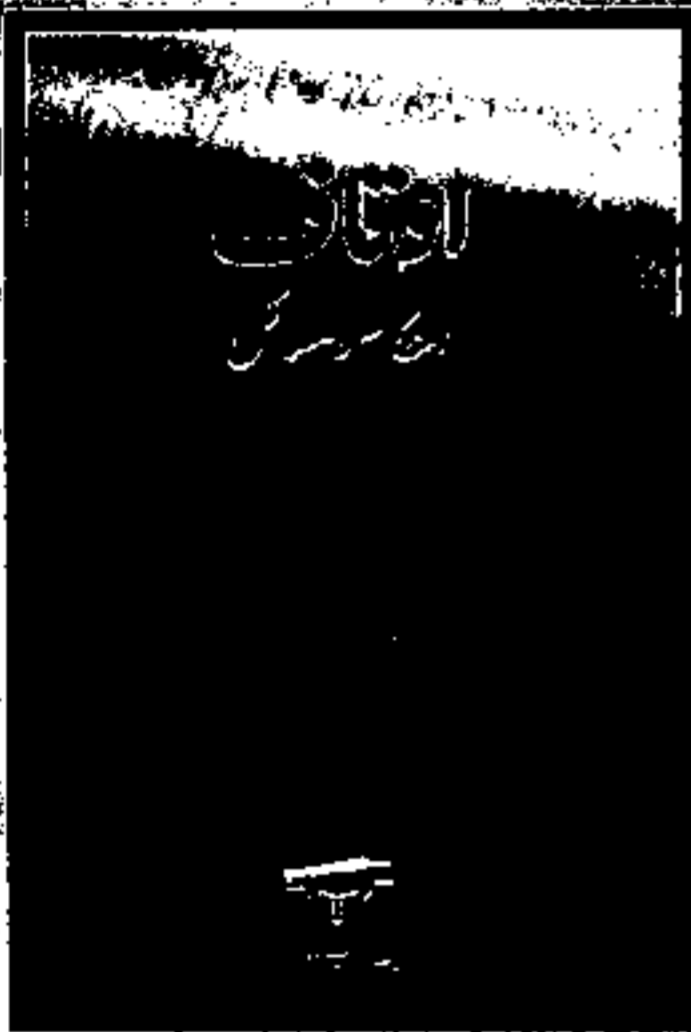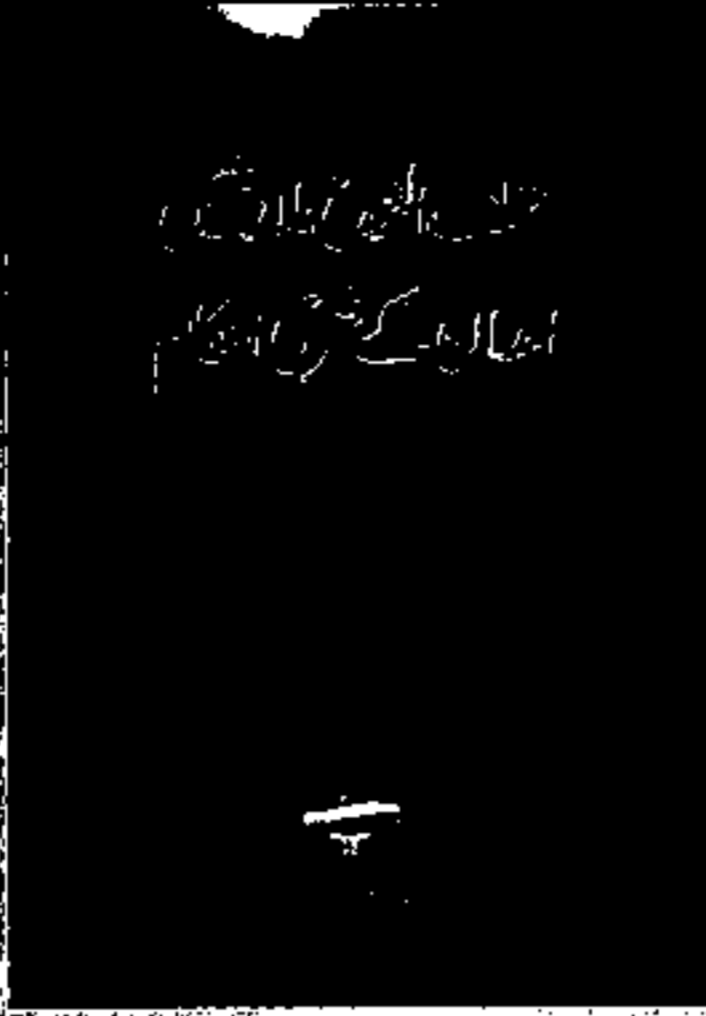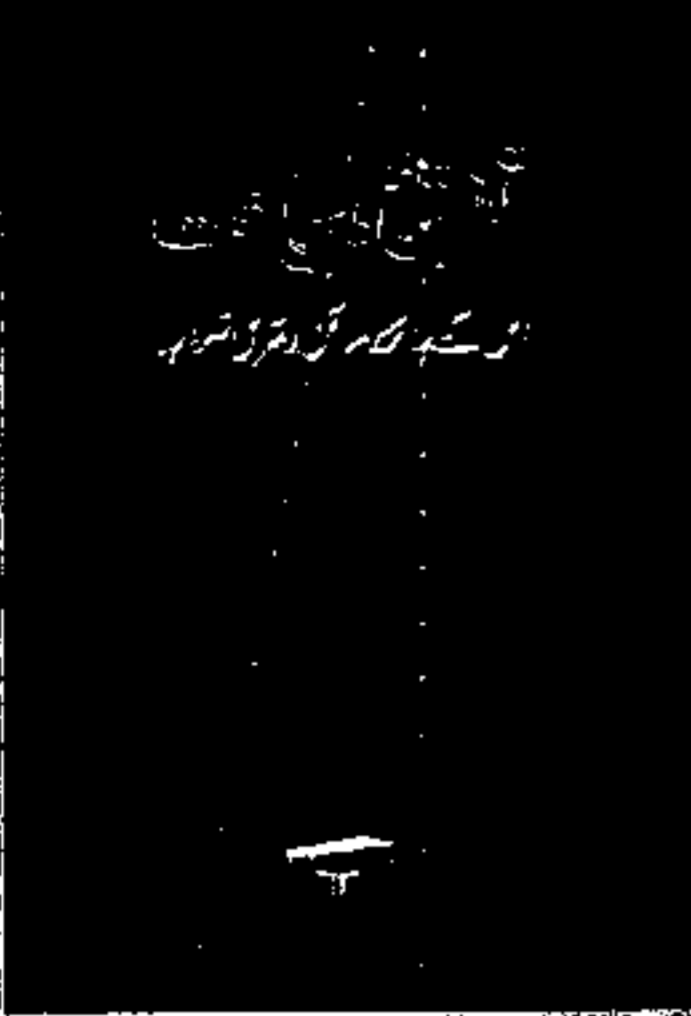
IFA Publications
161 - F, Basement, Joga Bai, Post Box No - 9708,
Jamia Nagar, New Delhi - 110025
Tel : 26981327 Email:ifapublication@gmail.com